سلسلۂ انجمن ترقی اردو

نمبر ۲۶

تاریخ اخلاق یورپ

جلد دوم

یعنی لیکی کی مشہور کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ملخص ترجمہ

جس میں

فلسفہ معاشرت، تمدن، مذہب و اخلاق کے باہمی تعلقات پر
یورپ قدیم کی تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے

از

عبدالماجد

بی اے، ممبر ارسٹاٹیلین سوسائٹی (لندن)، ممبر رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن (لندن)
ممبر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) فیلو عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) مصنف
فلسفہ جذبات و فلسفہ اجتماع، مترجم مکالمات برکلے، تاریخ تمدن وغیرہ

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوئی ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء

(اور دفتر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع ہوئی)

مطبوعاتِ انجمن ترقی اردو

تاریخ تمدن حصہ اول یہ سر ٹامس بکل کی مشہور آفاق کتاب کا ترجمہ ہی۔ اس میں تمدن کی ابتدائی تعریف سے لیکر انتہا تک ہر مسئلہ پر بے نظیر قابلیت اور عدیم المثال وسعت نظر کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہمیں واقعات پر غور کرنا اور ان سے صحیح نتائج کا اخذ کرنا سکھاتی ہی۔ مصنف نے انسانی تمدن کے متعلق عجیب و غریب اصول قائم کیے ہیں۔ اور بڑی پر زور بحثیں کی ہیں اور اپنے اصول و کلیات کی شہادت و حمایت میں تاریخی واقعات کے انبار لگادیے ہیں۔ قیمت غیر مجلد (عہ)

تاریخ تمدن حصہ دوم یہ بکل کی تاریخ تمدن کا دوسرا حصہ ہی۔ قیمت غیر مجلد (عہ) مجلد (للعہ)

فلسفہ جذبات (از مولوی عبدالماجد صاحب بی اے) نفسیات (سائیکالوجی) پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہی۔ اس میں نفسیات کے صرف ایک حصہ یعنی جذبات و احساسات انسانی پر بحث کی گئی ہے۔ باوجودیکہ یہ علمی کتاب ہے مگر بہت دلچسپ اور مفید ہی۔ اور اس کا مطالعہ کرنا ہمارے ہم وطنوں کے لیے نہایت ضروری ہی۔ یہ کتاب ۱۲ ابواب پر شامل ہی۔ آخر میں تقریباً ۵۰۰ اصطلحات کی فہرست مع انگریزی کے دی ہی۔ ملک کے علما اور اخبارات نے اس کتاب کو بہت پسند کیا۔ قیمت مجلد (عہ) غیر مجلد (عہ ر)

تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول یہ پروفیسر لیکی کی بے مثل اور عالمانہ کتاب کا ترجمہ ہی۔ اٹھارویں صدی اور اُسکے ماقبل کی معاشرت و مذہب و اخلاق کے معلومات کا ایک حیرت انگیز ذخیرہ ہی۔ یہ نہایت دلچسپ اور حکیمانہ کتاب ہی۔ اور اس کے پڑھنے سے دماغ میں روشنی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہی۔ مترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے۔ قیمت مجلد (سے ر)

تاریخ اخلاق یورپ
جلد دوم
از
عبدالماجد

دیباچہ

تاریخ اخلاق یورپ کی جلد اوّل جنوری سنہ ۱۹۱۸ء میں شایع ہو چکی ہے جلد ثانی اسوقت ناظرین کے روبرو ہی۔ اس کا مسودہ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء میں تیار ہو چکا تھا، اس ساڑھے تین برس کے عرصہ میں طبع و اشاعت کی جن دشوار گزار منزلوں سے ہو کر گزرنا پڑا، اس کا اندازہ سُبکبارانِ ساحل کسی طرح نہیں کر سکتے۔

اصل ترجمہ میں جس قسم کے تصرفات کیے گئے ہیں ان کی تصریح جلد اوّل کے دیباچہ میں کر دی گئی ہی۔ بہتر ہو گا کہ جلد ہذا کے مطالعہ سے قبل اس پر ایک مرتبہ پھر نظر کر لی جاے۔ یورپین اسماء کی فہرست بھی انگریزی خط میں جلد اوّل میں شامل ہی۔

اغلاط طبع سے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہی۔ یہ طے ہو چکا ہی کہ لیتھو پریس میں غلطیوں سے پاک کسی کتاب کا نکلنا ناممکن ہے۔ آیندہ اوراق میں ناظرین کو اسکے لئے تیار رہنا چاہیے البتہ یہ غنیمت ہی کہ اردو مطبوعات میں اغلاط طبع کا عموماً جو تناسب رہتا ہی، اس کے لحاظ سے اس کتاب میں غلطیاں نسبتاً بہت کم نظر آئینگی۔ اس کے لئے مہتمم صاحب مطبع کی کوششیں مستحق شکریہ ہیں۔

گولہ گنج لکھنؤ

عبدالماجد

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۹ء

لے مگر مطبع میں مسودہ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء میں پہونچا ہے خدا جانے اپریل سنہ ۱۹۱۶ء سے دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء تک کہاں رہا۔ مہتمم مطبع

باب چہارم

قسطنطین کے زمانہ سے شارلمین کے عہد تک

فصل (۱)

تمہید

گزشتہ باب میں اجمالاً، مگر کافی وضاحت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ رومہ میں مسیحیت کے پھیلنے کے کیا کیا اسباب ہوئے اور اس راہ میں کس کس قسم کی رکاوٹیں حائل رہیں۔ موجودہ باب میں یہ دکھانا ہے کہ مسیحیت نے دنیا کے سامنے اخلاقی معیار و نصب العین کیا پیش کیا، اور دنیا سے اس کی تعمیل کیونکر کرائی؟ لیکن قبل اس کے کہ آگے بڑھیں، ایک عام غلط فہمی کا شروع میں رفع کر دینا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مسیحی تعلیمات کے مقابل مارکس آریلیس و سنیکا کی تحریروں سے اُن کے متحد المضمون فقرات اقتباس کر کے رکھ دیتے ہیں، اور پھر ان دونوں میں موازنہ کر کے مسیحیت کے حق میں فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ طریق موازنہ قطعاً ناقابلِ اعتماد ہے۔ مشرکانہ و مسیحانہ اخلاق کی بہت بڑی فارق یہ شے ہے کہ مشرکوں کا اخلاق اُن کے فلسفہ کا جزو تھا، برخلاف اس کے مسیحیوں کا اخلاق اُن کے مذہب کا جزو تھا۔ اول الذکر کے یہاں جو کچھ سرمایہ اخلاق تھا، وہ نام تھا اُن حکیمانہ اُصول کا جو فلاسفہ نے بعد غور و خوض کے قایم کیئے تھے۔ وہ فلاسفہ ہی کے لیے موزوں تھے، اور عوام کو اُن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بہ خلاف اُس کے آخر الذکر کا نظامِ اخلاق

اُن کے مذہب کا جزو غیر منفک تھا، جو مذہب کے قایم کردہ حدود عبارات، معتقدات و معاملات سے ذرا بھی الگ نہ تھا، اور اس واسطے عوام و خواص سب پر یکساں موثر تھا۔ مشرکوں کا مذہب کون سے مسائل حل کرتا تھا؟ یہ کہ علمِ غیب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ کائنات کی علتِ حقیقی کیا ہے؟ مصائب سے کیونکر مامون رہنا چاہیئے؟ اور دیوتاؤں سے کیونکر استعانت کرنا چاہیئے؟ اُس کے اندر اس کی کہیں گنجایش ہی نہ تھی، کہ پاکیزگی اخلاق کے ذریعہ سے روحانی ترقی حاصل کرنا چاہیئے ان کے ہاں شریعت فضائل اخلاق سے بالکل بیگانہ تھے، اور حکماء اخلاق مذہب و شریعت سے مطلق واسطہ نہ رکھتے تھے یہ شرف محض مسیحیت کے لیے مخصوص تھا کہ اس نے اخلاق و مذہب کے ڈانڈے ملا دیئے۔ اخلاقی پاکیزگی کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بتایا؛ اور حسنِ اخلاق کے لیے وہ محرکات و مرغبات فراہم کر دیئے، جن سے عوام و خواص دونوں برابر متاثر ہوتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ اہل خطابت کے ہاتھ میں پڑکر فلسفہ ملک میں زیادہ مقبول و شایع ہو گیا تھا، اور رفتہ رفتہ غورتی و مشرقی مذاہب میں صفائے باطن کا بھی ایک درجہ مقرر کیا گیا تھا، تاہم اسقدر قطعی ہے کہ مذہب و اخلاق میں جسقدر صریحی، بلا واسطہ اور قریبی آمیزش و اتحاد مسیحیت نے پیدا کر دیا، یہ اس سے پیشتر دنیا کے لیے نامعلوم تھا۔ اس نے مذہبی تقدس اور برگزیدگی کی بنیاد فضیلت اخلاقی پر رکھی، اور موثرات قوی سے کام لے کر وجود باری، بقائے روح و فرایضِ انسانی کے مسائل کو، جن تک قدماء کا تخیل بھی نہیں پہنچتا تھا، وقف عام کر دیا۔

لیکن مسیحیت اس اخلاقی انقلاب میں کامیاب کیونکر ہوئی؟ اگر کہیئے کہ اپنی تعلیمات کی خوبیوں سے؛ تو مشرک حکماء اخلاق کی تعلیمات کی رفعت و حُسن سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس کا اصلی باعث یہ تھا کہ مسیحیت نے اخلاقی تعلیمات کو موثر بنانے کے طریقہ بالکل نئے اختیار کیے۔ وہ طریقہ یہ دو تھے۔ ایک یہ کہ مسیحیت نے حیات بعد الموت میں جزاء و سزا کا پورا یقین دنیا کو دلا دیا۔ مشرکوں کے ہاں یہ تخیل بہت ہی دھندلا و مبہم تھا، مسیحیت نے اسے پوری وضاحت و قطعیت کے ساتھ پیش کیا۔ دوسرے مسیحیت نے یہ بتایا کہ ہر نفس کو اپنے جزئیاتِ اعمال تک کا فرد اً فرداً حساب دینا ہوگا اور سزائیں عارضی نہیں بلکہ دایمی ہونگی۔ یہ دونوں طریقے دنیا کے لیے بالکل نئے تھے، اور ان کا

عام قلوب پر بیحد اثر ہوا۔ بیشتر لوگ عاقبت کی طرف سے غافل و بے خبر رہتے تھے، لیکن اب انھیں اپنے ہر حقیر سے حقیر قول و فعل پر ذمہ داری محسوس ہونے لگی، اور انھیں یقین ہو گیا کہ اُن کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی یوم آخرت کے محاسبہ و باز پرس سے باہر نہیں رہ سکتا، خواہ دنیا میں وہ سب کی نظر سے مخفی رہے۔ ایک اثر تو یوں پڑا۔ دوسری طرح پر یہ تخیل اس لیے زیادہ موثر ہوا کہ مسیحیت نے بجائے فضائل اخلاق پر زیادہ زیادہ زور دینے کے، اصل زور ذمایم اخلاق کے نتائج پر دیا۔ مشرکوں کا فلسفہ یہ تھا کہ "نیک کردار بنو، فضائل اخلاق سے آراستہ ہو"۔ مسیحیت نے اس کے برخلاف یہ دعوت دی کہ "بدکاری سے بچو۔ ذمایم اخلاق سے اپنے تئیں گنہگار نہ بناؤ"۔ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، لیکن پہلی صورت انسان کو فرشتہ بنانے میں زیادہ معین ہوتی ہے اور آخری صورت شیطان کو انسان بنانے میں۔ قدیم فلسفۂ اخلاق پر عمل سے چند مخصوص اشخاص کا، جو پہلے سے نیک کرداری پر آمادہ و مائل ہوتے ہیں، اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کا ہو سکتا ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ عام افراد کا اخلاق ایک متوسط حد تک اصلاح پذیر ہو جائے۔ یہ قوت صرف اس آخری طریقہ دعوت کو حاصل ہے۔ جو لوگ طبعاً بدکاری کی جانب مائل ہیں، اُن کے سامنے فضائل اخلاق کے مناقب پیش کرنا بالکل بیکار ہیں۔ اُن پر اگر کوئی شے موثر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ بدکاری سے عذاب اخروی میں گرفتار ہو گے اور عذاب دائمی میں پڑو گے۔ انھیں راہ راست پر صرف خوف لا سکتا ہے۔ اور پھر وہ خوف، جو عذاب الٰہی کا ہو، دنیا کی اخلاقی خامیوں کی اصلاح کا یہی ایک راستہ ہے اور اسی کو مسیحیت نے اختیار کر کے گویا کائنات اخلاق میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

دُنیا کی ہر شے میں نفع و ضرر دونوں ہوتے ہیں۔ مفید سے مفید شے بھی ضرر کے پہلو سے خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ مسیحیت نے اصلاح اخلاق کا جو طریقہ اختیار کیا اس نے نہایت کامیاب اثر دکھایا تاہم اس کے مضر پہلو بھی بے اثر نہیں رہے۔ انسانیت کے تاریک رُخ پر ہر وقت زور دیتے رہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء مسیحیت کے ذہن میں انسان کے پُر معاصی ہونے کا تخیل بہت مبالغہ کے ساتھ سما گیا، اور وہ معصیت کو انسان کی اصل سرشت سمجھنے لگے، اُنھوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھ لیا کہ

تقلید کرتے رہنا چاہیئے۔ لیکن تقلید و تتبع، اور اُلفت و محبت میں زمین و آسمان کا فرق ہی۔ یہ شرف مسیحیت کے لیے مخصوص تھا کہ اس نے دنیا میں سب سے اوّل بار لوگوں کو محبت کے راستہ سے اخلاق کی تعلیم دی اور نسلِ انسانی کے سامنے ایک ایسا بلند کیرکٹر، ایک ایسی دلفریب شخصیت پیش کی، جو اپنی دلفریبی و محبّت سے ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ کو متاثر کرتی رہی ہی، جو بہترین محرکِ اخلاق ہی، جو اُنیس سو سال گزر جانے پر بھی بدستور قوی و مؤثر ہی؛ اور جس کی عجیب و غریب قوت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہی کہ گو اس کی ساری زندگی کے صرف تین سالوں کا علم ہی، لیکن اُس کی اسی سالہ زندگی کے کارنامہ طبیعت پر وہ اثر ڈالتے ہیں، جن کا مقابلہ بڑے سے بڑے واعظین کے مواعظ اور بہتر سے بہتر حکما کے مقولہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت میں مسیحی اخلاق کے چشمہ کا منبع یہی مسیح کی محبت رہی ہی، جو صدہا انقلابات پر بھی اب تک جوں کی توں ہی، اور گو آگے چل کر مسیحیوں نے خود اپنے دین و ملت میں بیسیوں رخنے پیدا کیے، لیکن اپنے آقائے نامدار کے سیرت کی دلفریبی پر کبھی کوئی حرف نہ آنے دیا۔ محبت کامل اپنے سامنے کسی استحقاق و دعویٰ کو نہیں ٹھہرنے دیتی۔ پس جو لوگ ایک مرتبہ مسیح کے عشق و محبّت میں سرشار ہوجاتے ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں انتہائی خلوص و ذوق سے کرتے ہیں، جن میں نہ خوف کی آمیزش ہوتی ہی اور نہ صلہ و تحسین کی۔ سینٹ تھریسیا دعا مانگا کرتی تھی کہ کاش ساری کائنات ناپید ہوجائے، اور اکیلی میں موجود ہوں، تاکہ آقا کی خدمتگزاری کا فخر تنہا مجھی کو حاصل رہے، اور اُس کی اس تمنّا کی آواز بازگشت اُس جیسی ہزارہا عاشقانِ مسیح کی زبان سے آتی ہی۔ خود تعدیوں کے زمانہ میں منتہائے شداید پر تحمل و برداشت کی قوّت مسیحیوں میں کس نے پیدا کردی تھی؟ اسی عشقِ مسیح نے۔ زندہ زمین میں دفن کیے جاتے تھے، جنگلی جانوروں کے آگے چھوڑ دیئے جاتے تھے، لیکن صلیب کو اپنے محبوب مصلوب کی محبوب یادگار کو کسی طرح ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے، زخم پر زخم کھاتے تھے، دوسروں کو اُن کی حالت پر ترس آجاتا تھا، لیکن وہ خود خوش و خرّم تھے کہ مسیح کے نام پر یہ زخم کھائے جارہے ہیں۔ موت آتی تھی اور وہ اس کا اس مسرت سے استقبال کرتے تھے کہ گویا دولھا اپنی نئی دُلہن کو آغوش میں لے رہا ہی۔ یہ کیوں؟

محض اس لیے کہ موت سے انھیں اپنے معشوق کا وصل نصیب ہو گا سینٹ فلیسٹیس زندانِ عقوبت میں اسیر تھی کہ وضع حمل کا وقت آگیا۔ ایسی حالت میں اُسے جیسی کچھ تکلیف ہوئی ہو گی ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں۔ اِس حال میں بے اختیارا ایک چیخ اُس کے مُنھ سے نکل گئی۔ ایک تماشائی نے ترس کھا کر کہا کہ "ابھی اسقدر بےچین ہو رہی ہو، ذرا دیر میں درندوں کے سامنے ڈال دی جاؤ گی، وہ تکلیف کیسے برداشت کرو گی؟" اِس پر اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا کہ "نہیں، اُس وقت مجھے مطلق تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ تکلیف میں جس کے لیے برداشت کرونگی درحقیقت خود وہی اُسے برداشت کریگا۔" اِسی طرح جب سینٹ میلینیا کا شوہر اور دونوں لڑکے دفن ہو چکے، اور دنیا میں اُس کا کوئی والی و وارث باقی نہیں رہا تو وہ اُن کی قبروں پر جاکر بیٹھی اور کہا کہ "الٰہی، تیرا شکر ہے کہ تو نے اِن بکھیڑوں سے مجھے نجات دے دی۔ میں اب پوری یکسوئی کے ساتھ تیری خدمت گزاری کرسکونگی۔"

جو لوگ اس واقعیت سے باخبر ہیں کہ جذبات کی قوت و تندی کے مقابلہ میں اکثر محض قوت فرض شناسی کیونکر بیکار ہو جاتی ہے؛ جو لوگ اِس رمز سے آگاہ ہیں کہ اسلام باوجود اپنی خالص توحید اور اعلیٰ نظام اخلاق کے محض اِس باعث کہ اس کے متبعین کے سامنے کوئی اعلیٰ عملی نمونہ نہیں تھا، شرافت و محبّت کے لطیف ترین جذبات سے کس طرح معرّی رہا ہے؟ اور جن لوگوں کے پیش نظر مسیحی تاریخ کے اوراق ہیں جن کی ہر ہر سطر میں محبت مسیح کے کرشمہ نظر آرہے ہیں، وہ سینٹ آگسٹائن کے اس فقرہ کی اہمیت و لطف کا پوری طرح اندازہ کرسکتے ہیں کہ "مسیحی اخلاق، فلسفہ اخلاق نہیں، بلکہ ایک نظامِ محبت ہے۔" بلکہ ایک طرح پر ہم قدماء مسیحین کی پورے جوش محبّت کا اندازہ کرہی نہیں سکتے۔ وجہ یہ کہ اُن کی دماغی زندگی کی ایک خاص خصوصیت تھی، آج جو ہم میں سے کسی میں موجود نہیں۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ کائنات کے مُستمر النظام پابندِ قوانین ہونے کا علم و یقین جیسا آج کل ہم کو ہے، قدماء میں کسی کو نہ تھا۔ آج ہم میں کا کوئی تعلیم یافتہ شخص خواہ کیسا ہی مذہبی جوش عقیدگی میں ڈوبا ہوا ہو، یہ یقین ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکھتا کہ قحط و وبا، طوفان و زلزلہ

کسی مستبد حاکم کی طرف سے انسانی افعال کے صلہ یا سزا کی طور پر نازل ہوتے ہیں، بلکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ طبعی واقعات ہیں جو طبعی و مادّی اسباب سے پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن قدما مسیحین کی یہ حالت نہ تھی۔ اُس وقت عالم کے مستمر النظام ہونے کا عقیدہ تقریباً نامعلوم تھا۔ اُس وقت ہر حرکت براہِ راست ایک فرمانِ الٰہی کی معلول سمجھی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور اپنے زمانہ میں کسی ہستی کے بارہ میں یہ اعتقاد کہ ایک طرف وہ ساری دنیا پر متصرف و حاکم تھا جس کا حکم ہر شے پر حاوی تھا اور جسے کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، دوسری طرف باوجود اس غیر محدود قوت واقتدار کے وہ محض اپنی اُمت کی نجات کے لئے محض اپنے اتباع کے گناہوں کے کفارہ کے لیے انتہائی مظلومیت و بیکسی کے ساتھ سولی پر چڑھ گیا، اور سخت سے سخت شدائد برداشت کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد کسقدر مؤثر ہوتا ہوگا خون میں حرارت پیدا ہوتی ہوگی، تو اسی تخیل سے؛ ارادوں میں جوش پیدا ہوتا ہوگا، تو اسی عقیدہ سے؛ غرض ایسی اُس زمانہ میں جتنی کچھ بھی اہمیت ہو، ہمارے اندازہ سے یقیناً زاید ہوگی۔ مصیبت کا مارا، ایک غریب و ناچار دُکھیارا، جسے دنیا میں ہر طرف ناکامی و مایوسی کا چہرہ نظر آتا تھا، وہ بھی آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہتا تھا کہ "اے مولیٰ تیرا ہی آسرا ہے"۔

پس اگر ایسے مذہب نے، جس نے اپنا مقصد اولیٰ اصلاحِ اخلاق رکھا تھا، اور جس نے اپنے زبردست نظام، اپنے عقیدۂ جزا و سزا، اور اپنی قوتِ تخلیقِ خلوص وخود فراموشی سے قلوبِ انسانی پر ایک عدیم النظیر قابو حاصل کر لیا تھا، اگر ایسے مذہب نے اپنے متبعین کو تقدس کی بہت بلند سطح پر پہنچا دیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ سچ یہ ہے کہ یورپ میں مسیحیت نے اپنے داخلہ سے تقریباً دو سو سال تک پاکیزگیِ اخلاق کا جو نمونہ پیش رکھا، اُس کی نظیر تو شاید کہیں مل جائے تاہم اس سے بہتر نمونہ یقیناً کہیں نہیں ملتا۔ رومیوں کے درمیان رہ کر، مگر اُن کی تباہ کاریوں سے الگ، سیاسی شورشوں سے دُور، مقدمہ بازیوں سے علیحدہ، جنگی و قومی مشاغل سے بیگانہ؛ اپنے آقا کے ظہور کے مشتاق؛ اپنے مذہب کی تعلیمات کے جوش و غلو میں سرشار؛ اور اپنے گرد و پیش کی

زہریلی ہوا سے غیر متاثر؛ ان مسیحیوں نے مدّت دراز تک اپنی اخلاقی آن دبان قایم رکھی
اس سے انکار نہیں کہ اس زمانہ میں بھی اخلاقی انحطاط کے علامات خال خال موجود تھے اور کیونکر
نہوتے جب کہ صدہا برائے نام عیسائی اس حلقہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور دولت
وثروت کا جادو اپنا اثر دکھلانے لگا تھا، تاہم یہ اس وقت کسی کے سان وگمان میں بھی نہ آتا تھا
کہ وہ مذہب جو کچھ دنوں میں شرک وبت پرستی کا بیخکن ثابت ہوگا، جس کے ائمہ کے سامنے
بڑے سے بڑے تاجداروں کو سرنگوں ہو جانا پڑیگا۔ اور جس کے اکابر اپنا اثر دنیا کے تمدّن پر
ایک ہزار سال تک قایم رکھینگے؛ اُس کا یہ عین قوت واقتدار کا زمانہ، تمدنی حیثیت سے
تاریخ کے حقیر ترین زمانوں میں شمار ہوگا۔

اِس زمانہ کے خاص حالات ہم مختصر الفاظ میں بیان کیے دیتے ہیں:۔

مارکس آریلس کی وفات کے زمانہ میں۔ جو وہی زمانہ تھا جب کہ مسیحیت
نے رومہ میں اثر و اہمیّت حاصل کرنا شروع کر دی تھی، سلطنت کے اقبال میں گھن لگ گیا۔
اور روز بروز انحطاط وزوال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ سب سے پہلے مسیحی تاجدار یعنی
قسطنطین نے اپنا دارالحکومت ایک نئے شہر قسطنطنیہ کو قرار دیا، جو شرک وبت پرستی کی
روایات کی زہریلی ہواؤں سے غیر متاثر تھا، اور یہاں اُس نے ایسی سلطنت کی بنا ڈالی
جس کا اخلاق تمامتر مسیحی ماخذ سے ماخوذ تھا، اور جو ۱۱۰۰ سال تک قایم رہی، لیکن اس حکومت
کے بارہ میں، جسے بازنطینی حکومت کہتے ہیں، مورّخین کا یہ متفقہ فتویٰ ہی کہ اس سے
زیادہ ذلیل وپست تمدّن اب تک دنیا نے نہیں دیکھا۔ بے شبہ، ظلم، شقاوت، وبہیمیت
میں اور تمدّن اس سے بڑھ چڑھ کے ہوئے ہیں، لیکن کم ظرفی، دناءت، وسفلہ پن کی
مثالیں کسی دوسرے تمدّن میں اس کثرت سے نہیں ملتیں۔ تمدّن کے ظاہری لوازم کی ان
میں کمی نہ تھی، علم ان کے پاس تھا، یونانِ قدیم کا پُرجوش وپُرعظمت لٹریچر اُن کے پیش نظر
تھا۔ یہ سب کچھ تھا، بااینہمہ سفلہ پن کے مظاہر ہر سمت جلوہ گر تھے سازش ودغابازی، برادرکشی

احسان فراموشی، ناشکر گزاری، بزدلی، وغلامانہ خصوصیات کی ہر طرف گرم بازاری تھی، اور واقعات جو چاروں طرف سُنائی دیتے تھے، وہ اس طرح کے ہوتے تھے کہ آج اس نے اُس کے کھانے میں زہر ملا دیا، کل اُس نے اس کا محرم اسرار دوست بن کر عین موقع پر اسے دغا دی، پرسوں کسی نے کسی رئیس کی ڈیوڑھی کے خواجہ سراؤں کو گانٹھکر محل سے اسباب اُڑا لیا، وغیرہ اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانہ میں نیرو کا سا ظالم، اور ہیلیو گیبلس کا سا بے شرم، کوئی تاجدار نہیں پیدا ہوا، تو پھر یہ بھی تو ہی کہ کوئی فرمانروا انٹونائن و مارکس آریلس کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچا۔ بیہودگی کی یہ حالت قایم تھی کہ مسلمانوں کے حملہ نے مشرقی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور اہل شہر کو ابھی فقیہانہ موشگافیوں سے فرصت نہیں ملی تھی کہ قسطنطنیہ ہلال کے زیر نگیں آگیا۔ ایشیا میں تو کلیسا پر مدت ہوئی فنا طاری ہو چکی تھی، ایشیاے کوچک میں مسیحیت نے پُر جوش و پُر غلو راہب اور متشدد فقہا گو بہت سے پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اخلاق میں شمہ برابر بھی اصلاح نہیں کی تھی۔ لوگوں کو فقیہانہ مناظرہ کا تو ایک اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا، تاہم اُن کی عیش پرستی، اُس کے اثر سے ذرا بھی ماند نہیں پڑی تھی، بلکہ سچ یہ ہی کہ قبول مسیحیت کے بعد تعیش اور بڑھ گیا تھا۔

یہ سرگزشت تو مشرقی سلطنت کی تھی۔ مغربی سلطنت کا حال اس سے کسیقدر مختلف تھا۔ قسطنطین کے اصطباغ کو ابھی پوری ایک صدی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ روم کو الارک نے اپنے قبضہ میں کیا، اور وحشیوں کے متواتر حملوں نے رومی تمدن و معاشرت کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ ادھر ان وحشی حملہ آوروں نے خود ہی مسیحیت قبول کر لی، اور چونکہ ان میں پیشتر سے کسی قسم کا تمدن موجود نہ تھا، اس لیے گرجا کو جو قدما کے تمام خزائن کا محافظ تھا، پورا موقع ملا کہ اس سادہ صفحہ کی جس طرح پر چاہے خانہ پُری کرے۔ چنانچہ اُس نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا صدیوں تک اُس نے دل و دماغ و زبان پر اپنی حکومت قاہرہ قایم رکھی، اور ایسا نظام تمدن برقرار رکھا جس کے ایک ایک رگ و ریشہ میں کلیسا کی محبت

سرایت کیے ہوئے تھی، یہاں تک کہ عہدِ ظلمات میں بھی، جو اپنی تاریک خیالی کے واسطے اسقدر بجا طور پر بدنام ہے، شریفانہ و اعلیٰ اخلاق کے جوہر بکثرت چمکتے نظر آتے ہیں۔ یہ زمانہ بلحاظ فیاضی، مذہبی تقدس و احترام، وفا شعاری، اور مشارکت و معاونت، قدماء مشرکین کے زمانہ سے؛ بلحاظ انسانیت و خدا ترسی رومی تمدّن سے؛ اور بلحاظ عصمت پرستی، یونانی تمدّن سے کہیں بڑھا چڑھا ہوا تھا۔ ایک طرف ان میں یہ خوبیاں تھیں۔ لیکن دوسری طرف وطنیت، قومی ہمدردی، حریت پسندی کا ان میں پتہ نہ تھا۔ نہ ان کے یہاں قدماء کی طرح کوئی اعاظم رجال پیدا ہوئے۔ اور نہ اُن کے اخلاقی مطمح نظر میں کبھی وہ رفعت و لطافت پیدا ہوسکی جو قدماء کے یہاں تھی۔ طوائف الملوکی، بدنظمی، خانہ جنگی، ظلم و جبر، جدال و قتال کا بازار گرم تھا، اور کمالات علمی کی تو شاید ہوا بھی انہیں نہیں لگی تھی۔ اِس سے جاہل تمدّن دنیا میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اختلاف رائے و عقائد پر رواداری کے نام سے کسی کے کان بھی آشنا نہ تھے۔ البتہ مقبول و متعارف عقائد کی تائید میں اختراعِ واقعات و روایات، و خدع و مکر کے لیے کامل رواداری تھی۔ زود اعتقادی و توہم پرستی کی خاص تعلیم دی جاتی تھی اور تحقیق و تنقید کا نام لینا گویا کلماتِ کفر بکنا تھا۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی، بجز فقہاء و راہبوں کے اور اُس زمانہ کا کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس گیارہ بارہ سو سال کی مدت کے کسی زمانہ میں رہنے کے مقابلہ میں یونان و روم کی قدیم حکومتوں میں رہنے کو نہ ترجیح دیتا۔

مشرقی و مغربی حکومتوں کی دوازدہ صد سالہ مختصر تمدّنی تاریخ اوپر کی سطروں میں بیان ہو چکی۔ میرے نزدیک اب اس سے بڑھ کر واضح و معتبر شہادت اس حقیقت کی کیا ہوسکتی ہے کہ اگرچہ مسیحیت نے دنیا کو چند نئے اُصول اخلاق دیئے، اور اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود میں اس نے ایک نہایت زبردست اصلاحی عنصر کا کام دیا، تاہم اس کی جو شکل کلیسائے یونان و رومہ نے پیش کی، اُس کے لحاظ سے یہ بالکل اس کے لیے ناموزوں تھی کہ کسی تمدّن کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی۔ بعض مصنفین اس الزام کو رفع کرنے کے لیے یہ

تاویل پیش کرتے ہیں کہ "رومی سلطنت میں مسیحیت کے دین حکومت ہونے سے پیشتر ہی انحطاط شروع ہوگیا تھا، اور چونکہ مسیحی حکمرانوں نے قدیم مشرکانہ روایات کو ایک حد تک زندہ و برقرار رکھا۔ اس لیے جو کچھ خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کی ذمہ داری مسیحیت پر کسی طرح عاید نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ کہ عہد ظلمات میں جو جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس کا اصلی باعث وحشیوں کے حملے تھے، جو امن پسندوں کو دم ہی نہیں لینے دیتے تھے۔" یہ تاویل ایک حد تک واقعیت پر مبنی ہے۔ لیکن رفع الزام کے لیے کافی نہیں۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ بازنطینی حکومت کا صدر مقام تو ایسا شہر تھا، جو مشرکانہ روایات و رسوم سے قطعاً غیر متاثر تھا، نیز یہ کہ مغرب میں مسیحیت کو وحشیوں کی شورش کے اچھی طرح فرو ہو جانے کے بعد، پورے سات سو سال تک عروج و اقتدار کامل حاصل رہا، تو اس تاویل کا وزن کچھ بھی نہیں باقی رہ جاتا، اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مسیحیت کو اپنے امتحان دینے کا پورا موقع حاصل رہا۔ اور اس امتحان میں وہ ناکام ثابت ہوئی۔ یہ بتادینا بہت آسان ہے کہ قدما میں فلاں فلاں معایب تھے، اور مسیحی تحریریں ان سے بالکل پاک ہیں لیکن یہ طریق موازنہ قرین انصاف نہیں۔ اگر ہم انصاف کے ساتھ موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو چاہیئے کہ دونوں تمدنوں کا بہ حیثیت مجموعی موازنہ کریں، اور صرف اسی پر نظر نہ رکھیں کہ ایک تمدن میں کیا کیا نقصانات تھے، جن سے دوسرا پاک رہا، بلکہ یہ بھی لحاظ رکھیں کہ ہر تمدن بہ لحاظ فضائل اخلاق کے تنوع اور مدارج کے دوسرے سے کہاں تک ممتاز رہا۔ اور جب ہم اس طریقہ پر موازنہ کرتے ہیں، تو نتائج ذیل پر پہنچتے ہیں:-

(۱) مسیحیت نے اپنی زندگی کی ابتدائی دو صدیوں میں اپنی اخلاقی سطح نہایت بلند رکھی۔ اور اس کی یہ بلند اخلاقی، خاص طور پر اس کے دین برحق و الہامی ہونے کی سند میں پیش کی جاتی رہی۔

(۲) تیسری صدی سے انحطاط کے علامات پائے جانے لگے۔

(۳) اس کے بعد کی دو صدیاں بہ بقول پادری مورخوں کے، معصیت وسیہ کاری کی صدیاں تھیں۔

(۴) اس کے بعد جو زمانہ خاص مسیحی تمدن کا ۸-۱۰ صدیوں تک رہا، گو فضائل سے خالی نہ تھا، تاہم وہ اس قابل نہیں کہ مسیحی اسے فخر کے ساتھ اپنی تائید میں پیش کریں۔

(۵) آخری تین صدیوں (یعنی سترھویں، اٹھارھویں، اور انیسویں) میں، تمدن بے شبہہ پھر نہایت بلند سطح پر آ گیا ہی، لیکن اس کے لیے یہ مسیحی اخلاق کا کچھ یوں ہی سا دست نگر ہی۔ ورنہ سائنس کی ترقی، آلات کی ایجادیں، علوم طبعی کے انکشافات، کاروباری زندگی کا پھیلاؤ، علم و لٹریچر کی اشاعت عام، نظام حکومت کی برتری، قدما کی روایات غرض موجودہ تمدن کو اس قدر بلند سطح لانے والی تمامتر ہی مادّی چیزیں ہوئی ہیں۔ بلکہ اگر زیادہ دقت نظر سے تفتیش کی جائے تو دو حقایق اصولی اور بھی ظاہر ہونگے:-

(الف) اوّلاً یہ کہ قرونِ وسطےٰ کے تمدّن کو خواب غفلت سے ہوشیار کرنے والی چیزیں اور یہ دونوں تھیں مسیحیت کے اثر سے بالکل الگ تھیں۔ ایک قدماء یونان و روم کا لٹریچر، دوسرے مسلمانوں کے مدارس و درسگاہیں۔

(ب) ثانیاً یہ کہ تمدن جدید، جوں جوں مذہب کے اثر سے آزاد ہوتا گیا ہی اسی نسبت سے ترقی کرتا رہا ہی۔ فنِ طب، سائنس، صنعت و حرفت سیاسیات، بلکہ فلسفۂ اخلاق تک کسی شے کو اٹھا کر دیکھیے، ہر جگہ یہ نظر آئے گا کہ جوں جوں کلیسا کی گرفت ہلکی پڑتی گئی ہی، تمدّن کی رفتار تیز ہوتی رہی ہی۔ (اس مبحث پر ہم نے اپنی ایک دوسری تصنیف

"تاریخ عقلیتِ یورپ" میں تفصیل سے نظر کی ہے۔

ان مراتب کے بعد اب اصل مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر ایک ایسا مذہب جو اپنی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے بے نظیر ہے، جو انسان کے دل و دماغ، دست و زبان پر ایک حیرت انگیز اثر و اقتدار رکھتا ہے۔ اور پچھلی تین صدیوں سے دنیا کے لیے آیۂ رحمت ثابت ہو رہا ہے، ہزار بارہ سو سال تک اخلاق یورپ کی اصلاح میں ناکام و بے بس رہا؟ میرے خیال میں اس کے متعدد و پیچیدہ اسباب تھے۔ اور اس مدّت میں کلیسا اگرچہ بعض حیثیات سے اصلاح کرتا رہا، لیکن بعض دوسری حیثیات سے تخریب و زوال کا بھی باعث رہا۔ اِس اجمال کی تفصیل کے لیے آیندہ فصلیں ملاحظہ طلب ہیں۔
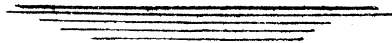
فصل (۲)

مسیحیّت کا پہلا سبق نفس انسانی کا احترام

مسیحیت نے آکر دنیا کو سب سے پہلا اخلاقی سبق اخوت انسانی کا دیا۔ اُس نے یہ بتایا کہ کسی شخص کی زندگی اس دنیا میں نہیں ختم ہوتی بلکہ ہر شخص کو اُس کے بعد آخرت میں جزا و سزا ملتی ہے اور ہر شخص حصول نجات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متحد اور اُس کے مساوی ہے۔ اور اس بنا پر ہر بشر کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں کی زندگی کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھے۔ یہیں سے دنیا میں نفس بشری کی عظمت کا عقیدہ سب سے پہلی بار پھیلا۔ یہاں پر جملہ معترضہ تو ہوتا ہے لیکن مسئلہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہم اصل مبحث سے ذرا ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔

ضمیریت پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ جن عقائد کو داخل سرشت و جزو فطرت سمجھا جاتا ہے وہ تحقیقات کے بعد ایسے نہیں ثابت ہوتے مثلاً ایک قتل انسانی ہے کہ اس کی طرف سے نفرت کو جزو فطرت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ معترضین کی اصولی غلط فہمی ہے۔ حامیان ضمیریت نے یہ کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ متعیّن ومشخّص افعال کے متعلق نفس بشری میں نفرت یا رغبت کی یکساں کیفیت پائی جاتی ہے اُن کا دعویٰ صرف اسقدر ہے کہ دنیا میں رذایل کی طرف سے نفرت اور فضائل و محاسن کی طرف رغبت ایک اجمالی طور پر سب انسانوں کے ذہن میں فطرۃً برابر درجہ کی پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ احساس ہر شخص کے دل میں فطرۃً موجود ہوتا ہے کہ انسانیت، رحم، وخدا ترسی قابل اختیار ہیں اور شقاوت، بیرحمی و بیدردی قابل ترک۔ رہا یہ کہ انسانیت و شقاوت کی تعریف کیا ہے؟ تو اس کا دار و مدار تمام تر سوسائٹی کے اثرات و تعلیم و تربیت پر ہے اور انہیں کے اقتضا سے ان کی تعریفات مختلف ممالک و مختلف زمانوں میں بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ خود اسی مسئلہ قتل انسانی کو لیجئے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وحشی قبائل کا ذکر نہیں، اکثر اچھی خاصی متمدن جماعات میں

بھی اپنے بعض ہمجنسوں کی خونریزی کا تماشہ دیکھنا ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا گیا ہے۔ رومیوں کو اپنے غلاموں اور سپاہیوں کی جان کی کچھ بھی پروا تھی؟ اہل یونان وحشیوں کے قتل و ہلاکت کو کچھ بھی معیوب سمجھتے تھے؟ اہل اسپین اپنی مفتوح امریکی قوموں کی زندگی ایک ذرہ برابر بھی عزیز رکھتے تھے؟ خود آج بیسیوں فاتح قومیں اپنے مفتوحوں کے ساتھ کیا سلوک رکھتی ہیں؟ ان سب چیزوں کو بھی جانے دیجئے۔ ایک بچہ کشی کی رسم کو لیجئے، کتنے ملک ایسے ہیں جو اس رسم سے بچے ہوئے ہیں؟ اور تو اور، تین سو سال اُدھر خود انگلستان کی اس باب میں کیا روش تھی؟ قدما میں نیک دل سے نیک دل رحیم سے رحیم اشخاص بلا تکلف سیافی اور دیگر خونریز مناظر کی سیر کرتے تھے۔ غرض یہ ایک مسلم اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تفصیلات اخلاق کا معیار ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی ان اختلافات رواج سے حجت پکڑ کر ضمیریت پر اعتراض کرتا ہے، تو اس کا اعتراض تمام تر باد رہوا ہے۔ ضمیریت کی صحت کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ اگرچہ ہر ملک اور ہر زمانہ نے اپنے لئے ایک جداگانہ معیار اخلاق قرار دیا ہے تاہم اتنے جزو پر نوع انسانی ہمیشہ متفق رہی ہے کہ اصولی حیثیت سے اخلاق بداخلاقی سے نیکی بدی سے، اور خیر شر سے بہتر ہے۔ فلاطون، جو بچہ کشی کی تلقین کرتا تھا، کیٹو جو اپنے ضعیف غلاموں کو فروخت کر ڈالتا تھا، پلینی، جو ذوق و شوق کے ساتھ مناظر سیافی سے لطف اُٹھاتا تھا، قدیم جنرل جو اسیران جنگ کو غلامی یا سیافی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے، موجودہ زمانہ کے جنرل جو اس طرز عمل کو وحشیانہ خیال کرتے ہیں، قدیم واضعان قانون جو سزائے موت کے لئے طرح طرح کی ہولناک طریقے جاری کرتے تھے، حال کے واضعان قانون جو سزائے موت کو باہتمام آسان وسہل بناتے ہیں قدیم استاد جو مار پیٹ کر پڑھاتے تھے، حال کے اُستاد جو سمجھا بجھا کر پڑھاتے ہیں، بڑے سے بڑے بیدرد شکاری اور رحم دل سے رحم دل اشخاص جو شکار کے خیال سے بھی لرز اُٹھتے ہیں، یا جو ذبح حیوانات کے لئے آسان اور بے تکلیف طریقہ ایجاد کرنے میں مشغول رہتے ہیں، غرض یہ کہ تمام مختلف الرائے و مختلف الخیال اشخاص جو اپنے عقاید و اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے زمین و آسمان کا فرق رکھتے ہیں، اتنے جزو پر بہرحال بالکل متحد و ہم رائے ہیں کہ ظلم و شقاوت قابل نفرت اور انسانیت و

رحم قابل تحسین ہے۔

خیر یہ فقرہ معترضہ توضیح بریت کے مخالفین کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ مسیحیت کا شاید سب سے زیادہ روشن کارنامہ یہ ہے، کہ اُس نے نہ صرف عام طور پر لوگوں کو باہمی حسن سلوک کی تعلیم دی، بلکہ قتل انسانی کو ایک معصیت کبیرہ قرار دے کر دنیا کی تاریخ اخلاق میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں بھی سب سے بڑی بات یہ کہ حیات انسانی کے مفہوم سے اس نے حیات کے بالکل ابتدائی دَور کو مستثنیٰ نہیں رکھا، بلکہ رحم مادر میں جس جس وقت سے نطفہ قرار پاتا ہے، اپنی وقت سے اُس نے اس پر زندگی کا اطلاق شروع کر دیا قدماء کے نزدیک اسقاط حمل مطلق معیوب نہ تھا۔ کیونکہ ایک توقف تو یہ غلط طبی مسئلہ رائج تھا کہ حالت جنین میں زندگی نہیں ہوتی، دوسرے یہ بھی ایک بالکل قدرتی جذبہ ہے کہ جو رنج جوان آدمی کی موت سے اس کے اعزاو احباب کو ہوتا ہے، وہ ایک ایسی ہستی کی ہلاکت سے قطعاً ہمارے دل میں نہیں پیدا ہو سکتا جس کی طرف سے نہ ابھی ہمارے دل میں کچھہ توقعات قایم ہوئی ہیں اور نہ جسے جان دینے میں کچھہ تکلیف ہوتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر قدماء کے نزدیک اسقاط بالکل جائز تھا۔ ارسطو نے اسے نہ صرف جائز قرار دیا، بلکہ یہ کہہ دیا تھا کہ جب ملک کی آبادی ایک خاص حد سے بڑھنے لگے، تو اس قاعدہ کو حکماً نافذ کرنا چاہیئے۔ مصنف ہذا کے علم میں یونان و جمہوریت روما نے کبھی اسے ناجائز نہیں قرار دیا، لیکن اگر جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے، کسی زمانہ میں قانون نے اسے جرم قرار دیا بھی تھا، تو یہ قطعی ہے کہ اس قانون کا نفاذ کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ متعدد مسیحی و مشرک مصنّفین کی متفقہ شہادت ہے کہ یہ رسم اس زمانہ میں علانیہ و بالعموم جاری تھی۔ اس کے اسباب کیا ہوتے تھے؟ ایک افلاس، دوسرے حفظِ نفس کہ حمل کے زمانہ میں مرد کی صحبت ترک کرنا ہوگی اور تیسرے جسمانی زینت و خود آرائی کا شوق کہ وضع حمل و رضاعت سے عورت کے بعض اعضا میں مثل سابق کے رعنائی و خوش نمائی نہیں باقی رہتی۔ یہ مصنّفین اس والدہ کا ذکر غیر معمولی مدح و ستایش کے ساتھ کرتے ہیں، جس نے کبھی اپنی اولاد غیر مولود کو ہلاک نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج عام تھا، اور اس کی تعمیم کی بڑی دلیل تو یہی ہے

کہ حمل کو نہ ٹھیرنے دینا، ایک مستقل پیشہ ہو گیا تھا، بیسیوں عورتیں تھیں، جن کا ذریعہ معاش یہی تھا کہ مختلف تدابیر سے وہ حمل نہ ٹھیرنے دیں اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ آوڈ، سنیکا، جونیل، ویلوٹارک گو اس کی تعمیم کی پوری شہادت دیتے ہیں، تاہم اسے معصیت بھی قرار دیتے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ اس وقت رومی اسے معیوب تو سمجھنے لگے تھے، لیکن اسے کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

مگر مسیحیوں نے اپنی روش شروع ہی سے اس باب میں مختلف رکھی۔ اپنے لب و لہجہ میں نہایت شدت قطعیت کے ساتھ اور رجال تو اتر و استقلال انہوں نے ہمیشہ اس رسم کو نہ صرف قبیح و مذموم ظاہر کیا، بلکہ اسے صاف قتل عمد کے مرادف قرار دے دیا گرجا کی عمارت میں حصول تبرکات کے لئے داخلہ جن چند خاص جرایم کی شکل میں ممنوع قرار دیا گیا تھا اُن میں اسقاط کا جرم بچہ کشی کے مساوی رکھا گیا تھا، بلکہ شروع شروع اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں رکھا گیا تھا، اور یہ ایسا جرم قرار دیا گیا تھا جو موت کے وقت تک کسی ریاضت، کسی توبہ، کسی استغفار سے محو ہی نہیں ہو سکتا۔ اور گو اس سزا کی میعاد بعد کو گھٹا کر دس سال اور سات سال تک کر دی گئی، تاہم یہ جرم ہمیشہ بہ طور معصیت کبیرہ کے شمار ہوتا رہا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس خیال کی زیادہ تائید ایک ایسے عقیدہ سے ہوئی، جو پادریوں کے علم العقائد میں نہایت ہی مہمل عقیدہ ہے۔ مشرکوں اور اکیلے مشرکوں پر کیا موقوف ہے عام طور پر دنیا کے نزدیک اسقاط و بچہ کشی اگر جرایم ہیں بھی، تو کسی بالغ جیتے جی انسان کے قتل عمد کے مقابلہ میں تو یہ یقیناً ہلکے ہیں۔ لیکن پادریوں کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اُن کے نزدیک بچہ کی جان ایک غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ اُن کے عقیدہ کے بموجب جنین میں جونہی روح پڑی، اُس پر آدم کے گناہ کی ذمہ داری، اور روز حشر کی مسئولیت عائد ہو جاتی تھی، اور اگر وہ قبل ولادت کے ہلاک ہو گیا، تو اُس کی روح یا تو (بہ قول کلیسائے یونان) ہمیشہ عالم برزخ میں پڑی رہیگی اور یا (بہ قول کلیسائے رومہ کے) قعر جہنم میں ڈال دی جائیگی۔ یہ عقیدہ گو بجائے خود مہمل ہے، تاہم لوں میں بچہ کی زندگی کی عظمت و اہمیت پیدا کرنے میں یہ بڑی حد تک موثر ثابت ہوا، اسی کے اثر سے آج ہمارے دلوں میں بچہ کی زندگی کا وہ احترام قایم ہو گیا ہے، جسے کوئی اعتقادی تغیر، کوئی مذہبی

تبدیلی کوئی تحول دین نہیں بدل سکتا۔ قرون اولیٰ و وسطیٰ میں جو شے مسیحیوں میں اطفال کشی سے سب سے زیادہ روکتی تھی، وہ یہ خیال نہ تھا کہ بچہ بلا وجہ قتل و ہلاک کئے جا رہے ہیں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بلا اصطباغ کے قتل کئے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ اسی زمانہ کے ایک شخص کا یہ افسانہ مشہور ہے کہ اُسے قبل ولادت بچہ کی حالت دیکھنے کا بہت شوق تھا، ایک دن اسی اضطرار شوق میں اُس نے ایک حاملہ عورت کو قتل کر ڈالا جس سے عورت اور بچہ دونوں مر گئے، اب ہوش درست ہوئے پر اُسے ندامت ہوئی، اور توبہ و استغفار کی نیت سے اُس نے ایک جنگل میں جا کر تنہا عبادت و ریاضت شروع کر دی۔ سالہا سال کی مشقت کے بعد ایک صدائے غیبی آئی کہ "عورت کے قتل کا جرم معاف کر دیا گیا" لیکن وہ مرتے مرتے مر گیا، مگر یہ صدا اُس کے کان میں کبھی نہ آئی کہ طفل غیر مولود کے قتل کا گناہ بھی بخش دیا گیا۔ اس افسانہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد غیر مولود کے قتل کا جرم کس قدر سنگین خیال کیا جاتا تھا۔

اسقاط کے بعد طفل کشی کا نمبر آتا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ تمدن قدیم کے دامن پر طفل کشی کا ایک سخت بدنما دھبہ ہے۔ اس دستور کی تاریخ کچھ عجیب سی ہے۔ وحشی، جن کے دماغ میں جذبہ رحم و خدا ترسی بالکل ابتدائی و ناقص حالت میں ہوتا ہے اور جن کا خانہ بدوشانہ طرز معاشرت بجائے خود اُن پر بچوں کی پرورش و پرداخت وبال کر دیتا ہے۔ اُن کے یہاں غالباً عام دستور یہ ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے پر والدین خود یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اُسے زندہ رہنا چاہیئے یا نہیں، اور اگر نفی میں فیصلہ ہوتا ہے، تو اُسے قتل کر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد تمدن کا جو درجہ آتا ہے، اس میں یہ دستور بہت ہلکا پڑ جاتا ہے، تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیئے، کہ مدارج تمدن کے ساتھ ساتھ یہ دستور بھی مٹ جاتا ہے۔ کیونکہ شائستگی پھیلنے کے بعد یہ رواج از سر نو پھیلتا ہے گو اب اس کی محرک وحشیانہ شقاوت نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ناجائز حظ نفسانی کی سعی اخفا ہوتی ہے۔ پھر بعض اقوام و ممالک میں یہ رواج یوں قایم ہو جاتا ہے کہ والدین اولاد کو اپنی عزیز ترین ملک سمجھ کر خدا کی راہ میں بہ طریقہ قربانی کے نذر کر دیتے ہیں۔ خود یونان میں اگرچہ عملاً یہ رواج عام

طور پر جاری نہ تھا، بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ تھیبس میں یہ جرم سزائے موت کا مستلزم تھا، تاہم علی العموم یونان میں یہ اصولاً بالکل جائز تھا اور اصول افادہ کی بناء پر فلاطون وارسطو، لائیکرگس و سولن نے اسے قانوناً واجب کر دیا تھا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ آبادی جب ایک حد معیّن سے بڑھ جائے گی، تو یقیناً ملک کی فلاح و بہبود پر مضر اثر ڈالے گی، خصوصاً اگر ملک میں زیادہ تعداد بیکار و معطل العضو افراد کی ہوئی تو صریحاً ملک کو نقصان عظیم پہنچے گا۔ اس لئے یونانی قانون سازوں نے صاف یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو مریض و معطل العضو اطفال جماعت و ملک کے لئے بار ہوں انہیں بے تکلیف طریقہ سے ہلاک کر ڈالنا چاہئے۔ یہ حکم ملکی خیر اندیشی و مصلحت شناسی کی بنا پر تو تھا ہی، اُس کو کچھ تقویت تو یونانی عیش پرستی سے پہنچی، جس کا یہ عالم تھا کہ کسی شوہر کو رضاعت وغیرہ کے زمانہ میں اپنی بیوی کی ہم بستری سے عرصہ تک محروم رہنا گوارا نہ تھا۔ اور کچھ اس کی یوں بھی تائید ہوئی کہ مائیں، جو باپوں کی بہ نسبت صغیر سن اطفال سے زیادہ محبت و اُلفت رکھتی ہیں، اپنے شوہروں پر اس قدر اثر ہی نہیں رکھتی تھیں کہ انھیں اطفال کشی سے مانع آسکیں۔

رومائے قدیم میں والدین کو اپنی اولاد کی موت و زیست پر اختیار حاصل تھا۔ اس اختیار کی بنا پر قتل اطفال کا شمار بہت زیادہ بڑھ گیا ہوتا۔ لیکن اس کی روک تھام کے لئے ایک اور نہایت قدیم قانون رومولس کے وقت سے موجود تھا، جس کا منشاء یہ تھا کہ والد پر اپنی تمام اولاد ذکور کو اور اولاد اُناث میں سب سے بڑی اولاد کو پرورش کرنا فرض ہے، اور کسی صحیح و سالم اولاد کو تاوقتیکہ اُس کی عمر تین سال کی نہ ہو جاوے قتل نہیں کر سکتا[۱]۔ البتہ وہ ناقص العضو اولاد کو اسکی ولادت کے وقت ہلاک کر سکتا ہے، مگر اپنے قریب ترین اعزہ میں سے پانچ آدمیوں کی منظوری کے بعد۔ رومہ کا اصل الاصول، بہ خلاف یونان کے آبادی کو محدود کرنا نہیں، بلکہ بڑھانا تھا۔ چنانچہ رومہ میں اطفال کشی کی کہیں گرم بازاری نہیں ہوئی، بجز اس زمانہ کے کہ جب سلطنت کے دورِ انحطاط میں نفس پرستی

[۱] عمر کی قید غالباً اس لئے تھی کہ اس اثناء میں والدین کو خواہ نہ خواہ بچہ سے محبت بڑھ جائیگی۔ اور تین برس کے پلے پلائے بچہ کی جان لیتے ہوئے از خود وہ ہچکچائینگے

وشہوت رانی کی عام ہوا چل گئی۔ مگر اس وقت بھی قانون سازان رومہ خاموش نہیں رہے بلکہ اونہوں نے اسے سختی سے معیوب قرار دیا، اور بالواسطہ قوانین کی مدد سے اس کا انسداد کرنا چاہا۔ مثلاً کثیر الاولاد اشخاص کو خاص حقوق و مراعات دیے، مفلس والدین پر ٹیکس بہت ہلکے رکھے اور لاوارث بچوں کی حفاظت کا بھی ایک حد تک سامان کیا عام رائے بھی اس دستور کو مجرمانہ سمجھتی تھی، چنانچہ عیسائیوں کے خلاف جو غلط الزامات لگائے جاتے تھے منجملہ ان کے ایک الزام یہ بھی تھا۔ باایں ہمہ مسیحی و مشرکانہ دونوں شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اطفال کشی کا دستور رومہ میں انحطاط سلطنت کے وقت عام طور پر رائج ہو گیا تھا، اور بہ قول ٹرٹولیین کے اس باب میں جو قوانین موجود تھے اُن کی گرفت سے نہایت آسانی سے رہائی ہو جاتی تھی۔ اسی زمانہ میں بچوں کی ہلاکت کے دو مختلف طریقے پیدا ہو گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں براہ راست قتل کر ڈالا، دوسرے یہ کہ انہیں خود قتل نہیں کیا بلکہ کسی سنسان مقام پر جا کر تنہا چھوڑ آئے کہ وہیں پڑے پڑے ہلاک ہو جائیں۔ آخر الذکر جرم کبھی قانونی مواخذہ کے تحت میں نہیں آیا۔ چنانچہ یہ دستور نہایت کثرت کے ساتھ کھُلے خزانہ جاری رہا، اور مفلس والدین کے لئے کوئی شخص اسے سنگین جرم نہیں خیال کرتا تھا۔ یہ متروک بچے بہت سے تو ہلاک ہو جاتے تھے لیکن اکثر صورتوں میں یہ ہوتا تھا کہ لوگ انہیں اُٹھا کر فروخت کر ڈالتے تھے، اور عموماً لڑکے غلامی کے لئے، اور لڑکیاں طوائف کے پیشہ کے لئے خرید لی جاتی تھیں۔

غرض اشاعت مسیحیت کے وقت اس خاص باب میں لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ معیوب ہے، البتہ اس جذبہ کو قوی کرنے، اطفال کشی کو سخت ترین معصیت قرار دینے اور متروک اولاد کی حفاظت کے سامان کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مسیحیت نے یہ سب کچھ کیا۔ اُس نے سب سے پہلے پُر زور طریقہ پر اطفال کشی کو معصیت کبیرہ ٹھیرایا، جیسا کہ صفحات بالا میں گزر چکا ہے، اور پھر لوگوں کی یہ بھی بتایا کہ متروک اولاد کو اجنبیوں کے رحم پر چھوڑ دینا بھی ایک طرح پر انہیں قتل ہی کرنا ہے۔ مسیحیت کا یہ اثر قانون میں بھی اپنی جھلک دکھانے لگا۔ روایت

ہے، کہ لیکٹینٹس کے مشورہ سے قسطنطین نے اپنے سنہ اصطباغ ہی میں یہ فرمان جاری کر دیا
کہ نادار والدین کی اولاد کے کھانے کپڑے کا خرچ سرکار کے ذمہ رہیگا۔ یہ قاعدہ انٹونائنس[۵] کے
عہد حکومت میں بھی جاری تھا، لیکن قسطنطین نے اسے ازسرنو باضابطہ صورت میں پہلے اٹلی میں
جاری کیا، اور پھر ۳۲۲ء میں آفریقہ تک اسے وسیع کر دیا۔ ۳۲۹ء میں یہ قانون نافذ ہوا کہ والدین
اپنی اولاد کو فروخت کرنے کے بعد پھر قیمت دے کر اُسے واپس لے سکتے ہیں۔ ۳۴۱ء میں
اس قانون کا نفاذ ہوا کہ متروک اولاد جب کسی شخص کی زیر پرورش آجائے، تو وہ اسی کی ملک ہو جاتی
ہے، وہ اُسے جس پیشہ میں چاہے لگا دے، والدین کو اُس پر کوئی حق باقی نہیں رہتا اور
نہ وہ اُسے واپس لے سکتے ہیں۔

مگر یہ آخر الذکر ہر دو قوانین صحیح معنی میں اصلاحی قوانین نہیں کہے جا سکتے، کیونکہ اُن سے
بہتر قوانین پیشتر سے موجود تھے۔ مثلاً ایک قدیم قانون مشرکوں کے زمانہ سے یہ چلا آتا تھا، کہ والدین
جب چاہیں انہیں متروک والدین کو اجنبی مربیوں اور آقاؤں سے، قیمت دے کر پھر واپس لے
سکتے ہیں، بلکہ ٹریجن نے تو یہاں تک حکم جاری کر دیا تھا کہ اولاد متروک کسی صورت میں غلامی کے
پیشہ میں نہیں لگائی جا سکتی۔ اس قانون کے مقابلہ میں قسطنطین کا ۳۳۱ء والا قانون، جس نے
اولاد متروک کی دائمی غلامی پر مہر ثبت کر دی کسی طرح قابل ستایش نہیں کہا جا سکتا۔ یہ قانون،
مغرب کی حکومت میں تو ہمیشہ جاری رہا، البتہ مشرق میں یہ ہوا کہ ۵۲۹ء میں جسٹینین نے پھر
مشرکوں کے قانون کی تجدید کر کے، غلامی کے پیشہ کو متروک اولاد کے لئے بالکل ناجائز کر دیا،
یہی حال قسطنطین کے دوسرے قانون، یعنی ۳۲۹ء والے قانون کا ہے۔ کیونکہ متعدد مشرک
تاجداروں بالخصوص کریکلا نے آزاد بچوں کی تجارت کو بالکل منع کر دیا، اور ڈایوکلیشن نے تو اس باب
میں بہت سخت قوانین نافذ کر دیے تھے۔ البتہ قسطنطین کو اپنے قانون کے نفاذ کی ضرورت شاید
اس لئے پیش آئی کہ ملک کی اندرونی لڑائیوں نے اس وقت صدہا باشندوں کو بالکل نادار بنا

---

[۵] انٹونینس کے نام سے روما میں دو سلاطین ہوئے ہیں۔ یہ اُن کی جمع ہے

دیا تھا، اور اُس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ غلاموں کی تجارت کو از سرِ نو رواج دیا جائے۔ اسکے بعد کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ ہنیوڈوسیس اعظم نے یہ قانون نافذ کیا، کہ متروک اولاد کو والدین اُن کے مربّیوں سے بلاقیمت دیے ہوئے واپس لے سکتے تھے، کیونکہ جتنے دن اُنھوں نے خدمت لی، یہ کافی معاوضہ ہو چکا۔ لیکن ویلینٹینین سوم نے اس قانون کو منسوخ کر دیا۔ عملاً اولاد فروشی، باوجود پادریوں کے شور و غل کے کے، تھیوڈوسیس کے بعد مدتوں جاری رہی اور کسی مسیحی فرماں روا نے ڈایوکلیشن مشرک کے مفید و اصلاحی قانون کی تجدید نہ کی۔

اس طرح کے قوانین کا مقصد متروک اولاد کے تحفظ و بقا کے لئے سامان کرنا تھا، لیکن ان کے علاوہ بعض قوانین ایسے جاری کئے گئے، جس کا مقصد براہ راست اطفال کشی پر مواخذہ کرنا تھا، یہ قوانین کب اور کس طرح جاری ہوئے؟ یہ ایک بہت ہی بحث طلب واختلافی مسئلہ ہے لیکن اس قدر غالباً صحیح ہے کہ مشرک واضعان قانون، اطفال کشی کو قتل عمد کی ایک قسم قرار دیتے تھے، گو اُسے اس قدر سنگین نہیں خیال کرتے تھے جتنا کہ قتل عمد کی اور اقسام کو، چنانچہ اطفال کشی کی سزا، سزائے موت کی بجائے جلاوطنی تھی قسطنطین نے ایک قانون کے ذریعہ سے جو شاید صرف افریقہ کے لئے مخصوص تھا، جہاں بچہ اکثر زحل کی نذر کر دیے جاتے تھے، قتل اولاد کو قتل کی دفعہ میں رکھا، ویلینٹینین نے ۳۷۴ء میں اسے قتل عمد کا جرم قرار دیا، اور متروک اولاد کے والدین پر خصوصیت کے ساتھ سختی کی۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسقاط و اطفال کشی کی سزا یہ نافذ ہوئی کہ یا مجرم کی آنکھیں نکال لی جائیں یا اُسے قتل کر ڈالا جائے۔ شارلیمن نے اپنے عہد میں طفل کشی کی سزائے موت رکھی۔

اب آج یہ متعین طور پر دریافت ہونا دشوار ہے کہ ان قوانین نے اطفال کشی کا کس حد تک انسداد کیا، تاہم مسیحیت کا اتنا اثر تو قطعی ہوا کہ متروک اولاد کی تجارت کا دروازہ بند ہو گیا اور دلوں میں طفل کشی کی اہمیت و معصیت پوری طرح جم گئی۔ اس جرم کے ارتکاب کا ایک بہت بڑا سبب والدین کا افلاس ہوتا تھا۔ مسیحیت نے اس کا بھی علاج کر دیا۔ صدہا مسیحیوں نے فرداً فرداً

متروک اولاد کو اُٹھا کر تعلیم و تربیت دی۔ اور چند صدیوں بعد یعنی قرون وسطیٰ کی ابتدا میں اجتماعی کوشش سے اُنھوں نے اس مقصد کے لئے پرورش گاہیں کھولنا شروع کر دیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک ایسی پرورش گاہ ٹریوس میں چھٹی صدی میں، اور رانیگرس میں ساتویں صدی میں کھُلی تھی، اور آٹھویں صدی میں میلان میں ایک کا قایم ہونا تو یقینی طور پر ثابت ہے۔ نویں صدی میں رووین کے پادریوں نے ایک صلاے عام دیا کہ جو مائیں اپنے وضع حمل کو مخفی رکھنا چاہتی ہیں، وہ گرجا کے دروازہ پر اپنی اولاد نومولود کو چھوڑ جایا کریں کہ یہاں اُن کی پرورش ہو جاے گی۔ ایسے بچّوں کی تعلیم و تربیت غالباً گرجا کے خدام و غلاموں کے ساتھ ہوتی تھی، کیونکہ ایسی اولاد کو غلام بنانا گرجا کے نزدیک کچھ معیوب نہ تھا، جیسا کہ ٹارکیمین کے ایک قانون اور آرلیس کے پادریوں کی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلہ سے ظاہر ہے کلیسا نے عورت کی بےعصمتی کو اُمّ القبایح خیال کیا، اس لئے اس قسم کی پرورش گاہوں میں خاطر خواہ سرعت کے ساتھ ترقی نہ ہو سکی۔ خود رومہ میں، جو اس قسم کے خیرات خانوں کا مرکز تھا، اس قسم کی پرورش گاہ تیرہویں صدی سے پیشتر نہ قایم ہو سکی۔ اور بارہویں صدی کے وسط میں میلان والوں پر یہ ایک سخت الزام عاید کیا گیا، کہ وہ متروک اولاد کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس صدی کے خاتمہ پر مونٹ پیلیر کے ایک راہب نے روح القدس کے نام پر ایک انجمن قایم کی جس کا مقصد بچّوں کو تعلیم و تربیت دینا تھا۔ اس انجمن کی پندرہویں صدی تک مختلف شاخیں، تمام یورپ میں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ابتدائی مقاصد میں اگرچہ صرف جائز شادیوں کی یتیم اولاد کو تعلیم دلانا داخل تھا اور ناجائز بچّوں کو یہ اپنے یہاں داخل کرنا حرام جانتی تھی، تاہم کچھ عرصہ میں متروک اولاد کی تربیت و پرداخت عملاً اسی کے ہاتھ میں آگئی۔ یہاں تک کہ بے انتہا ردّ و قدح کے بعد سینٹ ونسینٹ ڈی پال اُٹھ کھڑا ہوا جس نے اپنے زور و قوت سے اس قسم کی پرورش گاہوں کے استحسان کو اصولاً و باضابطہ بھی منوا لیا۔ ان کارروائیوں کے اجرا کے وقت اُن کے جواز و عدم جواز پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مباحث رہے۔ ایک فریق یہ کہتا تھا کہ اس طرح کی سہولتیں بہم پہنچا دینے سے بدچلنی

بے عصمتی کو اور تحریک ہوتی ہے، دوسرا گروہ اُس کے جواب میں قتل انسانی کی معصیت شدیدہ کو پیش کرتا تھا۔ ان مباحث کی تفصیل بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ان کے ذکر سے ہمیں صرف دکھانا یہ ہے کہ مسیحیوں نے اس کے لئے کتنے سامان کئے تھے۔ اور خواہ اُن کی رائے غلط ہو یا صحیح، بہر حال اُنہوں نے نفس انسانی کی عظمت کا جو تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا، اور حقیر سے حقیر حیات انسانی کا خواہ وہ غلام کی ہو، یا بچہ کی ہو، یا سیاف کی ہو یا پھر کسی مفتوح وحشی کی ہو، جو احترام دلوں میں بٹھایا، وہاں تک قدماء کا طائر فکر بھی نہیں پہنچا تھا۔ چنانچہ آج دنیا کی مختلف جماعتوں اور قوموں میں نفس انسانی کا جو شرف و احترام مسلّم ہے، یہ اسی تعلیم مسیحیت کا پرتو ہے۔

اسقاط و طفل کشی کے انسداد میں مسیحیت نے جو کوششیں کیں اُن کا ذکر گزر چکا۔ ان پر مسیحیوں کا فخر بجا ہے، لیکن بعض مرتبہ وہ اس فخر کو مبالغہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ میرے نزدیک مسیحیت کا اصلی پُر فخر کارنامہ جس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں یہ ہے کہ اُس نے مناظر سیافی کا خاتمہ کر کے دنیا کے سامنے نفس انسانی کے احترام کا عملی نمونہ پیش کیا۔ درحقیقت، جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ مناظر خونریزی کس طرح رومی زندگی و رومی تمدن کے اجزاے غیر منفک بن گئے تھے، اور کس طرح بہتر سے بہتر باشندگان روما اس کے متعلق چشم پوشی سے کام لیتے تھے جب جا کر کلیسا کی اصلاح کی پوری اہمیت کھلتی ہے اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر حکماء مشرکین شاذونادر کبھی ان رسموں کے خلاف آواز بلند کرتے بھی تھے، تو محض فلسفیانہ حیثیت سے اور صرف اس قدر بتانے پر قانع ہو جاتے تھے کہ یہ تماشے اخلاق شکن، خلاف انسانیت و وحشیانہ ہیں بہ خلاف اس کے مسیحیوں نے اس کی روک تھام بالکل مذہبی پیرایہ میں کی۔ وہ صرف اسے غیر محمود کہنے پر قانع نہیں ہوئے، بلکہ اُنہوں نے اسے متعین طور پر قتل عمد کے درجہ میں رکھا جس کے لئے قاتل اور تماشائی دونوں روز حشر قابل مواخذہ ہوں گے۔ خیال کیجئے، تو یہ بہت بڑا فرق تھا۔

اس دستور کے انسداد کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ مشرک حکومت کے دَور آخر میں بڑی بڑی

عظیم الشان سباق گاہیں برابر تیار ہو رہی تہیں۔ بلکہ خود قسطنطین نے اپنے زمانہ تک بیسیوں وحشی قیدیوں کو جنگلی درندوں سے لڑنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ سب سے پہلے ۳۲۵ء میں نائسین کے پادریوں کے دار الشوریٰ کے اجلاس کے بعد مسیحی فرماں روا کے حکم سے قلمرو رومہ میں سیافی کی ممانعت کا فرمان جاری ہوا۔ اوّل اوّل اس حکم کا نفاذ صرف بیروت (شام) بلکہ شاید اُسکے صوبہ فنیقیہ تک محدود رہا، اور یہاں بھی اس پر عمل درآمد واجبی ہی واجبی ہوا۔ اور مغربی ممالک میں تو یہ تماشے کُھلم کُھلا جاری رہے۔ ۳۵۵ء میں قسطنطین نے خدام محل شاہی کو سب سیافوں کی صف میں داخل ہونے سے منع کیا۔ ۳۶۵ء میں ویلنٹینین نے یہ حکم نافذ کیا کہ کوئی مسیحی مجرم سیافی پر مجبور نہ کیا جائے۔ ہنوریس نے اُمراء کے غلاموں کو سیافی کا پیشہ اختیار کرنے کی ممانعت کی گو اس سے اصل مدعا یہ تہا کا سیافی کو روکنا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ اُمراء کے پاس مسلح رفقا نہ رہ سکیں۔ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ یہ دستور، کبھی سنئے دار السلطنت قسطنطنیہ میں نہیں داخل ہونے پایا۔ خاص شہر رومہ میں یہ رواج گو کم ہو چلا تھا، تاہم تا وقتیکہ قانون نے اس کا قطعی استیصال نہیں کر دیا، یہ رواج بالکل اُٹھا نہیں۔ قدیم مشرکانہ تمدن کا روشن ترین پہلو، مذہبی آزادی و رواداری اور تاریک ترین رخ یہی شوق سیافی تھا، لیکن افسوس سے کہنا پڑے گا کہ مسیحی حکومت نے آتے ہی روشن پہلو کو مٹایا، اور تاریک پہلو کو کچھ عرصہ تک برقرار رکھا، چنانچہ تھیوڈوسیس اعظم، جو بالکل پادریوں کے ہاتھ میں تھا، اور جس نے مذہبی رواداری کا خاتمہ کر دیا تھا، اُسے مشرکوں میں مقبولیت محض اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ اُس نے وحشی قیدیوں کو سیافی پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی قطعی طور پر معلوم ہے، کہ ۳۸۵ء و ۳۹۱ء میں بلکہ ہنوریس کے زمانہ میں بھی سیافی کی نمایشیں وقتاً فوقتاً ہوئی رہیں، اور قیدیوں کو اکھاڑہ میں اُتارنے کا دستور تو بہت بعد تک قایم رہا۔

لیکن اگرچہ خود دار الحکومت میں مناظر سیافی کا سدباب مسیحی حکومت کے ۸۰ سال تک نہیں ہوا، تاہم اس باب میں مسیحیت و مشرکیت کی جو تعلیمات تھیں، اُن کے درمیان زمین و آسمان

کافرق تھا۔ بت پرستوں کے بہتیرے سلاطین اور بڑے سے بڑے حکما میں سے (بجز جولین کی استثنائی مثال کے) کبھی کسی نے اس سے تعرض نہ کیا، برخلاف اس کے مسیحیوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے سیّافوں کو بتسمہ دینے سے انکار کر دیا تھا، تاوقتیکہ وہ اپنے اس پیشہ سے توبہ نہ کریں، اور جو شخص مسیحی ہو کر اس کا تماشہ دیکھنے جاتا، وہ گرجا میں حصول تبرکات سے محروم کر دیا جاتا۔ اُن کے مصنّفین و واعظین نے اس کے خلاف روز اوّل سے جہاد شروع کر دیا تھا، اور پروڈنشیس شاعر نے براہ راست شہنشاہ کو مخاطب کرکے اس دستور کے انسداد کے لئے التجا کی۔ مشرق میں یہ دستور شروع ہی سے کمزور رہا تھا، اور تھیوڈوسیس کے زمانہ میں بالکل بند ہو گیا اور اس کی جگہ گاڑی دوڑنے لے لی۔ مغرب میں اس دستور کی زندگی کی آخری تاریخ ۴۰۴ء تھا، اور جبکہ شہر رومہ میں ہنوریس کے عہد میں یہ تماشہ ایک بار ہو رہا تھا، کہ ایک ایشیائی راہب دفعتہً اکھاڑہ میں کود پڑا اور فریقین کو چھڑانا چاہا، اس پر خلقت اتنی برافروختہ ہوئی کہ اُس نے راہب پر پتھر برسانا شروع کئے اور اسی پتھراؤ میں وہ غریب شہید ہو گیا۔ لیکن اس کی شہادت سے بعد کو لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ دستور ہی مٹ گیا۔ درندوں سے مقابلہ اب بھی جاری رہا، خصوصاً مشرق میں۔ لیکن افلاس اور درندوں کی کمیابی سے رفتہ رفتہ یہ دستور بھی مٹ گیا اور اب اس کی جگہ کھیلوں اور "بازیوں" نے لی، جو گو حیوانات کے لئے سخت ظالمانہ تھے، تاہم انسان کو ان سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر ساتویں صدی کے خاتمہ پر یہ "بازیاں" بھی موقوف کر دی گئیں۔ اٹلی میں مصنوعی جنگ کا جو خونریز دستور تھا، اور جو قرون وسطیٰ میں برابر قایم رہا، اُس کی بنا بھی سیّافانہ اکھاڑہ کی روایات پر تھی۔

غرض سیّافی کا استیصال یقیناً ایک ایسا موضوع ہے، جس کا ذکر مسیحی اثرات کے ذیل میں، مورخ پورے فخر کے ساتھ کر سکتا ہے۔ مسیحیت نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اس قدر خونریزی کو مٹا دیا بلکہ لوگوں کے دلوں سے بیدردی، شقاوت و قساوت کو نکال کر انسانیت کا معیار نہایت بلند کر دیا، اور یہ ایسی بڑی کام یابی تھی، جس کی توقع بہ دادید رفتار واقعات نہ

مشرکانہ تمدن وشایستگی سے کی جاسکتی تھی، اور نہ مشرکانہ فلسفہ سے بلکہ اُس کی جڑ رومی سرزمین میں ایسی مضبوط ہوگئی تھی کہ اس زمانہ میں اگر شمال کے فاتحین اٹلی پر حاکم ہوجاتے، تو وہ بھی اس دستور کو اختیار کرلیتے، پھر یہ دستور یورپ میں برابر قرون وسطی میں قایم رہتا، اور اس طرح انسانیت دشمنی کی ترقی ایک مدت غیر محدود تک رکی ہوئی رہتی۔ یہ صرف مسیحیت ہی میں قوت تھی کہ اُس نے راستہ سے اس بھاری پتھر کو ہٹا دیا، اس کامیابی کا سہرا مسیحیت اور صرف مسیحیت کے سر ہے اکثر مشرک اُمراء ورؤسا اپنی وفات کے وقت بڑے بڑے ترکہ سیافوں کے لئے چھوڑ جاتے تھے، تاکہ اس سرمایہ سے اُن کی یادگار میں سیافی کے جشن منائے جائیں مسیحیت نے آکر یہ بتایا کہ ترکہ فقراء مساکین واہل حاجت کے لئے ہے، اور اس طرح ہی سیافی کے مٹانے میں بالواسطہ معین ہوئی اسی طرح دسمبر کا مہینہ جو ان ظالمانہ تماشوں کے لئے مخصوص تھا، اُس میں مسیحیت نے یہ کمال دانشمندی ایک دوسرا جشن، یعنی ولادت مسیح، رکھ دیا۔

مسیحیت نے حیات انسانی کے شرف واحترام کا جو اعلیٰ ترین تخیل پیش کیا تھا، اس پر بعض دفعہ مسیحی اس سختی سے عملدر آمد کرتے تھے کہ کبھی کبھی قومی آزادی وملکی قوانین سے ان کا تخیل بالکل ٹکرا جاتا تھا ان کا اصل الاصول یہ تھا کہ کسی مسیحی کو دوسرے کی جان لینے میں معین نہ ہونا چاہیئے، اور اس اصول نے مختلف شکلیں اختیار کی تھیں، مثلاً یہ کہ کسی عیسائی کو فوج میں نہ داخل ہونا چاہیئے یا یہ کہ جلادی کا پیشہ نہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یا پھر یہ کہ کسی شخص پر ایسا جرم نہ عاید کرنا چاہیئے جس کی سزا موت ہو۔ ان میں سے امر اول کی بابت کسی دوسری فصل میں ذکر آئیگا، البتہ امر دوم وسوم کی بابت یہاں دو لفظوں میں مختصراً بیان کئے دیتے ہیں، قتل خواہ وہ بالکل جائز وقانون کے حکم ہی سے کیوں نہو، ہمیشہ سے معیوب سمجھا گیا ہے، اور جلادی کا پیشہ ابتدا سے مذموم و ذلیل رہا ہے چنانچہ یونان وروما میں قانوناً جلادوں کو شہر کی چار دیواری سے باہر رہنے کا حکم تھا، اور روما میں انہیں شہر میں داخلہ کی ممانعت تھی۔ یہ خیال مسیحیت نے اپنی ابتدائی زندگی میں بالکل جذب کرلیا اور یہ حکم دیا کہ جو شخص اپنے ہاتھ خون میں رنگے گا، عام اس سے کہ وہ فرمانروا سے وقت ہی ہو،

بجسے حمایت حق میں تلوار کھینچنی پڑی ہو، جب تک کفارہ نہ دے لیگا، گرجا کے حصول تبرکات سے محروم رکھا جائیگا۔ ابتدائی تین صدیوں تک مسیحی ملکی وسیاسی مصالح سے مستغنی، اس خیال پر بالکل بجے رہے، لیکن چوتھی صدی میں جب کلیسا کو دنیوی اقتدار بھی حاصل ہو چلا، تو اس خیال میں لامحالہ ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اگرچہ لیکٹینٹیس اب تک تمام خونریزی کو ناجائز قرار دیتا رہا، تاہم یہ رائے بالاتفاق قرار پاگئی کہ پادریوں وراہبوں کے لئے کسی پر سزائے موت کا جرم عاید کرنا جائز نہیں۔ پادریوں کی استثنائی حیثیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ ملزموں کے شفیع و سفارش کنندہ بن بنکر مختلف درباروں اور عدالتوں میں جاتے تھے اور جب کبھی ان کے شہر یا قرب وجوار میں کسی جرم یا بغاوت کے انتقام میں سخت خونریزی کا احتمال ہوتا، تو اہل شہر اُن سے سفارشیں اٹھواتے اگلے زمانہ میں سلاطین کے مجسمہ اور مشرکوں کے معابد خاص حرمت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، یعنی جو ملزم اُن سے جاکر چمٹ جاتا، وہ قانون کی گرفت سے بچ جاتا، اب یہی حرمت گرجوں کو بھی حاصل ہوگئی۔ ایسٹر وغیرہ مسیحی ایام عید میں بھی ملزموں پر مقدمہ چلانا یا انہیں سزائے موت دینا ناجائز ہوگیا۔ اور روایت ہے کہ ملزموں کی بے گناہی و معصومیت کی شہادت میں بارہا معجزات صادر ہوتے گو کسی ملزم کے ثبوت جرم میں کبھی کوئی معجزہ نہیں سرزد ہوا۔

اس صورت حال سے جو اثرات پیدا ہوئے، اُنہوں نے بڑی وسعت حاصل کی، اور بہت دور دور تک پھیلے۔ ازانجملہ یہ کہ

(۱) عام اذہان میں رحم و درگزر کے تصور نے ایک خاص تقدس والوہیت کا مرتبہ حاصل کرلیا، اور حیات انسانی کے احترام میں روز بروز مبالغہ ہوتا گیا۔

(۲) پادری و اہل کلیسا، اپنی شدید تعدیوں کے زمانہ میں بھی خونریزی سے جھجکتے رہے۔ کفار وملاحدہ پر یہ اور ہر طرح کی سختیاں روا رکھتے تھے۔ جائدا د ضبط کرتے تھے، قید میں رکھتے تھے، جلاوطن کراتے تھے، حرّیت رائے کا بالکل سدباب کردیا تھا یہ سب کچھ تھا، لیکن

قتل کی سزا دینے میں بے حد تامل وپس وپیش کرتے تھے۔ چنانچہ خود سینٹ آگسٹاین، سینٹ ایمبروز، سینٹ مارٹن، جو اختلاف عقائد پر سخت سے سخت تشدد کو جائز رکھتے تھے، تاہم ان کو بھی کبھی سزائے قتل کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ جن لوگوں نے ایسا کیا، اُن پر اُنھوں نے سخت ملامت کی۔

(۳) ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جب پادریوں نے دیکھا کہ قتل وخونریزی کے بغیر کام نہیں چلتا، اور قتل جائز نہیں، تو لگے طرح طرح کی حیلہ تراشی، تاویل بازی کرنے۔ مثلاً ایک حکم یہ دیا کہ ملاحدہ کے خون کا قطرہ زمین پر بھی نہ گرنا چاہیئے، لہذا اُنہیں زندہ جلادینا چاہیئے! حیلہ تراشی کی یہ مثال دنیا کی تاریخ میں کچھ انوکھی نہیں۔ اس کی اور نظیریں بھی موجود ہیں، پلوٹارک نے لکھا ہی کہ قدیم زمانہ میں پاک کنواریوں پر جب بدچلنی کا جرم ثابت ہوتا تھا، تو چونکہ ان پر تلوار اُٹھانا منع ہے اس لئے زندہ دفن کردی جاتی تھیں۔ یا ایک اور فرقہ ہوا ہی جسکے نزدیک تلوار کھینچنا ناجائز تھا، لہذا وہ لوگ بدعقیدگی کے مجرموں کو لوہے کے گرزوں سے مارڈالتے تھے۔

قتل وخونریزی سے پادریوں کا اس زمانہ میں یہ تباعد، اگرچہ حیرت انگیز ہے، خصوصاً اس خیال سے کہ کچھ مدت کے بعد اُنھوں نے اپنے ہاتھ خوب ہی خون میں رنگے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس رحم ورافت، عفو ودرگزر کے زمانہ میں بھی ملک کے ضابطہ تعزیرات میں کچھ اصلاح نہ ہوئی قوانین مروجہ میں جو کچھ اصلاح ہوئی وہ رواقیت کے اثر سے مشرک مقننین کے زمانہ میں ہوئی، اور اس باب میں مسیحیت کا کوئی بھی کارنامہ وقیع نہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ تھیوڈوس وجسٹنین کے زمانہ میں ضابطہ تعزیرات پر نظر ثانی ہوئی۔ اور انہیں زیادہ منضبط بنایا گیا، لیکن معدلت ومساوات قانونی کے اصول اساسی سب ہیڈرین واسکندر سوریس کے عہد میں منقح ہوچکے تھے مسیحیوں نے اس میں کچھ اضافہ کردیا، وہ بھی بہت قلیل وغیراہم۔ درحقیقت فلسفہ رواقیت کے لئے یہ امر بس کرتا ہے کہ اُس نے جو کام چند سال میں انجام دیدیا مسیحیت اپنی صدیوں کے اقتدار وعروج کے باوجود بھی اس کی برابری نہ کرسکی۔ یہ سچ ہے، کہ قسطنطین نے اپنے زمانہ میں یہ قوانین نافذ

کئے کہ مجرموں کے چہرہ کو داغا نہ جائے، انہیں سیّافی کا پیشہ اختیار کرنے پر نہ مجبور کیا جائے اور
انہیں سولی نہ دی جائے (سولی کی سزا اس زمانہ میں سخت ذلیل و تحقیر آمیز خیال کی جاتی تھی) لیکن
اس نرمی کی کسر مسیحی حکمرانوں کی اُس سختی نے نکال لی تھی۔ جس کے ساتھ وہ طفل کشی، زنا، زنا بالجبر
وغیرہ کی سزائیں دیتے تھے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تھیوڈوسیس کے نظام قانون میں جو دفعہ
سب سے زیادہ قطعی طور پر کلیسا کے اثر سے رکھی گئی، وہ کوئی اصلاحی دفعہ نہیں، بلکہ وہ ہی جس کا
منشا یہ ہے کہ اہل کلیسا ایک مخصوص و محترم طائفہ عالیہ ہیں اور جو شخص کیتھولک عقاید سے ذرا بھی
منحرف ہے، وہ گردن زدنی اور مستحق صد ہزار تعزیر ہے۔

خیر۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ چوتھا اور سب سے آخری اور سب سے اہم نتیجہ، حیات بشری
کے اس تقدس کا یہ ہوا کہ خودکشی، انتہائی ملامت کی مورد قرار پائی۔ یہ ہم کہیں پہلے لکھ آئے
ہیں کہ مشرکوں کے یہاں جب کبھی خودکشی کے خلاف صدا بلند ہوئی ہے، تو حسب ذیل اسباب
اربعہ میں سے کسی کی بنا پر:-

(۱) فیثاغورث و فلاطون کا مذہبی استدلال کہ تمام انسان خدا کے سپاہی ہیں۔ پس اپنی جگہہ
کو بغیر حکم باری چھوڑ دینا گویا اس سے بغاوت کرنا ہے۔

(۲) ارسطو و یونانی واضعان قانون کا سیاسی استدلال کہ تمام انسان حکومت کے خدام ہوتے
ہیں۔ پس قتل نفس کے یہ معنی ہوئے ہیں کہ ہم نے اپنی خدمت اصلی سے منہ موڑ لیا۔

(۳) پلوٹارک کا نفسیاتی استدلال کہ خودکشی بزدلی کا نتیجہ ہے، اور اس لئے انسان کی فطرت
شجاعت کے شایان شان نہیں۔

(۴) اشراقیین جدید کا فلسفیانہ استدلال کہ ہر طرح کی حرکت افساد روح کا باعث ہوتی ہے اور
خودکشی بھی ایک حرکت ہے۔

قدماء کے استدلال کا خلاصہ تمام تر یہ تھا۔ ان میں سے آخرالذکر کی تو مسیحیت میں گنجایش ہی
نہیں نکل سکتی تھی۔ استدلال (۳) کی بنا انسان کی فطری مردانگی و شجاعت پر تھی اور یہ مسیحیت

کے اس تخیل سے ٹکرائی تھی جو اُس نے انسان کے انکسار و فروتنی سے متعلق قایم کیا تھا گو کہا یہ
بھی جاتا تھا کہ تحمل شداید اپنے تئیں ہلاک کر لینے سے زیادہ مردانگی کا مظہر ہے۔ رہا استدلال
(۲) سو وہ بھی ایک بڑی حد تک مسیحیت کے منافی تھا۔ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو راہبانہ زندگی
خاک میں مل جاتی تھی، حالانکہ اس زمانہ میں مسیحیت کی جان رہبانیت تھی۔ پھر اس کے معنی یہ بھی
تھے کہ انسان میں وطنیت پیدا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ اسے مسیحیت روا نہیں رکھ سکتی تھی
موجودہ حکماء اخلاق کے پاس خودکشی کی ممانعت میں بڑی مضبوط دلیل یہ ہے کہ اس سے نظام
خاندان کی برہمی کا اندیشہ ہے۔ لیکن اس زمانہ کے مسیحین و مشرکین دونوں اس اصول سے
ناآشنا تھے۔ مسیحی تو اس لئے کہ ان کے اخلاق و فلسفہ اخلاق کی بنیا دیکسر عالم آخرت کی جزا و سزا
پر تھی اور کسی دنیوی محرک کو اُن کے نظام اخلاق میں دخل نہ تھا اور مشرک اس لئے کہ وہ افسر
خاندان کو صرف حاکم سمجھتے تھے اور اُس کے ذمہ فرایض مطلق نہیں قرار دیتے تھے۔ اب صرف
فیثاغورث و فلاطون کا استدلال (۱) باقی رہا۔ یہ البتہ مسیحی معتقدات سے بالکل مل جل گیا
اپنی تکالیف میں خدا سے استعانت کرنا، مصائب میں اسی کی ذات کا بھروسہ رکھنا، یہ خیال ایسا
تھا جو مسیحی دماغ کو خاص طور پر پسند ہوا۔ خودکشی میں ایک بات یہ بھی ہے کہ گو شدت معصیت میں
اور معاصی اس سے بڑھ چڑھ کے ہوں تاہم خدا پر بے اعتمادی و بے اطمینانی جیسی اس فعل سے
ظاہر ہوتی ہے اور کسی سے نہیں ہوتی۔

اس عام محرک کے علاوہ اساطین مسیحیت نے اپنی تعلیمات میں ترغیب و ترہیب کے
چند اور عناصر کا بھی اضافہ کر دیا، جنہوں نے خودکشی کی طرف سے نفس بشری کو اور روک دیا،
اُنہوں نے ایک طرف تو یہ کیا کہ انسان کو خودکشی پر اُسی قدر مجرم قرار دیا جس قدر کہ کسی دوسرے
کے قتل پر۔ اور خودکشی کرنے والے شخص کی روح کو طرح طرح کے عذاب کی وعیدوں سے ڈرایا
اور دوسری طرف خدا پر اعتماد و اطمینان اور رضا و توکل کے جذبہ کو انتہائی قوت دی۔ آخرت
میں صابرین و شاکرین کو طرح طرح کے انعام کی چاٹ دلائی اور دنیوی تکالیف کو گناہوں کا کفارہ

بتایا۔ ان سب کا مجموعی اثر یہ پڑا کہ یاس و قنوط کی وہ کیفیت جو انسان کے آنکھوں میں دنیا تاریک کر دیتی ہے اور اُسے خود کشی پر آمادہ کر دیتی ہے، بڑے سے بڑے مصیبت زدہ شخص کے دل سے بھی مٹا دی۔ قدیم فلسفہ کی یہ کرامت تھی کہ اُس نے تکلیف کی مذمومیت و قباحت کو دلوں سے مٹا دیا تھا، لیکن مسیحیت کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے تکلیف کو انسان کے لئے خوشگوار بنا دیا۔

مگر مسیحیت کا یہ عام کلیہ بھی استثناء سے خالی نہ تھا۔ کلیسا نے خود کشی کو دو صورتوں میں جائز رکھا، یا کم از کم ان کے متعلق سکوت سے کام لیا۔ پہلی صورت تو شہداء سے متعلق تھی۔ اس عقیدہ کے جوش میں کہ شہادت فوراً تمام پچھلے گناہوں کو دھو دیتی ہے، بیخود ہو کر صدہا پرجوش مسیحی مشرک حکام کے سامنے دوڑ جاتے تھے اور ان سے التجا کر کر کے اپنے تئیں شہید کراتے تھے اور بعض بزرگان کلیسا نے اس طرز عمل کا استحسان کیا ہے۔ ایک صورت جواز خود کشی کی یہ ہوئی۔ دوسری صورت اس سے زیادہ اہم و بحث طلب یہ نکلی کہ دوشیزہ مسیحی لڑکیوں کی عصمت پر جب دھبہ آنے لگے تو کیا کرنا چاہیئے؟ بے عصمتی کو گوارا کرنا چاہیئے یا اپنی جان دیدینا چاہیئے؟ سینٹ پیلیمیا ایک پانزدہ سالہ لڑکی تھی جس کی تعریف میں سینٹ ایمبروز و سینٹ کریزوسٹم رطب اللسان ہیں اُسے ایک مرتبہ سپاہیوں نے پکڑ کر اپنی شہوت رانی کا آلہ بنانا چاہا اُس وقت اُس نے کہا کہ "میں اپنے کمرہ میں جا کر اچھی طرح پوشاک پہن لوں، تب آتی ہوں"۔ یہ کہکر وہ گئی اور مکان کی چھت سے اپنے تئیں نیچے گرا کر ہلاک کر ڈالا۔ اسی طرح انطیوخ میں ایک مسیحی خاتون ڈومینیا نامی رہتی تھی جس کی دو لڑکیاں نہایت حسین و نہایت باعصمت تھیں۔ وہ ڈایوکلیشن کے زمانہ تعدی میں گرفتار ہوئیں اور جس وقت انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ ان کی عصمت خطرہ میں ہے ان تینوں نے راستہ میں دریا میں گر کے جان دیدی۔ یا پھر اسی طرح ظالم و جابر میکزنیٹس، روم کے اسقف اعظم کی حسین بیوی پر عاشق ہو گیا اور جب اور سب تدبیریں ناکام رہیں تو زبردستی کرنا چاہی۔ خدام شاہی اُسے اس کے مکان سے اڑا لائے۔ اُس وقت اُس نے ایک علیحدہ کمرہ میں ایک منٹ کے جانے کی مہلت مانگی اور وہاں جا کر بہ کمال مردانگی اپنے سینہ میں خنجر

بھونک لیا۔ آج کل کے مناظرہ پسند پادری جو کچھ کہیں واقعہ یہ ہے کہ قدیم مورخین کلیسا ان حالات کو انتہائی مدح و ستایش کے ساتھ لکھتے ہیں۔

کلیسا کے ابتدائی دور میں کسی حد تک صریحی طور پر خودکشی کی اسی صورت کو جواز کا فتویٰ ملا تھا۔ چنانچہ سینٹ ایمبروز نے دبی زبان سے اور سینٹ جیروم نے کھلم کھلا اس کی مدح سرائی کی ہے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس مسئلہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی اس کا جواز مشتبہ ہونے لگا تاآنکہ سینٹ آگسٹاین نے اپنے مبسوط رسالہ میں یہ فیصلہ کر دیا کہ حفظ عصمت کے لئے جان دیدینا ہے تو بے شبہ بڑی ہمت و جوانمردی کا کام، تاہم اس سے اس کی مجرمانہ حیثیت زایل نہیں ہوجاتی۔ اس قول فیصل کو تقریباً سارے کیتھولک کلیسا نے تسلیم کرلیا اور اس پر اجماع ہوگیا کہ پلیجیا و ڈمینیا کے افعال کسی خاص الہام کی تعمیل میں تھے۔ غرض کلیسا کے دور ابتدائی میں اصولاً اگر خودکشی کی کوئی صورت جائز تھی تو وہ صرف یہی تھی اور اس کے سوا تمام صورتیں قطعاً ناجائز تھیں لیکن انسان بھی عجیب متناقض الخیال ہستی ہے۔ ایک طرف تو براہ راست و فوری خودکشی پر یہ لعنت ملامت تھی اور دوسری طرف اس طرز زندگی پر جو آہستہ آہستہ خودکشی کی طرف لیجاتی ہے چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہوتی تھی۔ سینٹ جیروم نے اس سلسلہ میں ایک نوعمر راہبہ بلیسلا کی عجیب داستان بیان کی ہے۔ یہ خاتون اُس جرم کی مرتکب ہوئی جسے چوتھی صدی عیسوی میں لوگ تعیش سے موسوم کرتے تھے یعنی اس نے اپنی شادی کرلی۔ مگر سات ہی مہینہ کے بعد بیوہ ہوگئی اور اس طرح بقول اہل کلیسا کے "دوشیزگی کے ثواب اور ازدواج کی لذت دونوں سے محروم ہوگئی"۔ اسی زمانہ میں بہ ایک بڑی اور بیماری نے اس میں مذہبیت کا غیر معمولی جوش پیدا کردیا اپنی عمر کے بیسویں سال ایک خانقاہ میں بیٹھ کر اُس نے راہبانہ زندگی اختیار کرلی اور مذہبیت میں اسے اسقدر غلو حاصل کیا کہ اب اسے جو کچھ رنج و صدمہ تھا، وہ شوہر کی وفات کا نہ تھا بلکہ اس امر کا تھا کہ اس کی دوشیزگی غارت ہوگئی۔ کثرت روزہ داری و فاقہ کشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ نوجوانی ہی میں زندگی ختم ہوگئی۔ اہل شہر کو جب اس کی موت کے اصلی سبب کی اطلاع ہوئی اور اس

کی ماں کا ناقابل برداشت صدمہ دیکھا تو اہل شہر سخت برہم و متاسف ہوئے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے جنازہ پر ہجوم کر کے چلانا شروع کر دیا کہ "مردود راہبوں کا گروہ یا شہر خالی کر دے یا اسے سنگسار یا غرق کر دیا جائے۔" یہ خیال عوام کا تھا مگر اہل کلیسا کا نہ تھا۔ وہ اس تدریجی و غیر محسوس خودکشی پر اظہار بیزاری کرنا کیسا اس سے اور خوش ہوتے تھے اور قرون اولیٰ و وسطیٰ کے راہبوں کی بابت جو روایات مشہور ہیں اگر ان کا عشر عشیر بھی صحیح مان لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بے شمار انسانوں نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگیوں کا یوں خاتمہ کر لیا تھا سینٹ فرانسس اسیسی جو اسی رہبانیت کا شہید ہے اس کی بابت یہ منقول ہے کہ اُس نے اپنی موت کے قریب اپنے لاغر جسم کی طرف دیکھ کر کہا کہ "میں نے حقوق العباد میں اپنے ہی جیسے بندے گدھے کے ساتھ ادائے حق میں کمی کی ہے۔" اس کے بعد اس پر حالت کشف طاری ہوئی جس میں اُس نے دیکھا کہ وہ شب کی نماز میں مشغول ہے اور ہاتفِ غیب اُس سے کہہ رہا ہے کہ "فرانسس دنیا میں کوئی گنہگار ایسا نہیں ہے جسے مسیح پر ایمان لے آنے کے بعد خدا نہ بخشے گا، البتہ وہ شخص جو اپنے تئیں استہلاک ریاضت میں گرفتار رکھتا ہے عذاب دائمی کا مستحق ہوگا۔" فرانسس جب چونکا تو اس نے کہا کہ یہ صدائے ربّانی نہ تھی صدائے شیطانی تھی۔

اس تدریجی خودکشی کو تو انسان کی تناقض خیالی نے جائز رکھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ کلیسا نے خودکشی کے صریحی طریقوں کا اپنے حدود کے اندر بالکل سدّباب کر دیا۔ لیکن بعض اہل اعتزال نے اسے جائز رکھا اور نہ صرف جائز رکھا بلکہ اس پر عملدرآمد بھی کرتے رہے۔ مثلاً چوتھی صدی میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس کے افراد جوق جوق مشرکوں کے معابد و مجالس میں جا جا کر قصداً ان کی توہین کرتے اور اس کی پاداش میں قتل پر قتل ہوتے چلے جاتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پہاڑوں پر چڑھ کر نیچے کودتے اور ان مرنے والوں کی تعداد اس قدر کثیر ہوتی کہ نشیب کی وادیاں خون سے سرخ ہو جاتیں۔ اس سے صدیوں بعد ایک فرقہ اور نکلا جس کا اصول یہ تھا کہ مہلک امراض میں گرفتار ہو کر یہ لوگ فاقہ کشی کر کر کے یا فصد کھُلا کھُلا کر

موت کے بلانے میں عجلت کرتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں یہود نے کیتھولک عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آکر جو خودکشی شروع کر دی اُن کا شمار سب سے زیادہ ہے۔ فرانس میں ۱۰۹۵ء میں ہزارہا یہود نے مسیحی عقوبتوں سے بچنے کے لئے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا۔ صرف بہ مقام یارک ایک موقع پر ۵۰۰ یہود خود اپنے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اسی طرح ۱۳۴۰ء میں بھی ایک محاصرہ کے موقع پر اُن کے خودکشوں کی تعداد اتنی ہی تھی۔ اس باب میں مشرکوں کا جو قدیم قانون تھا وہ تھیوڈوسیس و جسٹینین کے قانون میں بدستور قایم رہا۔ البتہ پانچویں صدی میں پادریوں کی کونسل نے یہ فیصلہ شایع کیا کہ خودکشی ایک شیطانی عمل ہے چھٹی صدی میں دوسری کونسل نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ خودکشی کرنے والا حرام موت مرتا ہے اس کی لاش پر نہ نماز جنازہ جائز ہے اور نہ اس کی قبر پر فاتحہ خوانی۔ یہ اور اسی طرح کے اور فیصلے جو متعدد کونسلیں یکے بعد دیگرے صادر کرتی ہیں بالآخر شارلمین اور وحشی فاتحین کے ضابطہ تعزیرات کا جزو بن گئے۔ سینٹ لوئیس نے یہ بات نکالی کہ حرام موت مرنے والے کی ساری املاک و جایداد سرکار میں ضبط ہونا چاہئے۔ رفتہ رفتہ ایسے شخص کی نعش کی بے حرمتی ہونے لگی۔ کہیں لوگ اُسے گلی گلی گھسیٹتے پھرتے تھے، کہیں اُسے اُلٹا لٹکا دیتے تھے، کہیں اُسے مزبلہ بول و براز میں ڈال دیتے تھے اور کہیں اس میں آگ لگا دیتی تھی۔

ان بیہودہ و نفرت انگیز طریقوں پر زور دینے کا اور خصوصاً اس ناانصافی کا کہ مرنے والے کے ورثا ربے قصور جائداد سے محروم کر دیے جاتے تھے، لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارہویں صدی میں ردعمل کا آغاز زوروں سے ہوا۔ خودکشی کی اخلاقی حیثیت سے ایک معصیت کبیرہ ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں لیکن میرے نزدیک یہ ایسا جرم نہیں جس میں سرکار کی مداخلت جائز ہو خصوصاً وہ حکومتیں جو اپنی رعایا کو اس کی پوری آزادی دیے ہوئے ہیں کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر جس ملک میں چاہیں جاکر آباد ہو جائیں، کیا حق رکھتی ہیں کسی شخص کو ترک دنیا سے روکنے کا؟ بایں ہمہ میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں کہ قرون وسطیٰ کے قوانین مذکورہ بالا نفرت انگیز ہونے کے ساتھ ناکام بھی رہے۔ ناکام وہ ہرگز نہیں رہے۔ خودکشی کے مرتکب عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عقل ضعیف

اور متخیلہ قوی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو قابو میں رکھنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں کہ ان پر دہشت وہیبت طاری کردی جائے۔ باقی کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوب سوچ سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کو بھی اس سے باز رکھنے کا یہ نہایت پُر اثر طریقہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے اعقاب وپس ماندگان کو ہر طرح کی ذلت اور مالی وجسمانی نقصانات کا سامنا کرنا ہوگا۔ قانون کے نفاذ کے جاری رہنے سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خودکشیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا تاہم اس میں شبہ نہیں کہ کیتھولک دائرہ کے اندر اس کا ارتکاب صدیوں تک شاذ ونادر الوقوع رہا۔ البتہ اسپین میں گوتھک سلطنت کے آخری وپُر آشوب زمانہ میں اس کا زور رہا وعلی ہذا انگلستان میں ساتویں وچودھویں صدی میں جب وبا طاعون پھیلی ہے یا پھر اسی طرح جب ہلڈبیرانڈ نے ہزارہا بیویوں کو ان کے راہب شوہروں سے علیحدہ کردیا ہے تو ان میں سے بہی بہتوں نے اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ختم کر ڈالا۔ طبقۂ اناث میں خودکشی اور بھی شاذ تھی۔ بلکہ ایک فاضل مورخ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بجز اندلس کی ایک نوعمر خاتون کے جو اپنے شوہر سے عرصہ دراز سے جدا تھی اور جو اپنی طبیعت کو اب قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی اور اس خیال سے خودکشی کرلی تھی، کئی صدیوں تک اور کوئی مثال خودکشی کی نہیں ملتی۔ خانقاہوں میں خودکشی کا ایک محرک یہ بھی ہوتا تھا کہ اکثر راہب جب یہ دیکھتے تھے کہ لذائذ دنیوی اب اُن کے ترک کئے نہیں ترک ہوتے ہیں یا جذبات وشہوات پر انہیں قابو نہیں حاصل ہوتا یا وساوس شیطانی سے نجات نہیں ملتی تو ان سب حالتوں میں مایوسی کا علاج وہ خودکشی ہی کو قرار دیتے تھے۔ بعض مثالیں گو وہ اب شاذ ہیں اس کی بھی ہیں کہ محبت میں ناکامی یا شدت رہبانیت کا پیدا کردہ اختلال حواس بھی خودکشی کا باعث ہوا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا بالکل قرین صحت ہے کہ خانقاہوں نے مایوسوں اور شکستہ خاطروں کو اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دے کر زیادہ جانیں بچائیں، بہ مقابلہ اس کے کہ لیں۔ کلیسا کی اس تعلیم کی اس کی دیگر تعلیمات کی طرح، اسلام نے بھی تقلید کی، اور نہ صرف تقلید کی بلکہ اس میں خاص غلو سے کام لیا۔ چنانچہ خودکشی کی صریح ممانعت کا حکم انجیل میں نہیں بلکہ

قرآن میں ہے اور مسیحیت نے جو توکل و رضا کی تعلیم دی تھی اُسے اسلام نے مبالغہ کر کے جبریت و تقدیر پرستی تک پہنچا دیا اسلام و مسیحیت کی متحدہ کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ متمدن و شایستہ دنیا میں صدیوں تک کسی نے خودکشی کا نام بھی نہیں سنا جب ہم مسیحیت کے اس کارنامہ کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ساتھ ہی یہ یاد کرتے ہیں کہ یونان و رومہ کی دنیاے متمدن میں یہ رواج کس قدر عام تھا، اور ڈنمارک سے لیکر اسپین تک کے غیر متمدن قبایل میں یہ وبا کس قدر عالمگیر تھی تو بے شبہ ہم اس کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسیحیت کا اثر تاریخ اخلاق پر کیسا عمیق، وسیع و مفید پڑا ہے۔

اس افسوسناک رواج کی تاریخ کے آخری ابواب ابھی ذکر کرنے سے رہ گئے۔ اصلاح کنیسہ کی تحریک سے یورپ میں خودکشیوں کی تعداد میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ کیونکہ اب کیتھولک و پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں میں وہ مذہبی جذبات پوری طرح پیدا ہو گئے تھے جو خودکشی کے موانع ثابت ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس کا زور یورپ میں نہیں بلکہ امریکا میں تھا جو ابھی ابھی نیا دریافت ہوا تھا اسپین والوں نے یہاں کے باشندوں کو فتح کر کے یہ کیا کہ ان کو اپنا غلام بنانے لگے اور اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑنا شروع کیے۔ اس پر مفتوحوں نے بھی انتہاے مظلومیت میں خودکشی کا طریقہ اختیار کیا کہ اس سے کم از کم وہ عقوبتوں سے تو بچ جائیں گے۔ ہزارہا امریکی باشندے اس طرح خود اپنے ملک الموت ثابت ہوئے تا آنکہ اسپین والوں نے اپنی چالاکی سے انہیں یہ یقین دلایا کہ انہیں مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہیں ملے گی کیونکہ یہی اسپینی آقا آسمان پر بھی موجود ہونگے اور وہاں بھی انہیں غلامی پر مجبور کریں گے۔ یورپ میں اس زمانہ میں اگر یہ دستور کسی فرقہ میں رائج تھا تو جادوگرنیوں میں۔ یہ بدنصیب لاغر اندام و ضعیف العقل عورتیں جن کی ساری عمر عموماً تکالیف و مصائب میں گزرتی اور جنہیں نہ آخرت میں کسی چین و آرام کی توقع ہوتی اکثر ہجوم یاس و قنوط میں اپنے تئیں ہلاک کر ڈالتیں۔ ایک فرنچ جج کا بیان ہے کہ صرف اس کے علم میں ایک سال کے اندر پندرہ ساحرہ عورتوں نے خودکشی کی۔ اس طرح کے واقعات کے اسباب عموماً خوف و دہشت و اختلال حواس ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوا کیا ہے کہ جنون

خودکشی کی وبا پھوٹی ہے حال میں مارسیلز و نیونس کی عورتوں میں اور قدیم زمانہ میں فلسطین کی عورتوں میں دفعتہً اس وبا کا پھوٹنا اسی کی مثالیں ہیں - اسی طرح پندرہویں صدی کے خاتمہ سے لیکر سترہویں صدی کے خاتمہ تک بعض اضلاع میں یہ جنون جاری رہا کہ ہزارہا آدمی سمندر کی طرف جوق جوق جاتے تھے اور دور سے اُس کی لہریں دیکھکر دفعتہً بے اختیار اس کی طرف فرط مسرت سے گاتے ہوئے دوڑتے اور جاکر اُس میں کود پڑتے - خیر ان واقعات کا ذکر تو ہم نے یونہی بہ سبیل تذکرہ کردیا ان کی اصلی جگہہ تاریخ امراض دماغی ہے - تاریخ اخلاق نہیں - یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ بعض موثرات ایسے ہی جمع ہوگئے - جنھوں نے اس مجنونانہ خودکشی کی نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ خودکشی کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کردیا - یونانی و رومی لٹریچر کی طرف جو تازہ توجہ ہوئی اُس نے اس مبحث کو خصوصیت کے ساتھہ منظر عام پر لاکھڑا کیا - اب کیتھولک مونٹیں اور اُن کے بعد گروشئیس و پفینڈورف کے اتباع نے یہ کہنا شروع کردیا کہ خودکشی بعض صورتوں میں جائز ہے مثلاً گناہ یا فحش سے بچنے کے لئے، اپنے دوست کی جان بچانے کے لئے یا اس قیدی کو جو جانتا ہو کہ اُسے سخت عقوبتوں سے ہلاک کیا جائے گا - یا پھر اُس قیدی کے لئے جو جانتا ہے کہ جو سرنگ وہ اڑا رہا ہے اُس میں خود اُس کی جان جانا یقینی ہے - اس زمانہ کی خودکشیوں میں مشرکانہ خودکشیوں کے اثر کی جھلک صاف نظر آرہی ہے - چنانچہ فلپ اسٹروزی پر جب الگزنڈر اول کے قتل کا جرم عاید ہوا ہے تو اس خوف سے کہ کہیں تشدد و عقوبت کی تاب نہ لاکر وہ اپنے رفقا کا نام ظاہر کردے - اُس نے خودکشی کرلی اور ایک خط اس مضمون کا لکھہ کر چھوڑ گیا کہ "میں اپنی روح خدا کے سپرد کرتا ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر میرا مرتبہ اور زیادہ بلند نہ ہو تو کم از کم وہ درجہ تو ضرور عطا ہو جو کیٹو و دیگر قدیم خودکشوں کو عطا ہوا تھا" یہ حال تو عام یورپ کا تھا - خود انگلستان میں یہ رواج سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی کے ابتدا میں نسبتاً اور زیادہ عام تھا بلکہ اس کی تائید میں رسالہ تک لکھے گئے - سر ٹامس مور نے اپنی کتاب میں جہاں ایک بے عیب جمہوریت کا مرقع کھینچا ہے، وہاں ایک منظر یہ دکھایا ہے کہ لا علاج مریضوں کو حکام دنیا دری بہ خوشی خودکشی

کی اجازت دے رہے ہیں البتہ جو لوگ بغیر حصول اجازت اپنے تئیں ہلاک کر رہے ہیں
اُن کی تجہیز و تکفین ناجائز ہے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ڈون نے بھی جو سینٹ پال کے گرجا کے
متولی تھے، ایک عالمانہ مگر مغلق رسالہ خودکشی کی تائید میں لکھا اور مرتے وقت اپنے بیٹے سے
یہ وصیت کی کہ اسے بجنسہٖ اسی حالت پر رہنے دیا جائے اور نہ شایع کیا جائے نہ ضایع
کیا جائے۔ لیکن بیٹے نے باپ کی وصیت کے ایک ٹکڑے کو نہ مانا اور ۱۶۴۴ء میں اُسے
شایع کر دیا۔ دو تین انگریز خودکشوں نے بھی اپنے پیچھے اپنے فعل کی حمایت میں رسالے چھوڑے
علیٰ ہذا ایک باشندہ سویڈن نے جس کا نام روبک تھا ۱۷۳۵ء میں اپنے تئیں غرق کر کے
جان دی اور آیندہ سال خودکشی کی تائید میں اس کا رسالہ شایع ہوا جسے بہت مقبولیت
حاصل ہوئی لیکن ان سب سے بڑھ چڑھ کر اور سب سے زیادہ موثر فرنچ حکما انقلابیین کی
تحریریں ثابت ہوئیں۔ مانٹین اصولاً تو خودکشی کو جائز نہیں ٹھیراتا، البتہ قدیم خودکشوں کی مدح
وستایش میں نہایت رطب اللسان نظر آتا ہے۔ مانٹسکیو نے اپنی نوعمری میں ایک رسالہ
تصنیف کیا جس میں اس کی پرزور حمایت کی۔ روسو کا طرز عمل اس باب میں درحقیقت عجیب
وغریب رہا ہے اُس نے دو رسالہ اس موضوع پر لکھے ہیں پہلے میں شد و مد سے خودکشی کی تائید
کی ہے اور دوسرے میں خود ہی اپنے سابقہ دلائل کی تردید کی ہے، اُنہیں پُرفریب بتایا ہے
اس عمل کو فرض شناسی کے نقطہ خیال سے انتہائی غداری و خودغرضی کا نمونہ بتایا ہے اور
جو لوگ اس کی طرف میلان رکھتے ہیں انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ رفاہ عام کے کسی کام میں
اپنی طبیعت کو مشغول کرلیں۔ والٹیر اپنے بہترین کلام میں مخصوص حالات میں اسے جائز سمجھتا
ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ملاحدہ میں بہت مقبول ہوا اور ہولبک و ڈی لینڈس اس کی تائید پر زور و
شور سے کمربستہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ کچھ تو انحطاط مذہبیت کے اثر سے کچھ طبایع میں عموماً نرمی و
لینت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر کچھ اس باعث بھی کہ لوگوں کو اب قانونی مداخلت کے صحیح
حدود نظر آنے لگے تھے خودکشی کے خلاف جو سخت قوانین نافذ تھے ان کی مخالفت میں ردعمل

شروع ہوا گر دشنیس نے ان کی تائید کی تھی۔ ٹانٹیسکو نے ان کی پُرزور تردید کی گو آخر میں ان کا یہ جوش کسی قدر مدہم ہوگیا تھا۔ بیکاریا نے جسے جماعت حامیان ردّعمل کا اصلی نمایندہ کہنا چاہئے۔ ان قوانین کی دو باتوں کی بنا پر مخالفت کی ایک تو اس لئے کہ یہ بے قصور اعقاب و پس ماندگان کے حق میں نامنصفانہ ہیں، دوسرے اس لئے کہ جو شخص خودکشی کا تہیہ کر چکتا ہے یہ اُسے اس قصد سے باز رکھنے کے لئے بالکل ناکافی ہوتے ہیں یہ جماعت فوراً کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ ہم پاتے ہیں کہ ۱۷۴۹ء تک میں جبکہ یہ جماعت اپنے شباب پر تھی خاص پیرس کی گلیوں میں ایک خودکش بوریٹر کی لاش بہ کمال بے حرمتی گھسیٹی گئی۔ اور پرانے قوانین برابر جاری رہے تاآنکہ ۱۷۸۹ء میں انقلاب عظیم برپا ہوا جس نے ان قوانین کو منسوخ کردیا اور جس نے جہاں رعایا کو اور ہر قسم کی آزادی دلائی وہاں اسے حرّیت موت بھی عطا کی۔ انقلاب کے زمانہ میں جہاں اور ہر شے میں ہیجان و تلاطم برپا ہوگیا وہاں خودکشی کرنے والوں کی تعداد بھی کئی گنی بڑھ گئی اور جوں جوں اس عام طوفان میں سکون پیدا ہوتا گیا خودکشیوں کی رفتار بھی اپنے معمولی درجہ پر آگئی لیکن وہ قوانین جو ایک مرتبہ منسوخ ہوگئے تھے پھر دوبارہ نافذ نہ ہوسکے۔ چنانچہ فرانس میں اب تک اس بارہ میں کوئی قانون نہیں۔ دوسرے ممالک میں جہاں ایسے قوانین ہیں اُن کا مقصد ہی محض اس قدر ہے کہ حرام موت مرنے والے کی لاش پر مذہبی مراسم نہ ادا کئے جائیں۔ خود انگلستان میں لاش کی بے حرمتی و تذلیل کے قوانین جارج چہارم کے عہد میں منسوخ ہوئے۔ لیکن یہ ظالمانہ دفعہ اب تک یہاں کے قانون میں درج ہے کہ خودکشی کرنے والے کی ساری جائداد سرکار میں ضبط ہوجائے گی۔ گو یہ ضرور ہے کہ جمہور کا رُجحان عام اس قانون پر عمل درآمد بالکل نہیں ہونے دیتا۔

مسیحی دنیا کے احساس عام نے البتہ اس نقطۂ نظر کا کسی قدر کفارہ کردیا ہے جس سے معلّمین مسیحیت اس فعل کو دیکھتے تھے، گو اسی کے ساتھ اُس نے قدیم سختیوں کو نرم کردیا ہے اور قدیم طرز استدلال کو متروک کردیا ہے۔ اس میدان میں ایک خاص کارنامہ میڈم ڈی اسٹیل

کا ہے۔ اس فرنچ ادیبہ نے اپنی ایک ابتدائی تصنیف متعلق بہ جذبات میں خودکشی کے فعل کو سراہا تھا۔ لیکن آگے چلکر اس نے اس خاص موضوع پر ایک نہایت فلسفیانہ سنجیدہ و عمیق رسالہ لکھا جس نے انقلاب کی پیدا کردہ تخریب اخلاقی کی ایک تعمیری شکل پیدا کردی۔ اس نے ان تمام قدیم مسلّمات کو ترک کردیا کہ خودکشی ایک طرح کا قتل عمد ہے یا یہ کہ یہ اُم الجرایم ہے یا یہ کہ نامردی و بزدلی کی دلیل ہے۔ اُس نے مذہبی تخویف و ترہیب اور عالم آخرت کی وعیدوں سے بھی بالکل قطع نظر کرکے یہ بتایا ہے کہ ایک با اخلاق شخص کو کن شرایط کا جامع ہونا چاہیئے۔ اور یہ شرایط کیونکر اُسے خودکشی سے مانع ثابت ہونگے۔ اُس نے نہایت موثر و دل نشین پیرایہ میں یہ دکھایا ہے کہ انسان جن چیزوں کو مصائب و آلام سمجھتا ہے وہ درحقیقت اس کی اصلاح سیرت و تزکیۂ اخلاق میں نہایت معین ہوتے ہیں نیز یہ کہ تسلیم و رضا کی خو ڈالنا اور شدائد پر تحمل و صبر کرنا انسان کا بزرگ ترین فرض اور لازمۂ اصلاح اخلاق ہے۔ اس کے بعد وہ تفصیل کے ساتھ انجیل کی تعلیمات پر نظر کرکے بتاتی ہے کہ انسان کی عظمت و شرافت کا اصلی معیار اس کی عدم خودغرضی اور دوسروں کی بہی خواہی ہے۔ شہادت و خودکشی میں موازنہ کرکے وہ دکھاتی ہے کہ اول الذکر نام ہی فرض کی قربان گاہ پر جان دینے کا اور آخرالذکر کہتے ہیں حالات غیر مساعد کے مقابلہ سے اُکتا کر جان سے گزر جانے کو اور اس بنا پر وہ کیٹو کی خودکشی کو خودکشی کے مخالفین و موافقین دونوں کے علی الرغم شہادت سے تعبیر کرتی ہے کہ اس سے مقصود دوسروں کی بھلائی تھی۔ پس ایک نیک با اخلاق و پاکباز شخص کا مطمح نظر دوسروں کی نفع رسانی ہونا چاہیئے، اسی غرض کے لئے اُسے زندہ رہنا چاہیئے اس مقصد کے پیچھے اُسے اپنی ہر طرح کی لذّات و مسرات میں ایثار سے کام لینا چاہیئے اور اسی خاطر اُسے زندگی کے بار کو برداشت کرتے رہنا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس طرح کے جذبات مسیحیت کی وساطت سے یوروپین معاشرت کے خمیر میں داخل ہوگئے ہیں اور ہمارے زمانہ میں خودکشی تمام تر نتیجہ رہ گئی ہے یا تو جنون کا یا اور ایسے دماغی امراض

کا جن سے انسان کا توازن ذہنی قایم نہیں رہتا اور یا پھر یاس و قنوط کے اُس ہجوم کا جس
میں اُمید بالکل رخصت ہو جاتی ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر میرے نزدیک اُن لوگوں کی
مسرت زیادہ حق بجانب نہیں جو واقعات خودکشی کی کمی پر مسرور ہو رہے ہیں کیونکہ اعداد کی
شہادت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جو اقوام علمی و تمدنی حیثیت
سے جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں اسی نسبت سے اُن میں خودکشیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ ایک
آدھ جگہ شدید مذہبیت نے اسے ذرا دبائے رکھا ہے لیکن مختلف ممالک، مختلف اقوام،
مختلف ازمنہ اور ایک ملک کے مختلف ضلعوں اور ایک ہی ضلع کے شہر و دیہات کی حالات
کے موازنہ سے اس کلیہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کے اسباب میرے نزدیک
متعدد ہیں۔ مثلاً یہ کہ

(۱) دماغی مشاغل عموماً جنون و امراض دماغی کی پیدایش میں معین ہوتے ہیں۔

(۲) متمدن ملکوں میں خودکشی کے ہر واقعہ کو جو شہرت دیجاتی ہے۔ اس سے ضعیف الدماغ افراد میں خواہ مخواہ ریس اور تقلید کی تحریک ہوتی ہے۔

(۳) متمدن ممالک میں جس طرح دولت و ثروت کی فراوانی ہوتی ہے۔ اسی طرح افلاس و فلاکت کی بھی شدت ہوتی ہے۔ تجارتی کشمکش، کاروباری مقابلہ و مسابقہ جس طرح دفعۃً پست کو بلند کرتا ہے۔ اُسی طرح یک بیک بلند کو پست بھی کر دیتا ہے۔

(۴) پہلے جو چیزیں تکلف و آرایش میں شامل ہوتی ہیں، تمدن انھیں ضروریات میں داخل کر دیتا ہے اور اس لئے انسان اُن کے فقدان کا صدمہ دل سے محسوس کرتا ہے۔

(۵) مختلف سہولتیں اور نزاکتیں پیدا ہو جانے سے متمدن قوم کا ہر فرد ایسی ایسی خیالی و فرضی تکالیف کا شکار رہتا ہے جن کی طرف غیر متمدن افراد کا وہم و گمان بھی نہیں جاتا۔

(۶) مذہبی بے اعتنائی، تشکیک و دہریت کے پھیل جانے سے دل سے وہ دہشت مٹ جاتی ہے جو خودکشی کی بڑی روک رہتی ہے۔

(۷) رشک و مسابقت ترقّی و حریّت اور عدم قناعت کے جذبات جو لوازم تمدن ہیں رضا و تسلیم کے دشمن ہیں اور اس لئے قدرتی طور پر خودکشی کی تحریک میں معین ہوتے ہیں۔

فصل (۳)

مسیحیّت کا دوسرا سبق: اخوت انسانی

مسیحیت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے حیات بشری کا احترام قایم کیا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ نوع انسان میں مساوات و اخوت پھیلائی۔ پہلے کا ذکر پچھلی فصل میں گزر چکا دوسرے کا بیان اب کرتے ہیں اور اس سلسلہ کا آغاز عنوان غلامی سے کرتے ہیں۔

مشرکوں کے زمانہ میں غلاموں کی جو حالت تھی اُس سے ناظرین روشناس ہو چکے ہیں مختصر یہ کہ غلامی اس وقت پوری طرح جائز تھی گو سینکا و دیگر حکما ء اخلاق نے شد و مد سے مساوات انسانی کی تعلیم دی تھی اور یہ آواز بلند کہا تھا کہ آقا و غلام کی تفریق محض سطحی و غیر حقیقی ہے۔ اور آقا کو غلام کے ساتھ پوری انسانیت سے پیش آتے رہنا چاہیئے یہ تو نظری تلقین تھی، عملی زندگی میں ظلم و شقاوت اور رحم و راحت دونوں کی کافی نظیریں ملتی ہیں۔ مظالم کے انسداد کے لئے ہیڈرین، انطونیوں، اور الگزنڈر سیورس کے زمانہ میں قوانین پاس ہوئے تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ آقا کو غلام کی جان پر کوئی اختیار نہیں اور غلام کشی اسی قدر قابل نفرت ہے جتنا کہ قتل عمد ہوتا ہے۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ مقنن پارٹی نے اس میں یہ شاخ نکال کے کہ جرم قتل عمد کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہلاکت کی نیت بھی ہو اور اس لئے غلام اگر سزا پانے کے دو چار روز بعد مرے تو مالک سے باز پرس نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کی نیت ہلاکت کی نہیں ثابت ہوتی۔ آقاؤں کو بڑی آزادی دے دی تھی، لیکن اس آزادی کی تحدید اُن قوانین سے ہو گئی تھی جن کا منشا غلاموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید اور خانگی زندانوں کی ممانعت تھی۔

قانونی حیثیت سے اس باب میں قسطنطین کے قبول مسیحیت سے دو سو سال تک رفتار اصلاح بہت ہی سست رہی مسیحی فرماں رواؤں نے دو مرتبہ یعنی ۳۱۹ء و ۳۲۶ء میں اس طرف توجہ کی لیکن قدما، جو کچہہ کہہ گئے تھے، اُس سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے قوانین کا خلاصہ یہ تہا کہ اگر آقا فلاں فلاں طریقہ پر تعذیب کرے اور اُس میں غلام مرجائے تو آقا پر قتل عمد کا جرم عاید ہوتا ہے لیکن اگر سزادہی کا مقصد محض تادیب وتنبیہ ہو اور تعزیر معمولی قسم کی ہو جس سے غلام مرجائے تو اس میں آقا بالکل بے قصور ہے اور اس پر کسی طرح کا جرم نہیں عاید ہوتا۔

بعض شارحین اس قانون کا یہ منشا سمجھتے ہیں کہ صرف مناسب وتادیبی سزاؤں کی اجازت تہی مثلاً سزاے تازیانہ، یا سزاے قید، لیکن میرے نزدیک اس قانون کی یہ تعبیر صحیح نہیں درحقیقت اس میں تاوقتیکہ غلام ہلاک نہ ہوجائے کسی طریقۂ تعذیب وعقوبت کی ممانعت نہ تھی اور نہ آقا پر کسی طرح کی گرفت تہی۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کو یہودیوں کے اس قانون سے پورا توارد وتوافق حاصل ہے کہ غلام اگر آقا کی تعذیب سے فوراً نہ مرے بلکہ دو ایک دن کے وقفہ کے بعد مرے تو آقا سے کسی طرح کا مواخذہ نہیں ہوسکتا۔

غلامی کا دستور جس زمانہ میں بت پرستی سے منتقل ہوکر مسیحیت میں آیا ہے اس میں یہ دو نقائص انتہا درجہ کے شدید تھے، ایک یہ کہ غلاموں کے ازدواج کا کوئی قانونی جواز نہ تھا، دوسرے یہ کہ آقا کو اب تک تعذیب وعقوبت کا پورا حق حاصل تہا جسٹینین سے قبل مسیحی سلاطین نے ان نقائص کے دُور کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی اور زناکاری کی روک تھام کے لئے جو کارروائیاں جاری تہیں غلام ان سے اس بنا پر محروم رکھے گئے کہ "ان کی نجاست انہیں حدود قانون کے اندر لانے کی روادار نہیں ہوسکتی" البتہ ایک قانون کی رو سے غلاموں کو سولی دینے اور قسطنطین کے ایک رحمانہ قانون کی مطابق اُن کے اہل خاندان کے یکجا نہ رکھنے کا دستور اُٹھہ گیا تہا۔ ایک اور قانون ان سے زیادہ اہم یہ منظور ہوا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ایک کار ثواب ہے اور اتوار کے روز گرجا میں یہ رسم ادا کی جاسکتی ہے۔ بعض احکام ایسے

بھی جاری کیے گئے جن کی بنا پر یہودی آقاؤں کے مسیحی غلاموں کو آزادی حاصل ہو گئی اور دو چار بار غلاموں کو بطور رشوت کے آزادی دی گئی تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے جرائم کی مخبری کریں۔ غلاموں اور آزادوں کے درمیان ازدواج قطعاً ممنوع تھا۔ اور اگر کسی آزاد عورت اور غلام سے آشنائی پائی جاتی تو عورت قتل کر ڈالی جاتی اور غلام زندہ جلا دیا جاتا مشرکانہ قوانین میں عورت کا مرتبہ غلاموں کے مساوی تھا اور غلامان مفرورہ کے لئے بڑی سخت سزائیں تھیں۔

مسیحی قانون نے بت پرستوں کے قانون پر شروع شروع کچھ اصلاح ضرور کی لیکن یہ ایسی اصلاح ایسی نہ تھی جیسی بعض متاخرین مسیحی مصنفین مبالغہ آمیزی سے بیان کرتے ہیں۔ مسیحیت نے اپنے وجود کے دو سو سال بعد تک جو کچھ اصلاحیں کیں اُن کا ماحصل یہ تھا کہ تعذیب وعقوبت میں کسی قدر نرمی کر دی گئی اور غلاموں کو آزادی دلانے میں کچھ سہولتیں پیدا کر دی گئیں۔ لیکن انہیں کے پہلو بہ پہلو اس باب میں بہت سخت قوانین نافذ کر دیے گئے کہ کوئی غلام اپنے آقا کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکے۔ بلکہ گریشین کے زمانہ میں تو یہ قانون پاس ہو گیا کہ جو غلام بجز اسکی غداری و بغاوت کے اور کسی قسم کا استغاثہ اپنے آقا کے خلاف عدالت میں لائیگا وہ بلا اس استغاثہ کی تحقیقات کے زندہ جلا دیا جاوے گا۔

یہ حالت دو صدیوں تک رہی۔ اس کے بعد جسٹینین کے زمانہ میں البتہ نئے اور اہم قوانین پاس ہوئے اور یہ بے شبہ اصلاحات سے صحیح طور پر موسوم کئے جا سکتے ہیں اس کی اصلاحات تین عنوانات کے تحت میں آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ غلاموں کو آزاد کرنے میں جتنی رکاوٹیں تھیں اُس نے انہیں دُور کر دیا۔ بلکہ لوگوں کو اس کار ثواب کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا اور کلیسا کو اس باب میں خاص اختیارات دیے۔ دوسرے یہ کہ آزاد شدہ غلاموں کو پورے وہی حقوق دیدیے جو معمولاً آزاد شہریوں کو حاصل تھے یہ درحقیقت بہت بڑی اصلاح تھی۔ اس کے بموجب یہ ایک معزز خاتون کے لئے بالکل جائز ہو گیا کہ آج ایک غلام کو

آزاد کرے اور کل ہی اس کے ساتھ شادی کرلے۔ وقس علی ہذا۔ تیسرے یہ کہ اب غلام کے لئے بالکل جائز قرار پا گیا کہ وہ اپنے آقا کی اجازت سے کسی آزاد عورت سے شادی کر سکتا ہے اور اس کی غلامی کے زمانہ کی جو اولاد ہو وہ اس کی آزادی پا جانے پر اس کی وارث جائز ہو سکتی ہے۔ لونڈیوں کے ساتھ زناکاری بھی اب ویسا ہی جرم قرار پا گئی جیسا کہ آزاد عورتوں کے ساتھ یعنی دونوں کی سزا سزائے موت ہو گئی۔

یہ اصلاحات قانونی اگرچہ بجائے خود نہایت اہم تھیں تاہم مسیحیت کا اصلی کارنامہ اس باب میں ان قانونی اصلاحات کے اندر تھیں، کیونکہ یہودیوں کے ہاں غلامی سرے سے ممنوع تھی اور بعض رواق حکما نے موروثی غلامی کو بالکل ناجائز قرار دیا تھا۔ یہ خلاف اس کے مسیحیت کے ہاں غلامی بالکل جائز تھی بلکہ اس نے سرشت انسانی میں اطاعت کیشی و غلامی کا مادہ اور زیادہ پیدا کر دیا تھا۔ رہی پادریوں کی یہ تعلیم کہ کل انسان آپس میں بھائی ہیں تو یہ تعلیم تو رواقیہ بہت پیشتر دے چکے تھے۔ غرض اس حیثیت سے غلاموں پر مسیحیت کا کوئی خاص احسان نہیں۔ اس کے اصلی احسانات یہ تین تھے۔

(۱) اس نے انسانی اخوت و مساوات کا ایک نیا تخیل پیش کیا جس نے ذات پات اور درجہ بندی کی تعریف کو مٹایا۔

(۲) اس نے غلاموں کی اخلاقی عظمت قایم کر دی۔

(۳) اس نے غلاموں کو آزادی دلانے کی خاص تحریک کی۔

ذیل میں ہم ان تینوں کو علحدہ علحدہ بیان کرتے ہیں۔

(۱) پہلا مقصد مسیحیت نے اس طرح پر حاصل کیا کہ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں آقا و غلام کی تفریق کو مٹا دیا۔ اصطباغ لینے یا تبرکات حاصل کرنے، نماز پڑھنے اور دعائیں مانگنے میں دونوں برابر و ہم درجہ تھے۔ جرایم کی سزا جیسی ایک کو ملتی، ویسی ہی دوسرے کو۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ قانون بھی آقا و غلام میں فرق کرتا تھا، لیکن مسیحیت نے مجرم و مستغیث کی حیثیت سے قانون

کی نظریں دونوں کو ایک کر دیا۔ جن آقاؤں کی سزا سے تازیانہ سے غلام مرجاتے تھے وہ ہمیشہ کے لئے گرجا میں حصول تبرکات سے محروم کر دیے جاتے تھے۔ لونڈیوں کی عصمت پیشتر ایک ناقابل لحاظ شے تھی۔ گرجا نے اسے خاص اہمیت دی۔ اور غلاموں کے لئے یہ بالکل جائز ہوگیا کہ آزادی حاصل کر کر کے پادری ہو جائیں۔ چنانچہ یہ بارہا دیکھنے میں آیا کہ ایک آقا نزع کے وقت اپنے آزاد شدہ غلام کے جواب پادری ہوگیا ہے، قدموں پر سر رکھے اپنے لئے دعائے مغفرت کرا رہا ہے۔

(۲) دوسرا مقصد مسیحیت نے یوں حاصل کیا کہ اُس نے انہیں خصوصیات کو اخلاقی عظمت دیدی جو غلاموں میں پائے جاتے ہیں۔ مشرکوں کے ہاں غلامانہ زندگی مرادف تھی تحقیر و تذلیل کی اور ایسا ہونا بالکل بجا تھا۔ کیونکہ قدمائے روم کے نزدیک جو معیار اخلاق تھا، اس میں وہی خصوصیات شامل نہیں جو غلامانہ زندگی کی بالکل منافی اور آزاد زندگی کے لوازم ہیں، مثلاً بلند نظری، خودداری، خود اعتمادی، بیباکی، ہمت و اقدام وغیرہ۔ مسیحیت نے جو معیار اخلاق قایم کیا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اِس کے نزدیک اُس کے عناصر ترکیبی وہ تھے جن کے ڈانڈے غلامانہ زندگی سے بالکل ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثلاً انکسار، فروتنی، اطاعت کشی، صبر، تسلیم و رضا۔ اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ پہلے جس تحقیر و تذلیل کا غلامی کے ساتھہ تلازم تھا وہ اب مٹ جائے۔ میرے نزدیک مسیحیت کا یہ اثر انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم رومی معیار اخلاق کے پھیلنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ گو عروج و امن کی حالت میں اہل روم اپنے اعلیٰ اخلاق کا پورا ثبوت دیتے لیکن مصیبت و شورش کے وقت وہ ضبط و تحمل سے کام نہ لے سکتے۔ مسیحی معیار اخلاق کے رایج ہوجانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ تحمل و صبر کی مثالیں کثرت سے پائی جانے لگیں۔ چنانچہ غلاموں نے یہ دیکھکر کہ مسیحی معیار اخلاق اُن کی طرز زندگی کے عین مطابق ہے، مسیحیت میں جوق جوق داخل ہونا شروع کر دیا (یہاں تک کہ آزادگان روما یہ طنز کرنے لگے کہ مسیحیت تو غلاموں کا مذہب ہے) اور اس وقت کے شہدائے مسیحیت کی فہرست میں ایک آدھ نہیں متعدد

غلاموں کے نام نظر آتے ہیں۔ اور اٹلی میں بازنطینی طرز کی جو بہترین و اوّلین عمارت ہے یعنی سینٹ ویٹال کا گرجا وہ ایک غلام شہید کی یادگار میں بنا ہے۔

(۳) تیسرے مقصد کے حصول کی یہ صورت ہوئی کہ قسطنطین نے غلاموں کی آزادی کی رسم کو جو کلیسا کے تعلق کر دیا اور اس راستہ میں ہر طرح کی سہولتیں پیدا کر دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس رسم نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر لی۔ مذہبی جشنوں اور تہواروں کے موقع پر یہ رسم خصوصیت کے ساتھ ادا کی جانے لگی اور گناہوں کے کفّارہ کا یہ ایک نہایت عمدہ طریقہ قرار پا گیا۔ اب جس کثرت سے غلام آزاد کئے جانے لگے اُس کا اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے سینٹ ملینیا نے ۸۰۰۰ غلام آزاد کئے، سینٹ اوڈیس نے ۵۰۰۰، کرومیٹیس نے ۱۴۰۰، ہرمس نے ۱۲۰۰، اور سینٹ اگسٹائن و متعدد اشخاص نے بھی بہت کثرت سے محض حصول ثواب کی غرض سے۔ رفتہ رفتہ یہ رواج اتنا پھیل گیا کہ شادی وغیرہ کی ہر تقریب میں اس سے کام لیا جانے لگا۔ کوئی بیماری سے اچھا ہوگا ایک بردہ آزاد کرے گا۔ کسی کے گھر میں ولادت ہونے والی ہے وہ ایک بردہ آزاد کرے گا کسی کی شادی ہوئی ہے وہ ایک بردہ آزاد کریگا۔ کوئی حالت نزع میں ہے وہ اپنے غلاموں کو آزاد کرے گا۔ قرون وسطیٰ کے بہت سے وصیت نامہ ملے ہیں جن میں یہ صاف لکھا ہے کہ "بہ غرض ایصال ثواب اتنے غلام آزاد کئے جائیں" اس رسم کا یہاں تک گہرا اثر پڑا کہ تیرہویں صدی میں جب فرانس میں کوئی غلام آزادی کے لئے باقی نہیں رہ گیا تو لوگ ایسی مذہبی تقریبات کے موقع پر پرندوں کو قفس سے رہا کرنے لگے۔

قسطنطین کے بعد غلامی یورپ میں ۵۰۰ سال تک رہی۔ اس مدّت میں گو غلاموں کی تعداد بدستور رہی لیکن ان کے مرتبہ و حیثیت کی نوعیت میں کسی قدر فرق ہو گیا۔ پہلے غلام محض غلام ہوتے تھے۔ مگر اب وہ زیادہ تر کاشتکاری کے کام پر لگائے جانے لگے اور ان کی حیثیت محض غلام کی نہیں رہی بلکہ مزدوروں کی سی ہو گئی۔ مغرب میں اس کے دو سبب ہوئے۔ ایک طرف یہ ہوا کہ وحشی اسیران جنگ کی آمد رک گئی۔ بڑے بڑے امیر خاندان مفلوک الحال ہو گئے

شہری زندگی کی چہل پہل کم ہوگئی اور وحشی فاتحین زیادہ غلاموں اور خادموں کے عادی نہیں رہے دوسری طرف خود کاشتکاروں نے شدت افلاس سے اپنے تئیں بڑے زمینداروں کے ہاتھ کاشتکاری کے کام کے لئے فروخت کرنا شروع کیا ان دونوں اثرات سے مغرب میں قدیم طرز کی غلامی کا رواج از خود کم ہوگیا۔ مشرق میں یہ صورت پیش آئی کہ بڑے خاندانوں نے اپنی تنگدستی دیکھکر کچھہ تو خود غلاموں کی تعداد میں تقلیل شروع کی اور کچھہ ملک میں زراعت زیادہ پھیلانے کے لئے سرکاری طور پر بہت سے غلام کاشتکاری کے کام پر لگا دیے گئے۔ غرض مغربی و مشرقی دونوں حکومتوں میں اب غلامی محض کی جگہہ کاشتکارانہ غلامی نے لے لی۔ رفتہ رفتہ ایسے ہی اقتصادی تغیرات پیش آتے گئے جنہوں نے غلامانہ کاشتکاری پر آزادانہ کاشتکاری کو ترجیح دیدی ایک طرف یہ ہوا دوسری طرف جو ایصال ثواب کے لئے بکثرت غلاموں کو آزادی مل رہی تھی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کی تعداد روز بروز گھٹنے لگی، تا آنکہ بارہویں صدی میں یورپ میں گنتی کے چند غلام رہ گئے اور چودہویں صدی میں تو غلام ایک ایسا اسم رہ گیا جس کا مسمیٰ یورپ بھر میں گویا ایک بھی نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں یہ ذکر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ غلاموں کو آزادی دینے کے علاوہ قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑانے میں مسیحیت کا جو احسان ہے اُسے بھی دنیا نہیں بھول سکتی۔ ایسے وقت میں جبکہ وحشیوں کے متواتر حملوں سے ساری جماعت کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ جبکہ بڑے بڑے شاندار و پر رونق شہروں میں دیکھتے دیکھتے سناٹا چھا جاتا تھا، جبکہ اٹلی کی نئی نسل یا تو نذر شمشیر ہو رہی تھی اور یا پابہ زنجیر، پادریوں کی کوشش ہمہ وقت یہ رہتی تھی کہ اسیروں کو راحت پہنچائیں اور انہیں رہائی دلائیں۔ سینٹ ایمبروز نے ایک بار تمام اہل کلیسا کے علی الرغم یہ کیا کہ جب حملہ آور ہن گوتھ نے بہت سے اسیران جنگ گرفتار کرلئے تو اُس نے میلان کے شاندار گرجا کا تمام سامان آرایش فروخت کرکے ان قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیا۔ اُس وقت تو اس کے اس فعل پر بڑی شورش ہوئی لیکن جب سے سینٹ گری گوری نے اس پر اپنی منظوری کی مُہر لگا دی کسی کو مجال

اعتراض نہ رہی اور یہ دستور عام ہوگیا۔ اس طرح جب رومی فوج نے۔۔۔، ایرانی گرفتار کئے اور اُن کے کھانے پہننے کا کوئی انتظام نہیں کیا تو باوجودیکہ اہل ایران مسیحیت کے جانی دشمن تھے آمیڈا کے پادری اکیسیس نے یہ کہہ کر کہ "خدا زیورات سے مستغنی ہے" اپنے کلیسا کا تمام سازو سامان فروخت کر ڈالا اور اُس کے فدیہ سے ان قیدیوں کو رہائی دلا کر انہیں پھر ان کے ملک میں بہ خیر و خوبی واپس کر دیا۔ اس کے بعد سے پھر تو بیسیوں مثالیں ملتی ہیں سینٹ ڈیوگرئیس، سینٹ آگسٹائن، سینٹ گریگوری، سینٹ قیصرئیس، سینٹ اکسوپیریس، سینٹ ہلیری سینٹ ریمی، سینٹ سایپرین، سینٹ اپنینیس، سینٹ آویٹس، سینٹ الیجیس، و سینٹ یالبنس، غرض کوئی کہاں تک نام گنائے۔ ان سب نے اپنا طرز عمل یہی رکھا۔ مدت دراز کے بعد جب مسلمان حملہ آوروں کے ہاتھ میں ہزارہا قیدی پڑنے لگا تو پھر پادریوں کے اسی فیاضانہ جذبہ کو تحریک ہوئی اور وہ اسی سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے۔ بارہویں صدی میں جان آف ماتا اور تیرہویں صدی میں پیٹر نولسکو کی زیر صدارت خاص اسی مقصد کے لئے انجمنیں قایم ہوئیں۔

مسیحی احسانات کی فہرست کا آخری عنوان خیرات ہے صفحات بالا میں ضمناً کہیں کہیں اس کا ذکر آچکا ہے لیکن اب اسی پر ہم مستقل طور سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مشرکانہ و مسیحیانہ طرز خیرات میں عظیم الشان فرق تھا۔ خیرات وسیع پیمانہ پر صرف وہیں جاری ہوسکتی ہے، جہاں ایک بڑی جماعت مفلس و بیکار موجود ہو۔ رومہ میں جتنے مفلس تھے وہ سب کے سب غلام تھے، یا رئیسوں کے طفیلیوں میں ہوتے تھے۔ غرض بیکار کوئی بھی نہ تھا۔ اس بنا پر اس زمانہ میں خیرات خانوں کے اجرار کا کوئی محل نہ تھا اور اُن کی تعداد کی بنا پر مسیحی و مشرکانہ خیرات کا موازنہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ البتہ قدماء کے نزدیک یہ امر فرایض سلطنت میں داخل تھا کہ اہل ملک کی کفالت کی جائے۔ یونان نے اس بارہ میں جو کچھ کیا اس سے قطع نظر کیجئے۔ خود رومہ کے مفلسوں کی حالت دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ صدیوں تک ہزارہا لکھوکھا مخلوق کو سرکار کی طرف سے مفت غلہ تقسیم ہوتا رہا۔ یہ دستور یوں تو رومہ میں شروع سے موجود تھا لیکن رومی سال کے

سنہ ۶۳۱ء میں یہ قانون باضابطہ منظور ہوا کہ ناداروں کو برائے نام قیمت پر غلّہ دیا جایا کرے۔ دو سال کے بعد امرا نے جوڑ توڑ کر کے اسے منسوخ کرا دیا لیکن سنہ ۶۷۹ء میں یہ بالآخر از سر نو جاری ہوا۔ سنہ ۶۹۱ء میں اسے اور وسعت دی گئی۔ سنہ ۶۹۵ء میں کلوڈیس پلچر نے برائے نام قیمت کو بھی اُڑا دیا، اور تقسیم کو جو ماہوار ہوتی تھی بالکل مفت کر دیا جولیس سیزر کے زمانہ میں ان خیرات پانے والوں کا شمار ۳۲۰۰۰۰ تھا۔ اور گو اس نے اُن کی تعداد نصف کر دی لیکن آگسٹس کے وقت میں وہ پھر بڑھ کر ۲۰۰۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ اس تاجدار نے تقسیم کو بجائے ماہوار کے سہ ماہی کر دینا چاہا! لیکن عام رائے کے سامنے اسے اپنی تجویز کو مغلوب کر دینا پڑا۔ رفتہ رفتہ یہ دستور رومی زندگی کا ایک جزو اہم بن گیا۔ اور متعدد عہدہ داروں کا ایک خاص محکمہ اس کے لئے قایم کر دیا گیا۔ انٹونانیس کے زمانہ میں خیرات پانے والوں کا شمار ۵۰۰۰۰۰ سے بھی متجاوز ہو گیا۔ سیورس نے غلّہ کے ساتھ روغن کا بھی اضافہ کر دیا آریلین نے ماہانہ تقسیم غلّہ کے بجائے روزانہ روٹی اور سور کے گوشت کی تقسیم جاری کی۔ رفتہ رفتہ رُوم کے علاوہ قسطنطنیہ، اسکندریہ، انطیوخ اور غالباً اور اکثر شہروں میں بھی یہ دستور رایج ہو گیا۔

غرض رُومہ قدیم میں خیرات کے وجود سے انکار نہیں اِس کا وجود تھا اور بہ افراط تھا لیکن ناظرین کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ شے معین ہوئی رومی اخلاق کے انحطاط میں۔ خیرات خواہ کیسی ہی بے محل و مسرفانہ عمل ہو مگر عموماً اس کا اثر یہ ضرور ہوتا ہے کہ کم از کم خیرات دینے والے پر اس کا اچھا اثر ضرور پڑتا ہے۔ مگر رُومہ میں تقسیم غلّہ سے چونکہ خیرات مطلقاً بھی مقصود نہ تھی بلکہ اس کی غایت محض سیاسی اثر و اقتدار تھی اس لئے نتیجہ بھی یہی نکلا۔ خیرات پانے کے لئے اس کی مطلق ضرورت نہ تھی کہ آدمی کام کے قابل نہ ہو بلکہ محض رومی ہونا اُس کے لئے کافی تھا اور یہ صاف کاہلی اور اپاہج پن کی تعلیم دینا تھا۔ جب ہر شخص کو کھانے بھر کو بلا ہاتھ پیر ہلائے مل جاتا تھا اور ضرورت سے زیادہ تفریح و تماشہ کے مناظر ہر وقت سامنے رہتے تھے تو کون ایسا احمق تھا جو خواہ مخواہ محنت کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ کاروباری زندگی پر مردنی چھا گئی۔ زراعت کی طرف سے

لوگ غافل ہوگئے، تجارت وصنعت وحرفت کی طرف سے بے اعتنائی پھیل گئی اور جب کبھی اتفاق سے تقسیم میں دیر ہوجاتی تو شہر پر قیامت گزرجاتی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگوں نے جب دیکھا کہ اُن کے حصّہ میں اولاد بھی شریک ہوا چاہتی ہے تو اسقاط حمل، طفل کشی وغیرہ مختلف طریقوں سے اولاد کی تعداد محدود کرنا شروع کردی۔

رومہ کی کل آبادی ۵۰۰۰۰۰ سے زاید نہ تھی۔ ان میں سے غریب اہل شہر کی ایک تعداد کثیر غلاموں میں شامل تھی۔ اُن کا بھی حصّہ نکال ڈالنے کے بعد اگر ۲۰۰۰۰۰ شخص محض خیرات پانے والے تھے، تو کوئی شخص قدماے روم پر خسّت کا الزام نہیں عاید کرسکتا۔ لیکن ان کے فیاضیاں صرف تقسیم غلّہ تک محدود نہ تھیں بلکہ خیرات کے اور طریقہ بھی رایج تھے۔ مثلاً نمک کی قیمت براے نام لی جاتی تھی۔ زمین کو جولیس سیزر، نرد، وسیورس نے خرید کر رعایا کو مفت تقسیم کیا تھا۔ جولیس سیزر آگسٹس وغیرہ نے رعایا کے لئے بڑے بڑے ترکہ چھوڑے تھے اور مختلف تقریبات کے موقعوں پر خوب خیرات کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے حمام وقف عام تھے جن میں بعض بالکل مفت تھے اور بعض میں براے نام اُجرت لی جاتی تھی۔ وسپیسین نے تعلیم عام کا ڈھنگ ڈالا انٹونانیس نے اسے اور زیادہ وسعت دی اور بچّوں کی تربیت کا انتظام جس کا میں پیشتر ذکر کرچکا ہوں بہت وسیع پیمانے پر ہوگیا۔ اسے سب سے پہلے آگسٹس نے شروع کیا تھا۔ لیکن یہ اس کی ایک ذاتی وہنگامی فیاضی تھی۔ اس کی ایک مستقل وباضابطہ شکل سب سے پہلے نرواسنے قایم کی۔ اُس نے نہ صرف روم بلکہ اٹلی کے تمام شہروں میں نادار بچّوں کی کفالت کے لئے حکم جاری کیا۔ ٹریجن نے اُسے اور وسعت دی۔ اُس کے زمانہ میں اکیلے شہر روم میں ۵۰۰۰ بچے سرکاری خرچ سے پرورش پاتے تھے اور یہی طریقہ افریقہ واٹلی میں ہر جگہہ جاری تھا، جن کی تفصیل کا ہم کو علم نہیں۔ ویلیا ایک حقیر قصبہ تھا، صرف اس میں ۳۰۰ بچّوں کی پرورش کا سرکاری انتظام ٹریجن کے زمانہ میں تھا سرکاری فیاضیوں کے علاوہ خانگی طور پر اشخاص کی ذاتی فیاضیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آج گو ہم ان کی مفصّل تاریخ نہیں لکھ سکتے، تاہم مختلف کتبات سے اُن کا وجود تو قطعی طور پر ثابت ہوتا ہی

پامبنی نے علاوہ مدارس ومکاتب کے ایک زبردست سرپرست ہونے کے اپنے شہر میں نادار بچوں کے لئے ایک اسکول کھولا تھا جس کے لئے اپنی جائداد وقف کر دی تھی جناتون سیلیا میکرینا نے ٹرکینا میں ۱۰۰ بچوں کے لئے ایک خیرات خانہ کھولا تھا۔ ہیڈرین نے ان خیرات خانوں کو جو امدادی رقم ملتی تھی اس میں اضافہ کر دیا اور نادار عورتوں کے ساتھ جو جو سلوک وہ کرتا تھا وہ آج تک مشہور ہیں۔ انٹونینس ۴ فی صدی کی شرح پر غربا کو قرض دیتا تھا جو اس وقت کی عام شرح سود کو دیکھتے ہوئے بہت ہی خفیف تھی۔ انٹونینس و مارکس آریلیس دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کی یادگار میں لڑکیوں کے لئے پرورش گاہیں قایم کیں۔ اسی طرح الگزنڈر سیورس نے اپنی والدہ کی یادگار بچوں کے لئے ایک خیرات خانہ کی شکل میں بنوائی عام شفا خانوں اور اسپتالوں کا رواج تو یورپ میں مسیحیت سے قبل غالباً نہ تھا۔ مگر اس کے ثبوت موجود ہیں کہ غربا کو دوائیں مفت تقسیم ہوتی تھیں، معطل العضو غلاموں کے لئے محتاج خانے قایم تھے اور غالباً جنگی اسپتالوں کا بھی وجود تھا۔ قحط، سیلاب، زلزلہ وغیرہ کے موقع پر سرکار کی طرف سے رعایا کو امداد ملتی تھی اور رؤسا اپنی جائدادیں رفاہ عام کے لئے ترکہ میں چھوڑ جاتے تھے۔

یہ تمام مثالیں بجائے خود کیا کم ہیں لیکن ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ یہ واقعات و حالات کی مکمل فہرست ہرگز نہیں۔ صدہا کتبہ ایسے ہوں گے جو آج مٹ گئے ہیں۔ ہزارہا یادگاریں ایسی ہوں گی جن کے آج نشان تک نہیں پائے جاتے۔ پھر خیرات و فیاضی کی تاریخ میں کوئی ایسی عجیب و غریب بات بھی نہ تھی جو ہمارے مورخین اسے خصوصیت کے ساتھ قلمبند کرتے۔ خود ہمارے معاصر مورخین کب اپنے مجلدات میں اس طرح کے واقعات کو لکھتے ہیں؟ اور آج سے دو چار ہزار سال کے بعد گر کوئی آج کل کی تصانیف سے موجودہ فیاضیوں کی تاریخ لکھنا چاہے گا، تو اس کے سامنے کس قدر ناقص، نامکمل اور ادھورا مواد ہوگا! لیکن ان اعتراضات کے باوجود بھی ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ مسیحیت نے خیرات کا جو درجہ

مقرر کیا جس پیمانہ پر اسے پھیلایا جس اسلوب پر اسے چلایا، ان میں سے کسی لحاظ سے قدما اُن کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ اُس وقت خیرات تقریباً تمامتر ایک سرکاری کارروائی ہوتی تھی جس کا مقصد رفاہ خلق نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی ہوتی تھی۔ اور جس کثرت سے ملک میں قحط پڑا کرتے تھے یا جس تعداد میں غربا سپاہی کا پیشہ اختیار کرتے تھے اور جس افراط سے لوگ اپنی اولاد کو فروخت کر ڈالتے تھے، ان سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کا کس قدر کثیر حصہ خیرات سے مستفید ہوتا تھا، اور کس قدر مزید فیاضیوں کی ضرورت باقی تھی۔ بے شبہ چند مشترک فیاضیوں کے واقعات ہم تک پہنچے ہیں۔ مثلاً یونانیوں میں اپیمینڈس قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑاتا تھا اور نادار لڑکیوں کو جہیز کا سامان دیتا تھا، سیمن غربا کی کھانے کپڑے سے کفالت کرتا تھا، بایں، مسینا کی گرفتار شدہ لڑکیوں میں خرید کرکے اور جہیز کا سامان دے کر آزاد کر دیتا تھا۔ اسی طرح کی مثالیں رومہ میں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ اور یہاں مہمان نوازی کی تو خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اشخاص کی خانگی فیاضیاں افراد کی ذاتی خیراتیں جو مسیحی جماعات کی ہر ملک و ہر زمانہ میں اجزاء غیر منفک رہی ہیں ان کا قدماء کے یہاں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور اُن کے حکماء اخلاق میں، بجز دو ایک کے اور کسی نے ان کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ ان دو ایک میں سب سے زیادہ قابل ذکر سسرو ہے۔ اس نے اس موضوع پر پورے دو باب لکھے ہیں، جن میں گو دقت نظر سے کام لیا ہے لیکن گرمجوشی کا کہیں پتہ نہیں وہ کہتا ہے کہ انسان کی کوئی خصلت سخاوت سے بہتر نہیں لیکن شرایط ذیل کے ساتھ :-

(۱) جس شخص کو ہم اپنی فیاضی کا مورد بنا رہے ہیں وہ واقعۃً اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

(۲) ہم اپنی چادر سے باہر تو پاؤں نہیں پھیلا رہے ہیں۔

(۳) وہ آمدنی جائز ذرایع سے حاصل کردہ ہے، سیزر کی طرح ناجائز ذرایع سے تو نہیں آئی ہے۔

(۴) اُس کا مقصد رفاہ و بہبو خلق ہو، اپنی نمود و نمایش نہ ہو۔

(۵) اور خیرات پانے والے کی ضروریات و حیثیت کا پورا لحاظ کر لیا گیا ہو۔

دنیا میں سب سے اول بار مسیحیت نے یہ بتایا کہ سخاوت انسان کے فرایض اخلاق میں داخل ہے اور تمام معلمین مسیحیت اس تعلیم کو زور کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ اس سے بھی زیادہ پُراثر طریقہ مسیحیت نے یہ اختیار کیا کہ خود مسیح کو فقر و مسکنت کا مجسمہ قرار دیا اور اس لئے جو لوگ فقراء و مساکین کی امداد کرتے تھے وہ گویا خود مسیح کی خدمت کرتے تھے۔ اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سخاوت و فیاضی مسیحیت کا جزو غیر منفک ہو گئی جس سے مسیحی کسی وقت اور کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ خود تعدّیوں کے پُر آشوب زمانہ میں ہر اتوار کو فقراء کے لئے چندہ جمع کرنا ضروری تھا۔ مسیحی روزہ رکھتے تھے مگر مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو کچھ کھانا بچے محتاجوں کی نذر ہو۔ خیرات کا ایک بڑا وسیع نظام جس کے صدر پادری لوگ تھے اور جس کی باگ استفون کے ہاتھ میں تھی اپنی صدہا شاخوں کے ساتھ قایم ہوا اور کلیسا کے دور دور از ٹکڑوں کے درمیان خیرات و فیاضی کا رشتۂ اتحاد قرار پایا۔ قسطنطین کے زمانہ سے بہت پیشتر کا واقعہ ہے کہ مسیحیوں کی فوق الحد فیاضیوں کو دیکھکر صدہا منافقین اُن کے گروہ میں شریک ہونے لگے اور جب مسیحیت کو پورا تسلط ہو گیا ہو گیا۔ تب تو اُس کی فیاضیوں کا کوئی شمار ہی نہیں رہا۔ دنیا میں سب سے پہلا شفاخانہ ایک رومی خاتون فبیولا کے ہاتھوں چوتھی صدی میں قایم ہوا۔ اور اس کی تقلید عام طور پر ہونے لگی۔ چند روز میں متعدد شفاخانہ اور اسپتال جگہہ جگہہ کھُل گئے۔ سرائیں اور مہمان خانہ جو بننے لگے۔ وہ علیحدہ۔ نائیس کی انجمن کلیسا نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر شہر میں ایک ایک سرا تعمیر ہونا چاہیئے۔ سینٹ کریزوسٹم کے زمانہ میں اکیلے انطیوخ کے گرجا سے علاوہ مریضوں و مسافروں کے ۳۰۰۰ بیواؤں اور کنوارئیوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں لوگ عام طور پر اپنی بڑی بڑی جائدادیں غربا و مساکین کے لئے وقف کرنے لگے۔ اندھوں، برص و جذام کے مریضوں و قحط زدوں کے علاج و پرورش کے لئے متعدد راہبوں (مثلاً سینٹ افریم و تھیلیسیں وغیرہ) نے شفاخانہ و محتاج خانہ کھول دیے اور ایک تاجر اپولونیس نے خود راہبوں کے لئے

ایک اسپتال جاری کردیا۔ ہر عیسائی پر یہ واجب تھا کہ اپنی آمدنی کا کم از کم $\frac{1}{10}$ حصّہ ضرور اہل حاجت کے لئے وقف رکھے اور آج کل کے اشتراکیین کا سا خیال اس وقت بالعموم مسیحیوں میں شایع ہوگیا تھا کہ زمین پر قدرتاً تمام انسانوں کو برابر درجہ کا حق حاصل ہے اور جو لوگ امیر و زمیندار ہیں وہ محض اس لئے کہ اپنی دولت و زمین میں دوسروں کو شریک کریں۔ وہ گویا اپنے ابنائے جنس کے امین ہیں اور اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

مسیحیوں کے اس جوش ایثار و سخاوت نے بت پرستوں کو خاص طور پر متاثر کیا جنھوں نے اپنے یہاں بھی اس کی تقلید کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئی ۲۲۶ء میں جب قرطاجنہ میں یا گیلینیس و میکزیمین کے عہد حکومت میں جب اسکندریہ میں وبا پھیلی ہے اور جبکہ فرط اضطراب سے بت پرستوں کی تمام دنیا میں نفسی نفسی پڑی ہوئی تھی، یہ ہمت و پامردی صرف عیسائیوں میں تھی کہ وہ اپنے پادریوں کی زیر سرکردگی، مریضوں کی آخر وقت تک دوا علاج و تیمارداری کرتے انھیں تسلّی و تشفّی دیتے اور جب وہ مرجاتے تو اُن کی تجہیز و تکفین کرتے۔ غلاموں کے بہ کثرت آزاد ہونے سے جب ملک میں گداگروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس پر وحشی حملہ آوروں کے حملہ اور مستزاد ہوے تو اس وقت بھی گرجانے اپنی فیاضیوں کا انتہائی ثبوت دیا جنسیرک نے جب افریقہ کو مسخر کرلیا تو اٹلی میں غلّہ کی درآمد موقوف ہوگئی اور بڑا سخت قحط پڑگیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک تباہی و بربادی پھیل رہی تھی۔ ہزارہا شخص وبا کا شکار ہو رہا تھا آباد و پُر رونق شہروں کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی۔ اور ہر ہر گلی میں قحط زدوں کی لاشیں اور فاقہ کشوں کی صورتیں نظر آتی تھیں لیکن اس عام ہلچل اس عام محشر اضطراب کے درمیان گرجا کے خادموں کی پُرسکون شکلیں

دکھائی دیتی تھیں جو یا تو حملہ آوروں کے قہر وغضب کو ٹھنڈا کرتی ہوتی تھیں یا پھر مصیبت زدوں کی دستگیری میں مشغول نظر آتی تھیں۔ آلارک کی فوج نے جب رُوم پر قابض ہو کر قتل وغارت کی گرم بازاری شروع کر دی تو صرف مسیحیوں کا گرجا ایک ایسا مامن وملجا تھا جو حملہ آوروں کی دست درازیوں سے ہر طرح پر محفوظ تھا پھر جب شہر کو آلارک سے بھی زیادہ مہیب دشمن آٹیلا کا سامنا ہوا اور اس کے قہر کے آگے سارا شہر لرزہ براندام تھا اس وقت پاپائے اعظم سینٹ لیو اپنے اپنے مقدس لباس میں اپنے ہموطنوں کی حفاظت کے لئے باہر نکلا۔ مہیب فاتح پر پاپا کی ہیبت چھا گئی اور شہر دست درازیوں سے محفوظ رہ گیا۔ دو برس بعد جنسبرک کا حملہ ہوا اور اُس وقت بھی پاپائے موصوف کی سفارش سے قتل وغارت میں بہت تخفیف کر دی گئی۔ اسی طرح ٹوٹیلا پر حملہ کے وقت پیلاگیس کی ٹروس پر حملہ کے وقت سینٹ لوپس کی، آرلینس پر حملہ کے وقت سینٹ ایگنان کی اور انگلستان پر قوم پکٹ کے حملہ کے وقت سینٹ جرمین کی سفارشیں کام آئیں۔

فاتحین وحملہ آوروں کے علاوہ حالت امن میں خود حکام ورعایا کے درمیان پادریوں کی وساطت سے بارہا مصالحت ہوئی ہے۔ شہر انطیوخ کو جب بغاوت کے جرم میں تھیوڈوسیس نے سزا دینی چاہی تو تمام خادمان کلیسا اپنے اپنے خلوتکدوں سے نکل نکل کر وزرائے سلطنت کی خدمت میں عرض ومعروض کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور خود آرچ بشپ فیلیوین بادشاہ کے پاس التجائے استرحام کے لئے گیا ہی اسی تھیوڈوسیس نے جب تھیالونیکا میں خونریزی کی ہے تو سینٹ ایمبروز نے اسے مجبور کیا کہ اپنے اِس گناہ کا کفارہ دے متعدد مثالیں اس کی بھی ملتی ہیں کہ جو حکام واُمرا رعایا پر جبر وتشدد کرتے تھے وہ گرجا کی برادری سے خارج کر دیے جاتے تھے تا آنکہ کفارہ دیکر وہ دوبارہ اپنے تئیں اس کی شرکت کے قابل بنا سکیں

آخرکار جب پادریوں اور راہبوں کے اثر کی یہ حالت پہنچ گئی کہ وہ بار ہا مجرموں کو چھڑا لائے اور اس سے ملک کی سیاست متاثر ہونے لگی تو اُن کے لئے کچھ مخصوص قوانین کا نفاذ کرنا پڑا۔ یتیموں اور رانڈوں کی دستگیری کرنا گرجا کا مذہبی فرض تھا اور دنیوی حکام کے لئے اُن پر بغیر پادریوں کی صلاح ومشورہ کے مقدمہ چلانا ایک گناہ قرار پاگیا۔ پانچویں صدی میں کلیسا کی ایک کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ جو حکام غرباکے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئیں گے، یا پادریوں کی سفارشوں سے بے اعتنائی کریں گے وہ گرجا کی برادری سے خارج کر دیے جائیں گے۔ پادریوں کے دولت وتموّل کا سبب یہ تھا کہ اُمرا اپنے ترکہ انہیں کے پاس چھوڑ جاتے کہ یہ اس کے مصرف صیحح کے امین رہیں۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ اُمراء ان پادریوں سے ڈرتے تھے غربا انہیں اپنا دستگیر جانتے تھے، مجرم انھیں اپنا شفیع سمجھتے تھے، مریض انہیں اپنا معالج وتیمار دار یقین رکھتے تھے اور مسافران کے مکانات کو مہمان سرا تصوّر کرتے تھے اوران کے علاوہ خیرات کے اور جتنے مظاہر ممکن تھے یہ سب پر عمل کرتے تھے مثلاً ایک راہب نے اپنے ذمّہ یہ کام لیا تھا کہ کشتی کھیتا تھا اور بلا محصول مسافروں کو دریا پار اُتارا کرتا تھا۔ یا پھر اسی طرح جب یورپ میں جذام کا نفرت انگیز مرض پھیلا اوراُس نے وبائی شکل اختیار کرلی، اور لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ نہ صرف اس خیال سے کہ یہ مرض متعدی ہے، بلکہ اس خیال سے کہ یہ ایک شیطانی عذاب ہے تو نئے نئے اسپتالوں میں مریضوں کی خدمت وتیمار داری کرنے والے اگر کوئی ہوتے تھے تو یہی راہب ہوتے تھے۔

آج مسیحی فیاضیوں کے مورخ کے لئے اس سے زیادہ افسوسناک کوئی واقعہ نہیں کہ اُسے جن چیزوں کی سب سے زیادہ تلاش ہے انھیں میں اس کے پیشروں نے سب سے زیادہ بخل سے کام لیا ہے۔ حکومتوں کے انقلاب، فاتحین کے حملے،

جنگ و جدل کے کارنامہ، محاربات کے واقعات ان کی تصویر کا ایک ایک خط و خال تاریخ کے مرقع میں محفوظ ہے اور کیوں نہ ہوتا؟ یہ چیزیں ہی ایسی ہیں جو متخیلہ کو متاثر کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے کتنے لوگ ایسے ہیں جو بیماروں کی آہوں، رانڈوں کے بین، یتیموں کے نالہ، اور بیوہاؤں کی فریاد پر توجہ کرتے ہیں؟ پھر اُن کی تاریخ جمع ہوتی تو کیونکر؟ دنیا کے حقیقی اور شاندار ترین کام شاید ہمیشہ غیر مکتوب رہ گئے ہیں اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسیحیت کا روشن ترین کارنامہ یہی اُن کی سخاوت و فیاضی کی تعلیم و عمل ہے۔ یہ اُسی کا کام تھا کہ اُس نے اسے مذہب کا جزو بنایا اخلاق کی بنیاد اسی پر رکھی، سطح ارض پر سخاوت و خیرات کا ایک سیلاب بہادیا اور اس کا انتظام اپنے مقتدایان مذہب کے فرائض مذہبی میں داخل کردیا۔
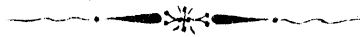
فصل (۴)

مناقب بالا کا تاریک پہلو

مسیحی فیاضیاں، گو نہایت وسیع پیمانہ پر تھیں تاہم غیر محدود نہ تھیں۔ کوئی کلیہ استثنار سے خالی نہیں ہوتا، اور اس فیاضی کے کُلیہ سے ایک خاص طبقہ کے مجانین مستثنیٰ تھے۔ یہ خیال بہت قدیم سے چلا آتا ہے کہ دیوانگی کوئی عام و معمولی بیماری نہیں بلکہ کسی مافوق الفطرت قوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ مسیحی دنیا میں دیوانے مشتبہ نظروں سے دیکھے جائیں یہ سبب بجائے خود کافی تھا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بھوت، پریت، جن و پلید سحر و جادو کا اعتقاد کتب یہود میں مسلّم تھا۔ اور تمام مسیحیوں کو ان کے وجود پر پورا یقین تھا۔ اُن میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اس کے گرد و پیش ایک غیر مرئی دنیا ہے، جس میں یہ شیاطین چلتے پھرتے رہتے اور بستے ہیں۔ اب اگر کسی کے دماغی توازن میں ذرا بھی اختلال ہوتا۔ اُس کے لئے بلا تامل التباس حواس سے یہ غیر مرئی ہستیاں، مرئی ہو جاتیں۔ خصوصاً وہ لوگ جو تنہائی میں بیٹھکر عبادت میں مصروف رہتے تھے، یا زاویوں اور غاروں میں چلّہ باندھکر ریاضتوں میں لگے رہتے اور تمام لذاید و نعایم دنیوی سے دست بردار ہو کر اپنی جسمانی صحت خراب کر چکے ہوتے، وہ اور زیادہ اس التباس حواس کے شکار ہوتے۔ چنانچہ صدہا زاہدان مرتاض کو یہ خواب بیداری نظر آتے رہتے کہ شیاطین کا اُن کے گرد حلقہ ہے اور وہ ان کی عبادت و ریاضت میں وسوسہ اندازی کر رہے ہیں۔ یہ کیفیت جنوبی جب تک مذہب کی تعلیمات سے متصادم نہ ہوتی اُس وقت تک تو کوئی ہرج نہیں ہوتا تھا لیکن جب یہ مذہب کے کسی جزو سے آکر ٹکرا جاتی تھی تو غریب دیوانہ کو اپنی دیوانگی کے جُرمانہ میں اپنی جان نذر کر دینا پڑتی تھی۔ ۱۳۰۰ء میں ایک لڑکی کی جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ روح القدس نے مجھ میں جنم لیا ہے تاکہ میں جنس اُناث کو نجات

دلاؤں، لاش کھود کر نکالی گئی اور جلائی گئی اور دو اور عورتوں کو جو اُس کے دعوے پر ایمان لے آئی تھیں قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح ۱۳۵۹ء میں اسپین کے ایک شخص نے یہ دعوی کیا کہ میں میکائیل فرشتہ کا بھائی ہوں اور مُعلّم الملکوت کا جو عہدہ تھا اب اُس پر میرا تقرر ہونے والا ہے۔ میں روزانہ جنت دوزخ کی سیر کرتا ہوں۔ قیامت عنقریب آیا چاہتی ہے اور اُس وقت میں تنہا دجّال سے مقابلہ کروں گا" یہ غریب مجنوں ٹولیڈو کے پادری کے ہاتھ میں پڑ گیا اور ان کلمات کفر کی پاداش میں زندہ جلا دیا گیا بعض مرتبہ یہ جنون، وحی والہام کی شکل میں ظاہر ہوتا اور اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔ یعنی زندہ آگ میں جلا دیا جاتا، جیسا کہ جون آف آرک کا واقعہ شاہد ہے۔ سولھویں صدی میں اسپین کے ایک مشہور طبیب و عالم کو یہ خبط سوار رہا کہ ایک فرشتہ اُس کی مصاحبت میں رہتا ہے۔ خیر یہ خود تو توبہ و استغفار کر کے اور کفارہ دے کر جان بچا لے گیا لیکن اسی نوعیت کا ایک دوسرا خبطی جو لیما میں علم فقہ کا پروفیسر تھا، زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح صدہا ہزارہا غریب بیوائیں ضعیف و ناچار عورتیں جن کے حواس صحیح نہیں رہے تھے جو کبر سنی کی باعث طرح طرح کے توہمات کی شکار ہو جاتی تھیں، اور جن کو گرجا سے ہر طرح کی اعانت و دستگیری کی توقع تھی، اسی جُرم جنون میں مدتوں مختلف تعذیبات جھیلتی تھیں اور پھر آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔

یہ مجانین کے متعلق عام طرز عمل تھا۔ بعض صورتیں جنوں کی داخل امراض سمجھی جاتی تھیں، اور اُن کی بابت یہ یقین تھا کہ اطبا کے علاج و معالجہ سے اچھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان بدنصیبوں کے ساتھ بھی وہ ہمدردانہ برتاؤ مفقود تھا جس کے یہ مستحق تھے، اور جس کی مسیحانہ فیاضیوں سے بالکل بجا طور پر توقع رکھی جا سکتی تھی۔ قدما کے ہاں مجانین، معابد میں یکجا رکھے جاتے تھے۔ اور جھاڑ پھونک، دُعا تعویذ سے ان کا علاج کیا جاتا تھا۔ یونانی اطبا نے اس میں شبہ نہیں کہ طبی حیثیت سے اس موضوع پر نہایت محققانہ رسائل و مقالات چھوڑے ہیں۔ لیکن عملی طور پر پاگلخانے وغیرہ کی تعمیر انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ راہبوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی صرف ایک نظیر

ملتی ہے۔ وہ یہ کہ جب صحرانشین زاہدوں کی تعداد کثیر مجنون ہونے لگی، تو ان کے واسطے بیت المقدس میں ایک علیحدہ مکان بنا دیا گیا۔ بس اس ایک مثال کے سوا جو ایک محدود جماعت سے متعلق تھی اور مسیحی تاریخ میں اس کی شہادت پندرھویں صدی تک نہیں ملتی۔ اصل یہ ہے کہ اس باب خاص میں مسلمان مسیحیوں پر سبقت لے گئے۔ بنجمن آف ٹوڈیلا جس نے بغداد کی بارھویں صدی میں سیاحت کی تھی، لکھتا ہے کہ اس شہر میں ایک خاص محل ''دارالرحم'' کے نام سے موسوم ہے، جس میں تمام ملک کے مجانین پا بہ زنجیر رکھے جاتے ہیں ہر مہینے اُن کا معائنہ ہوتا ہے اور جو جو شفایاب ہوتے جاتے ہیں، رہائی پاتے جاتے ہیں۔ قاہرہ میں مسلمانوں نے پاگلخانہ ۱۳۰۴ء میں تعمیر کرایا۔ لیوافریکینس لکھتا ہے کہ سولھویں صدی کی ابتدا میں شہر فیض میں بھی ایک پاگلخانہ موجود تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اُس وقت دیوانوں اور پاگلخانوں کی نگہداشت کرنا تمام اسلامی ممالک میں رائج تھا۔ خود مسیحیوں میں یہ دستور اول اول انھیں ممالک میں پھیلا جو اسلامی ممالک کے متصل تھے۔ گو اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے یہ دستور مسلمانوں ہی سے لیا۔ اہل مالٹا کی اس باب میں خاص شہرت ہے کہ وہ اپنے اسپتالوں میں مجانین کو داخل کرتے تھے، لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں کہ ۱۴۰۹ء سے پیشتر مسیحی ممالک میں کہیں علیحدہ پاگلخانہ کا بھی وجود تھا۔ مسیحی دنیا میں سب سے پہلا پاگلخانہ اسپین میں ایک راہب جون گیلیبر ٹوژوفرے نے پاگلوں کو گلی گلی دردناک حالت میں پھرتے دیکھکر قایم کیا۔ یہ شہر ''ولینشیا'' میں قایم ہوا، اور پھر اس کی تقلید اور شہروں میں ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۴۲۵ء، ۱۴۳۶ء، و ۱۴۸۳ء میں اسپین کے مختلف صوبوں میں دارالمجانین قایم ہو گئے اور اُس وقت تک مسیحی دنیا کے اور تمام حصے اس کے نام تک سے ناآشنا تھے۔ اہل اسپین اپنے جائز فخر پر ان دو واقعات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں کہ خود حوالی رومہ میں پہلا پاگلخانہ انھیں نے ۱۵۴۸ء میں تعمیر کرایا۔ دوسرے یہ کہ اُن کا برتاؤ مجانین کے ساتھ نہایت دانشمندانہ و ہمدردانہ رہا ہے، جیسا کہ پنل نے اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر اعتراف کیا ہے۔

اسپین کو مستثنےٰ کرنے کے بعد اور تمام مسیحی ممالک میں مجانین کی حالت نہایت ہی ابتر تھی
ہزار ہا اشخاص تو ساحری کے الزام میں زندہ جلا دئے گئے۔ باقی جن کی بابت یہ طے ہی ہو گیا کہ
وہ واقعی مجنون ہیں اُن کا بھی قید و زندان، مار پیٹ، اور فصد کے ذریعہ سے علاج کیا جاتا تھا
شفقت و ہمدری کا کیا ذکر ہے، سیکڑوں کو اپنی عمریں تنگ و تاریک کوٹھریوں کے اندر قید
تنہائی میں گزار دینا پڑیں۔ اور اس برتاؤ سے ظاہر ہے کہ مرض گھٹنے کی جگہ اور ترقی پکڑتا تھا۔
یہ حالت اٹھارھویں صدی تک قایم رہی۔ اٹھارھویں صدی میں جب ایک طرف سائنس
و روشن خیالی پھیلنے لگی، اور دوسری طرف سحر و جادو وغیرہ کے توہمات دلوں سے مٹنے
لگے۔ تب جاکر کہیں اٹلی میں مورگیگنی، اسکاٹ لینڈ میں کولن، اور فرانس میں پنیل کی کوششوں
سے اس باب میں اصلاح ہوئی۔

غرض مسیحی فیاضیوں کی غیر محدود مدح و ثنا میں ہمیں جو رکاوٹ ہوتی ہے، اُس کا ایک سبب
تو یہی تھا، دوسرا سبب جو اس سے زیادہ اہم و وسیع ہے یہ ہے کہ خیرات اپنے مصرف صحیح میں
نہیں صرف کی جاتی تھی۔ خیرات کے جا و بیجا ہونے کے متعلق یوں تو دنیا میں بہت طویل و مفصل
مباحث موجود ہیں، لیکن اقتصادیات کا جو علم ہے اُس سے ہم کو ہدایات ذیل حاصل ہوتے ہیں:-
(الف) اُس نے بیکار و باکار صرف میں تفریق کر کے بتایا ہے کہ اول الذکر سے صرف کرنے
والے کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ جس شے کو وہ روکنا چاہتا ہے اُسی کو اور ترقی ہوتی ہے:
مثلاً جہاں بے روزگاروں کی اعانت کی جاتی ہے وہاں بے روزگاری اور پھیلتی ہے۔ جہاں
ہر شخص کو ضعیف العمری میں پنشن ملنے کی توقع ہوتی ہے وہاں کوئی شخص خرچ میں احتیاط و
کفایت شعاری سے کام نہیں لیتا۔ وقس علیٰ ہذا
(ب) تعیش و تفریح میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ بھی اس لئے بیکار جاتا ہے کہ اُس میں
زیادتی نہیں ہوتی بلکہ وہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔
(ج) البتہ باکار صرف وہ ہوتا ہے جس سے سرمایہ برابر بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً کلوں اور کارخانوں

کے قایم کرنے، یا آبپاشی و زراعت وغیرہ میں جو کچھ صرف ہوتا ہے اُس سے برابر منافع کا سلسلہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔

(د) پس ملک میں افزایش ثروت کا بھی ایک طریقہ ہے کہ سرمایہ صرف باکار مصارف میں لگایا جائے۔

ان حقایق سے بعض حضرات نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خیرات سرے سے ایک فضول بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال دو وجہوں سے باطل ہے۔ اوّل یہ کہ خیرات کی ہر صورت صرف بیکار کی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے طریقہ ایسے بھی ہیں جن سے اصل سرمایہ میں اضافہ کی توقع رکھنا بالکل درست ہوتی ہے۔ مثلاً بلافیس تعلیم عامہ کے لئے مدارس کھولنا، سیونگ بنک اور بیمہ کی کمپنیاں قایم کرنا، قحط کے زمانہ میں عمارات کا کام جاری کر دینا کہ ایک طرف یہ سب خیرات کی مُسلّمہ صورتیں ہیں، اور دوسری طرف ان سے ملک میں افزایش ثروت بھی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خیرات کا مقصد اصلی انسان کی راحت و مسرّت میں اضافہ کرنا ہے، اور ہر ایسی خیرات جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہو۔ بالکل جائز و مناسب ہے۔ عام اس سے کہ کاروباری حیثیت سے اس سے افزایش ثروت ہوتی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خیرات مُروّجہ کی بعض شکلیں ایسی ہیں جن سے مسرّت انسانی میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے گو ملک کی دولت میں نہیں ہوتا۔ مثلاً ایسے لوگوں کی امداد کرنا جو محض اتفاق سے لنگڑے، اندھے، یا اور کسی طرح پر اپاہج ہو گئے ہیں یا جنھیں قحط، سیلاب، وبا، جنگ وغیرہ نے مفلوک الحال بنا دیا ہے۔ یا مثلاً اسپتال جاری کرنا کہ ان سے ایک طرف تو مریضوں کو علاج میں سہولت ہوگی اور دوسری طرف ان کے امراض ملک میں متعدی نہ ہونے پائیں گے۔ غرض خیرات مُروّجہ کے ایسے متعدد طریقے ہیں جو خواہ غیر اقتصادی ہوں، لیکن اخلاقی حیثیت سے یقیناً محمود و لایق ستایش ہیں۔ خیرات کا یہ طریقہ بے شبہ مُضر ہے کہ ایک متمول شخص جو روپیہ کی افزایش سے اُکتا رہا ہے اُسے بے موقع و بے محل داد و دہش میں لُٹا رہا ہے اور یوں اپنی جماعت کو کاہل بنا رہا ہے۔ لیکن اس میں اور اس شخص میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو

افلاس، تنگدستی و پریشانی کو اُن کے بلوں میں ڈھونڈتا ہی اور جب تک اُنھیں دُور نہ کرلے چین نہیں لیتا۔ اقتصادیات نے اس میں شک نہیں اس موضوع پر بہت کاوش و تحقیق سے نظر کی ہے لیکن ہمیں تو اس سارے دفتر سے اُنھیں حقایق کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے جنھیں دو ہزار سال گزشتے سیرو قلم بند کر چکا ہی۔

میرے نزدیک خیرات کے مفید ہونے کے لئے اصلی ضروری شرط صرف یہ ہے کہ دینے والے کے ذہن میں فی الواقع لینے والے کو فائدہ پہنچانا مقصود ہو۔ لیکن افسوس ہی کہ مسیحی سخاوت و فیاضیوں میں بھی عنصر غائب رہا ہی مسیحیت نے خیرات کے مفہوم کو حقوق العباد میں نہیں، بلکہ حقوق اللہ میں رکھا، اُسی نے اس کی غایت رفاہ خلق نہیں رکھی بلکہ حصول ثواب رکھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اس طرف سے بالکل غافل ہو گئے کہ کون مستحق اعانت ہی اور کون غیر مستحق۔ ان کے لئے صرف اتنا جاننا کافی تھا کہ ہمیں نیت کا ثواب بہرحال ملے گا۔ اس لیے مستحق کی تلاش ایک محنت بے سود ہی۔ خیرات کفّارہ معاصی کا تو بہرصورت کام دے گی۔

اس طرز خیرات کے اثرات کا وجود گو شروع ہی سے تھا، البتہ وہ نمایاں چند صدیوں بعد ہوئے۔ تقسیم غلہ کا رومی دستور اقتصادی نقطہ خیال سے ہر طرح معیوب تھا جس کے مقابلہ میں مسیحیوں کا طریق خیرات بہت غنیمت معلوم ہوا۔ محنت و مشقت کی بہی پادری لوگ تعلیم دیتے تھے بلکہ آخر زمانہ میں تو بہت سے راہبوں نے اس کی ذلت کو لوگوں کے دلوں سے مٹانے کے لئے خود محنت مزدوری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ باایں ہمہ گرجا کی ان مُسرفانہ فیاضیوں کا یہ نتیجہ بغیر ظاہر ہوئے نہ رہ سکا کہ جوگیوں مصنوعی فقیروں اور پیشہ ور گداگروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا، اور راہبوں کی بے شغلی و کاہلی ایک شہرت عام کی شے ہو گئی۔ ہر مختیر شخص کی تعریف کئے جانے کا حشر یہ ہوا کہ ہزاروں موٹے تازے مسٹنڈے گداگر گلی کوچہ میں دکھائی دینے لگے اور خانقاہوں کے اجرا نے ان کی تعداد کو اور بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ ویلینٹینین ایک سخت قانون بنانے پر مجبور ہوا کہ مضبوط و توانا گداگروں کی سزا غلامی ہے۔ اب مقتدایان کلیسیا نے

یہ چاہا کہ گداگری کے دامن سے اس ذلت کے دھبہ کو دُور کریں چنانچہ خود ہزارہا راہبوں نے گداگری کا پیشہ اختیار کر لیا تاکہ اُمرا سے روپیہ لے کر غربا کو تقسیم کریں۔ اس طرز عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ جن ممالک میں خانقاہوں کی تعداد زائد تھی وہاں کی دولت و ثروت کو انھوں نے گویا بالکل چوس لیا۔ جس ملک کے ہزارہا مضبوط و توانا جوان کاروباری زندگی کی طرف سے بے التفات ہاتھ پیر نہ ہلانے اور مفت کی روٹیاں کھانے کے خوگر ہوں وہاں تمدن اور مادّی ترقیوں کا کیونکر گزر ہوسکتا ہے؟ مسرفانہ فیاضی درحقیقت ملک میں تمول نہیں بلکہ افلاس پھیلاتی ہے۔

انگلستان سے خانقاہوں کا استیصال اگرچہ بالکل بے موقع و بیجا طور پر ہوا تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اشخاص کے لئے خیانت و تغلب کے مواقع بہت کم ہوگئے اور ملک کے افلاس میں نمایاں کمی ہوگئی۔ غرض کلیسا کی خدمت خلایق میں جو عظیم الشّان کارنامہ ہیں اگرچہ ان کا پورا اعتراف ہے اور دنیا کی آرام رسانی و رفع تکلیف میں اُس کا جو اہم حصّہ ہے گو اس کا پورا احساس ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی بالکل غیر مشتبہ ہے کہ اس نے دنیا میں افلاس تمول سے زیادہ پھیلایا۔

بایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ خیرات پانے والے کے حق میں مفید ہو یا نہ ہو۔ دینے والے کے لئے بہرصورت ہوتی ہے۔ اس کا مصرف خواہ کتنا ہی بیجا ہو مگر اُس کے اخلاق پر یقیناً اس کا ایک بہتر و لطیف اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت قرون وسطیٰ کی پرآشوب تاریخ میں میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ شقاوت، جہالت، تعصّب و توحش کا دور دورہ تھا گرجا کی یہ سخاوت ہر شعبہ میں اپنی تاثیر دکھا رہی تھی۔ گریگوری آف ٹورس کی تاریخ سے بڑھکر ظلم و توحّش کے واقعات کا تسلسل اور کہاں ملے گا؟ لیکن اس دفتر مظالم کے شاید ہر صفحہ میں چند سطریں ایسے سلاطین و امرا د ولت کے ذکر کی ضرور ملتی ہیں جنھوں نے فقرا کی دستگیری کرنا اپنا مقصد زندگی قرار دے لیا تھا۔ خود محاربات صلیبی سے زیادہ پُرآشوب زمانہ اور کون ہوگا لیکن ظلم و شقاوت غلو و تعصب نفس پرستی و درندگی کی اس گرم بازاری میں بھی مسیحی دُنیا میں

خیرات کے مصارف بدستور اعلیٰ پیمانہ پر جاری تھے جن میں سے ایک اسپتالوں کا وجود تھا جن میں برص وجذام کا خاص طور پر علاج ہوتا تھا۔ سینٹ پیٹر نولیسکو شخصاً ظلم وشقاوت میں کسی سے کم نہ تھے۔ تاہم قیدیوں کی طرف سے فدیہ دینے میں سب سے آگے آگے تھے (جیسا کہ پیشتر بھی ذکر آچکا ہی) اسی طرح شین اونیل، آیرلینڈ کے مشہور سفاک امیر کی بابت مشہور ہے کہ باین سفاکی وخون آشامی، جب وہ کھانے پر بیٹھتا تو اپنے منہ میں لقمہ رکھنے کے قبل کھانے میں سے کچھ حصہ خیرات کے نام سے ضرور نکال دیتا اور دروازہ پر جو سایل بھی کھڑا ہوتا اُسی پہلے بھجوا کر تو دکھانا شروع کرتا۔

مُسرفانہ فیاضیوں کے نقصانات جب زیادہ پھیلنے لگے اور پیشہ ور گداگروں کی تعداد جب روز بروز بڑھنے لگی تو حکومت کو بار بار ان کی روک تھام کے لئے وضع قوانین کی ضرورت پیش آئی۔ سب سے پہلے نکولس آف پرفورڈ نے غیر مستحق گداگروں کے خلاف آواز بلند کی اور اصلاح کنیسا کے قبل ہی ان کے انسداد کی کچھ کارروائیاں شروع ہو گئی تھیں اس کے بعد انگلستان میں نہایت ظالمانہ قوانین باضابطہ طور پر پاس ہونے لگے کہ شاید ان کے خوف سے گداگری کا رواج کم ہو۔ ہنری ہشتم کے زمانہ میں پارلیمنٹ نے یہ قانون بنایا کہ خیرات کا ایک باقاعدہ نظام قایم ہے اُس سلسلہ سے الگ ہو کر جو کوئی متفرق طور پر گداگر کو کچھ دے گا اُس پر اُس شئے کا دس گُنا جرمانہ ہوگا اور مضبوط وتوانا گداگروں کی سزا پہلی بار یہ ہو گی کہ اُن پر تازیانے لگائے جائیں گے۔ دوسری بار یہ کہ تازیانہ بازی کے علاوہ ان کے بنا گوش کاٹ لی جائیگی اور سہ بارہ وہ قتل کردیئے جائیں گے۔ ایڈورڈ ششم کے زمانہ میں ایک قانون جو اگرچہ کچھ ہی عرصہ میں منسوخ بھی ہوگیا یہ پاس ہوا کہ ہر توانا گداگر جو روزگار میں لگنے سے بھاگے گا اُس کے پیشانی پر داغ لگایا جائے گا۔ اور جو شخص اس کی اطلاع دے گا اُس کی دو برس تک اُسے غلامی کرنا پڑے گی۔ اور اگر اس درمیان میں وہ مفرور رہنا چاہے تو پہلی مرتبہ کی سزا دائمی غلامی ہے اور دوسری مرتبہ کی سزا موت۔ اس اثنا میں مالک اس کا پورا مجاز ہوگا کہ اُس کے گلے میں

طوق آہنی ڈالے اسے پا بہ زنجیر رکھے اور اُس کے کوڑے لگائے۔ ایلزبتھ کے عہد میں پہلے
یہ قانون نافذ ہوا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا جو مضبوط شخص گداگری کرتا ہوا پایا جائے اُسے
تیسری مرتبہ کے جرم میں سزائے موت ملے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس قانون میں یہ ترمیم کی گئی
کہ اس کی سزا بجائے قتل کے دائمی غلامی یا جلاوطنی ہو گی، البتہ اگر وہ بھاگے یا واپس آنے
کی کوشش کرے تو سزا اسے موت ملے گی۔ اسی ملکہ کے زمانہ میں قانون مفلسان پر نظرثانی ہوئی
گو جیسا کہ مالتھس نے بعد میں ثابت کیا اس کا اثر کچھ یونہیں سا مفید پڑا۔ انگلستان کے علاوہ اور
ممالک میں بھی گداگری کے انسداد کے لیے سخت سخت قوانین پاس ہونے لگے میکسٹس پنجم
نے جس سے بڑھکر پاپایان روم میں کوئی مُدبّر نہیں ہوا ہے اپنے شہر میں اس کے روکنے کی
خاص طور پر کوششیں کیں۔ چارلس پنجم نے ۱۵۳۱ء میں گداگروں کے خلاف ایک سخت قانون
نافذ کیا۔ اسی طرح لوئی چہاردہم نے فرانس کے لئے بھی سخت قوانین جاری کئے۔ لیکن عجیب
بات ہے کہ ضوابط و قوانین کی مدد سے اس کی روک تھام کی تو بہت کوشش کی گئی۔ لیکن اٹھارہویں
صدی سے پیشتر کسی نے فلسفیانہ حیثیت سے اس کے اسباب پر غور کرنے کی کوشش نہ کی۔ سب سے
پہلے انگلستان میں لاک اور آئرلینڈ میں برکلے نے اس پر اجمالی نظر ڈالی۔ اُس کے بعد ۱۷۰۴ء
میں ڈیفو نے اس موضوع پر رسالہ لکھا کہ محض خیر و خیرات کوئی فیاضی نہیں جس میں اس نے
یہ دکھایا کہ انگلستان میں گداگروں کی تعداد کس قدر زاید ہے۔ حالانکہ یورپ کے دوسرے
ممالک میں مزدوری یہاں سے زیادہ گراں ہے۔ اور ۱۸۰۳ء میں ایک اور کتاب اس سے بہتر
رسی نامی کسی مصنف نے بہ مقام موڈینا شائع کی جس میں اُس نے نہایت تفصیل سے یہ دکھایا
کہ اٹلی میں گداگری کا پیشہ حد سے زیادہ پھیلا ہوا ہے اور اس کی علت خیرات بے محل ہے جو
مذہب کے اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اس سے بہت پیشتر ملحد مینڈیویل نے خیر و خیرات اور اعانت
غربا کے دستور پر اعتراضات کی بارش کر دی تھی۔ اس کے بعد مالتھس کی تحریروں سے اس موضوع
پر خوب موشگافیاں ہوئیں۔ لیکن میرے نزدیک مسیحیت پر کوئی اور نیا اعتراض وارد نہ ہو سکا

بجز اُن اعتراضات کے جن کا ذکر اوپر گزر چکا۔

غربا کے ساتھ مسیحیت کے حسن سلوک کی تاریخ ناتمام رہ جائے گی اگر اس میں اُس سوز و گداز کا ذکر نہ کیا جائے جس سے کلیسا نے انسانی متخیلہ کو متاثر کیا۔ ہماری اخلاقی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ہمارے افعال و مشاغل کا ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے بعد ہی تخیل کا درجہ ہے۔ تخیل کا اثر اخلاق پر عقاید و استدلالات سے کہیں زاید ہوتا ہے۔ اس لئے غربا کی تخیل کو صحیح اصول پر نشو و نما پہنچانا اُن کی ایک احسان عظیم کرنا ہے۔ اَن پڑھ دیہاتیوں کی مفلس جماعت جن کی نہ سوسایٹی وسیع ہوتی ہے نہ جن کی نظر بلند ہوتی ہے اور جو بیچارہ کولھو کے بیل کی طرح ہمیشہ ایک محدود دائرہ میں چکر لگانے پر مجبور رہتے ہیں اور جن کے سامنے کوئی مستقبل اپنی خوش آیند توقعات کے ساتھ موجود نہیں ہوتا اُن کی تخیل کو وسیع کرنے اور ان کے دل کو خوش رکھنے کا مذہب سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ان بدنصیبوں کو اگر کہیں راحت و تسکین نصیب ہو سکتی ہے تو مذہبی خوش اعتقادیوں اور وہم آرائیوں ہی سے اس نکتہ سے مقتدایان ملت شرک بھی غافل نہ تھے۔ ان کے یہاں بھی ہر دہقان کا یہ اعتقاد تھا کہ فصل و موسم، بارش و پیداوار، غرض اس کی کھیتی سے متعلق ہر چیز کا ایک مخصوص دیوتا ہے اور وہ تمام دن ان دیوتاؤں کی معیت میں رہتا ہے۔ مسیحیت نے اس میں اتنی اصلاح کی کہ تخیل میں سوز و گداز پیدا کر دیا تاکہ ساتھ ساتھ اخلاقی زندگی کی بھی درستی ہوتی جائے۔ خود اپنے بانی یعنی مسیح کی مظلومیت، مریم کی زندگی کی دلگدازی۔ اور اور انبیا، اولیا، کی مظلومیت و بیکسی پر جو کتب مقدسہ میں بار بار زور دیا گیا، اُس کا منشا صرف یہ تھا کہ مظلومیت و تحمل شداید کی تہیاؤ مسیحی زندگی کی جزو بن جائیں اور غربا اپنی حالت پر مطمئن اور ان سے صبر حاصل کرتے ہیں۔ گرجا کے اندر، نماز و عبادت کے وقت، شادی کی تقریب پر، تکفین و تدفین کے موقع پر، قبرستان میں، نظروں کے سامنے پہاڑ و سمندر کے سفر میں، جلوت و خلوت میں، غرض غربا کو ہر جگہ جب اپنے سامنے اور گرد و پیش مظلومیت و بیکسی کی مقدس تصویریں نظر آتی تھیں تو لازمی طور پر ان کے تقدس و احترام کا نقش اُن کے دلوں میں پیٹھ گیا اور انھیں بجائے تکلیف کے اپنی مصیبتوں سے

تسکین و تشفّی حاصل ہوتی تھی۔

یورپ کی تاریخ اخلاقی پر کلیسا کی فیاضیوں کے جو جو اثرات پڑے انھیں کافی تفصیل سے دکھایا جاچکا۔ جہاں جہاں اثرات مضر ہوئے ہیں۔ میں نے اُن سے اغماض نہیں کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ گرجا کے احسانات کا پلہ بہت ہی وزنی رہا ہے۔ قلوب میں حیات بشری کا تقدس واحترام، طفل کشی واسقاط کے دستور کی بیخکنی، غلاموں کے مرتبہ کی بلندی، اور بالآخر اُن کی آزادی، سیافی کے خونریز مناظر کا استیصال خیرات کا ایک اعلیٰ و وسیع پیمانہ پر اجرا، غربا کے تخیل کی اصلاح و تقویت، یہ تمام کارنامے ایسے ہیں کہ قدما ان سے بڑھکر کیا، ان کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ انھوں نے دنیا کی مسرت و راحت میں غیر معمولی اضافہ کیا اور شاید اس سے بھی زیادہ پاکیزگی اخلاق میں کیا۔ اخلاق کے جن شعبوں کا تعلق گداز و درد اور راحت و ہمدردی سے ہے وہ تو گویا تمامتر مسیحی معیار اخلاق ہی کی تخلیق ہیں۔ قرون اولیٰ میں مسیحیت کی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم قایم رہی۔ لیکن تیسری صدی سے جبکہ رہبانیت کا زور ہوا، اس میں کافی فرق پڑگیا اور اب اس کی توجہ دوسری چیزوں کی طرف بٹ چلی۔

فصل (۵)

رہبانیت کی تاریخ

ٹرٹولین دوسری صدی عیسوی میں لکھتا ہے کہ ہم لوگوں کا طرز معاشرت ہندوستان کے جوگیوں سے کس قدر مختلف ہے۔ وہ لوگ دنیا سے الگ تھلگ جنگل و بیابان میں تنہا رہا کرتے ہیں ہم لوگ برابر دنیا کے کاروبار میں شریک اور مشرکوں تک سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ ٹرٹولین کے یہ الفاظ اگرچہ بیان واقعہ کے لحاظ سے صحیح ہیں کیونکہ مسیح کے دو سو سال بعد تک کلیسا میں

کوئی راہب نہ تھے، تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ جو جذبہ راہبانہ زندگی کو اختیار کرنے کا محرک ہوتا ہے۔ اس کا تخم اس سرزمین میں شروع ہی سے موجود تھا۔ رہبانیت کے اصل الاصول یہ دو ہیں۔ عورت سے ہم بستری نہ کی جائے۔ دنیا کے تعلقات کو ترک کیا جائے۔ اب غور کرو کہ ان میں سے کون خیال ایسا ہے جو ابتدا ہی سے کلیسا کی زندگی میں موجود نہ تھا؟ دوشیزگی کا احترام عظمت و تقدس روز اول سے مسیحیت کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اور یہ صاف رہبانیت کے پہلے اصول کی تائید تھی۔ رہا دوسرا اصول سو اس بارہ میں بھی مسیحیوں کو شروع ہی سے تاکید تھی کہ اپنے گرد و پیش ملک و وطن کے غیر مسیحیوں سے علیحدہ رہیں۔ اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنی امتیازی حیثیت کو قایم کرنے کے لیے مسیحیت کے عروج و اوج کے زمانہ میں بھی اپنی علیحدگی و خلوت پسندی کو جو ابتداءً عام طرز معاشرت تھی برقرار رکھا یہ سبب بجائے خود کافی تھا۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ رہبانیت کی ہوا اُس وقت ساری دنیا پر محیط ہو رہی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ کوئی ایک خاص جماعت اس عام وبا کے اثرات سے غیر متاثر رہے۔ خود یہودیوں میں حالانکہ ان کی شریعت اس کے بالکل مخالف تھی ایک فرقہ ایسا موجود تھا جو بالکل خانقاہ نشین تھا، اور تجرد و ترک تعلق کی زندگی بسر کرتا تھا۔ رومہ کا یہ حال تھا کہ گو اصولاً وہ رہبانیت کا بالکل مخالف تھا تاہم اُس کے حکماء متاخرین اپنا رجحان اسی طرف ظاہر کرنے لگے تھے بلکہ کلبیہ تو علانیہ ترک دنیا کی تعلیم دینے لگے تھے۔ مصری فلسفہ جو چند روز میں یورپ پر حاوی ہو گیا تھا۔ یونانی فلسفہ سے بھی زیادہ اسی زاہدانہ طرز زندگی کا مؤید تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد فرقہ جن کے عقاید کے ڈانڈے مسیحی عقائد سے ملے ہوئے تھے اسی طرز زندگی کی تائید کر رہے تھے۔ غرض دنیا رہبانیت کے استقبال کے لیے ہمہ تن تیار تھی اور مسیحیت میں یہ استعداد تو شروع ہی سے موجود تھی۔ صرف قوت سے فعل میں منتقل ہونے کی ضرورت تھی اور یہ انتقال ڈیسین تعدیوں کے زمانہ میں واقع ہو گیا۔ روایت ہے کہ سب سے پہلے راہب پال نے صحرا میں جا کر سکونت اختیار کی، اس کی تقلید

انٹونی نے کی اور پھر تو کچھ روز صحرا میں اچھی خاصی آبادی قایم ہوگئی۔ مشرکانہ تعدیوں کا مسیحی نفوس پر ایک اثر یہ بھی پڑا کہ جو شخص مذہب کے لئے جتنی زیادہ تکالیف اٹھاتا ہے اُسی قدر اُسے ثواب ملتا ہے۔ پس تعدیوں کے خاتمہ پر جب مظالم برداشت کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا تو خوش اعتقاد ہستیوں نے جنگل میں جا جا کر طرح طرح کی تکالیف اپنے لئے پیدا کیں۔ لوگوں کی تخیل کو اس طرز زندگی سے خاص طور پر کوشش کر کے متاثر کیا گیا۔ نئے لوگ اس میں اہتمام سے بھرتی کئے جانے لگے اور اس داخلہ میں عورتوں نے پوری سرگرمی سے کوشش شروع کی۔ عورت پر جب مذہب کا رنگ غالب آجاتا ہے تو وہ کسی محبت کسی رشتہ کا لحاظ نہیں کرتی۔ کسی گزشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بت پرست شوہروں کی مسیحی بیویاں اپنے شوہروں سے چھپا چھپا کر مسیحیوں سے ربط رکھتی تھیں۔ یہی صورت اب بھی پیش آئی۔ راہبوں نے اپنا جادو عورتوں پر ڈالا اور مائیں چرا چرا کر اپنی اولاد کو راہبانہ زندگی کے لئے تیار کرنے لگیں۔ باپ اپنی اولاد کو کسی ملکی سیاسی یا جنگی خدمت کے لئے تجویز کرتا ہی رہ جاتا تھا اور اُدھر ماں سب ٹھیک ٹھاک کر کے اُس کا ہاتھ کسی راہب کو پکڑا دیتی تھی۔ بیسیوں راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے۔ جمہور پر اب خطیبوں کے بجائے واعظوں کا اثر تھا اور ایسے ایسے ذی اثر واعظین جیسے۔ ایمبروز، اگسٹائن، کریزوسٹم، بیسل، دگری گوری تمامتر رہبانیت کی حمایت میں وعظ کرتے تھے۔ پھر ہر عمل کے لئے ردّعمل بھی ضروری ہوتا ہے ملک کے عام تعیش وانہماک دنیا داری کے خلاف ردّعمل ہونا لازمی تھا اور وہ یوں ہوا کہ صدہا افراد شہر کی زندگی سے اُکتا کر جنگل میں جا کر بس گئے۔ بہت سے غلام و مجرمین بھی قانونی گرفتوں سے بچنے کے لئے وہاں جا کر آباد ہوگئے۔ چند روز کے بعد رہبانیت کے وجوب واستحسان پر مذہبی استدلالات بھی قایم ہونے لگے۔ اس اعتراض کے جواب میں کہ "خود مسیح تو تارک الدنیا نہ تھے۔ بلکہ اچھی خاصی طرح اسی دنیا کے کاروبار میں رہتے تھے، ان کے بعض اتباع مخصوص میں عورتیں تھیں اور خود حضرت نے اپنے فرض تبلیغ وارشاد کی ابتدا ایک شادی کی تقریب سے کی تھی" موئیدان

رہبانیت مسیح کے تجرد، مریم کے کنوارپن، اور نوجوان اُمرا کو مسیح جو خاص طور پر پند و نصائح کرتے تھے، ان چیزوں کو سنداً پیش کرتے تھے۔ حواریان اعظم میں سینٹ پیٹر (پطرس) کا جو درجہ ہوا ہے وہ مخفی نہیں، حالانکہ وہ متاہل تھے۔ اس اعتراض کی تاویل یوں کی جاتی تھی کہ وہ شرف حواریت حاصل کرنے کے بعد کبھی اپنی بیوی سے ہم بستر نہیں ہوئے، بلکہ دیگر حواریوں کی طرح ہمیشہ ہم بستری سے محترز رہے۔ سینٹ پال خود بھی غالباً مجرد تھے اور تجرد کی تائید میں عجیب و غریب دلایل پیش کرتے تھے۔ اس طرز استدلال کی ایک دلچسپ مثال سینٹ جروم کے الفاظ میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کشتی نوح پر پاک جانور جو سات سات کی تعداد میں سوار کئے گئے اور ناپاک جانوروں کے جوڑے لئے گئے، اس کے ذریعہ سے خدا نے تجرد کی افضلیت دکھادی پھر جو جانور جفت عدد میں لئے گئے اُن کا بھی ایک ہی ایک جوڑا رکھا گیا تاکہ ازدواج مکرر کی معصیت کبیرہ کا کبھی ارتکاب نہ ہو سکے اس زمانہ سے تمام دنیا کی مسیحیت کے لئے اُسوہ حسنہ سینٹ جیمس کا وجود قرار پایا جس کی ذات میں تمام فضائل انسانی مجتمع تھے اور جو رحم مادری سے مقدس و مطہر پیدا ہوا تھا۔" اس کے اوصاف یہ تھے کہ

"وہ شراب مسکرات و لحم حیوانات سے محترز تھا۔ اُس کے سر پر کبھی اُسترہ نہیں لگا۔ وہ نہ کبھی حمام میں گیا اور نہ اپنے جسم میں روغن لگنے دیا، اُس نے ہمیشہ سوتی کپڑے پہنے۔ اُون کی پوشاک کبھی نہیں پہنی۔ گرجا کے اندر وہ روز تنہا جایا کرتا۔ اور گھٹنوں کے بل جھک کر گھنٹوں خلقت کی مغفرت کی دُعائیں کیا کرتا۔ اس عمل کی مزاولت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُس کے گھٹنے اونٹ کے گھٹنوں کی طرح سخت ہو گئے"۔

اس تحریک رہبانیت کی اشاعت۔ گبن نے خوب کہا ہے کہ اُسی قدر تیز یا اُسی قدر سست تھی، جتنی خود تحریک مسیحیت کی تھی۔ اُس وقت کے کُل زاہدوں کا مجموعی شمار ظاہر ہے کہ مؤرخین کے اختلاف بیان کے باعث قطعی طور پر نہیں معلوم ہو سکتا۔ تاہم اس کا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکتا ہے۔ سینٹ پیکومیس کے زیر تربیت (۷۰۰۰) راہب تھے۔ سینٹ جروم کے زمانہ میں ایسٹر کی تقریب پر

تقریباً ..... ۵ راہبوں کا مجمع ہوتا تھا۔ چوتھی صدی میں اکیلے صحرائے نیٹریا میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں .... ۵ راہب تھے۔ مصر کے ایک شہر کی ساری آبادی انھیں لوگوں کی تھی اور ان کی تعداد ....۱ راہبوں اور ۲۰۰۰۰ کنواریوں کی تھی۔ سینٹ سرپین کی ماتحتی میں .....۱ راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں و راہبوں کی تھی۔ مصر رہبانیت کا وطن اصلی تھا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت میں یہ ہوا تمام مسیحی ممالک میں چل گئی۔ سینٹ زینو، وسینٹ ھتینیس نے اسے اٹلی میں روشناس کیا اور پھر سینٹ جروم نے اسے یہاں خوب ترقی دی سینٹ ہلیرین نے اس کی تخم ریزی فلسطین میں کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہزار ہا شخص اس حلقہ میں داخل ہو گیا اور اس کا دائرہ سیاپرس تک وسیع ہو گیا۔ آرمینیا اور اس کی مضافات میں اسے سینٹ یوسٹیتھیس نے پھیلایا اور دریائے یوکسین کے کنارہ سینٹ بیسل نے گال میں اس کی بنا۔ سینٹ مارٹن کے ہاتھوں پڑی اور جب انھوں نے وفات پائی تو ....۲ راہبوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور صدہا نامعلوم الاسم مشنریوں نے اسے حبش، جزائر بحر روم، آئرلینڈ و ویلس میں رواج دیا۔

اسی سلسلہ میں حیرت انگیز صرف ان تارکان دنیا کا شمار ہی نہیں۔ بلکہ اس سے عجیب تر یہ کہ جو لوگ اپنے مزاج وطبیعت کے لحاظ سے اس طریق زندگی کے دشمن شدید تھے وہ تک ان لوگوں کا احترام واکرام کرتے تھے۔ سینٹ آگسٹاین جو تجرد کے خطرات ونقصانات سے پوری طرح واقف تھا سینٹ ایمبروز جو ایک دوراندیش مدبر تھا سینٹ جروم وسینٹ بیسل جو عالم متبحر تھے، سینٹ کریزوسٹم جو جمہور رومہ پر ایک زبردست خطیبانہ اثر رکھتا تھا، یہ سب کے سب اس راہبانہ طریق زندگی کے پُرجوش وکیل ہوئے ہیں۔ اور سینٹ آرسینس جو مدتوں شاہ ارکیڈین کے دربار میں رہ چکا تھا، خود ایک زبردست زاہد مرتاض ہو گیا۔ ہزار ہا زائرین ان بزرگان صحرا کے شوق زیارت میں بیاباں نوردی کرتے پھرتے اور لوٹ کر ان کے خوارق عادت

کرامات و معجزات کی عجیب عجیب داستانیں ملک میں پھیلاتے۔

فصل (۶)

راہبان صحرا

دُنیا کی تاریخ اخلاق میں شاید اس وبائے رہبانیت سے زیادہ پُر درد پُر اثر کوئی داستان نہیں
غضب ہے کہ وہ قومیں جو فلاطون و سسرو کے خُم کدہ سے سرشار تھیں اور جن کی نظروں کے
سامنے سقراط و کیٹو کی پاک و محترم سیرتیں موجود تھیں اب ان کا مطمح نظر ان کا نصب العین
ایک ایسا حقیر و دنی و فرومایہ مراقی وجود رہ گیا تھا جو جہالت کا پُتلا، حُبِّ وطن سے معرّا اور
لطایف خلقی سے بے بہرہ ہو جس کی زندگی تمامتر ظالمانہ خود آزاریوں کے لئے وقف اور
جسے شدت وہم و جنوں سے خود اپنے سایہ پر دیو جن کا گمان ہوتا ہو۔ دو چار سال نہیں کوئی
پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی سینٹ جروم کس مزہ سے
بیان فرماتے ہیں کہ ایک راہب صاحب نے ۳۰ سال تک صرف نان جویں اور خاک آلود
پانی پر بسر کی تھی۔ ایک اور بزرگ مدة العمر ایک تنگ و تاریک غار میں رہا کئے اور کبھی
روزانہ غذا میں پانچ انجیروں سے زیادہ نہ کھایا۔ ایک تیسرے بزرگوار ان سے بھی بڑھ چڑھ کر
تھے۔ یہ حضرت سال بھر میں صرف ایک بار ایسٹر کے دن اپنی حجامت بنواتے تھے۔ نہ کبھی
کپڑے دھوتے تھے اور نہ کبھی لباس بدلتے تھے، تاوقتیکہ وہ خود ہی پارہ پارہ ہو کر جسم سے
علیحدہ نہ ہو جائے آنکھوں کی بصارت نے شدت فاقہ کشی سے جواب دیدیا تھا اور جسم کی
جلد مثل پتھر کے سخت اور کھُرکھُری ہو گئی تھی۔ اسی طرح سینٹ میکیریس اسکندروی کی بابت
مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کئے تاکہ اُن کے برہنہ جسم کو زہریلی
مکھیاں ڈسیں۔ نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک مَن لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ ان کے

مُرید سینٹ یوسیبس اس سے بھی بازی لے گئے تھے کہ یہ حضرت ہمیشہ تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے۔ سینٹ سیبنس ہمیشہ وہ غلہ استعمال کرتے تھے جو ایک مہینہ تک پانی میں پڑے پڑے سڑ گیا ہو۔ سینٹ میرین نے چالیس شبانہ روز خار دار جھاڑیوں کے اندر گزارے اور چالیس سال تک سونے کے وقت کبھی لیٹے نہیں۔ سینٹ پیکومیس بھی پندرہ سال تک اس ریاضت پر عامل رہے۔ بعض حضرات نے سینٹ مارکین کی طرح یہ عادت ڈال لی تھی کہ رات دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے اور وہ بھی صرف اس مقدار میں کہ رشتۂ حیات منقطع نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اسی جماعت کے ایک رُکن کی بابت منقول ہے کہ ان کی روزانہ غذا صرف ۳ چھٹانک روٹی اور چند جڑی بوٹیاں تھیں وہ کبھی بستر یا چٹائی پر نہیں سوئے بلکہ کبھی استراحت کے طریقہ پر لیٹے تک نہیں یہاں تک کہ اکثر فرط بیداری سے یہ حالت ہوتی کہ کھانا کھاتے کھاتے انہیں نیند کا جھونکا آجاتا اور مُنہ سے نوالہ بے اختیار گر جاتا۔ بعض حضرات ایک دن ناغہ دے کر کھانا کھاتے۔ بلکہ ایک گروہ کی بابت تو یہاں تک مشہور ہے کہ ایک ایک ہفتہ تک وہ مُنہ میں دانہ نہیں ڈالتے تھے۔ چنانچہ سینٹ میکریس کی بابت روایت ہے کہ وہ ہفتہ بھر فاقہ کرتے تھے اور اتوار کے دن چند کچی جڑی بوٹیاں کھاتے تھے اسی طرح ایک اور مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے بلکہ جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے اور ہفتہ میں صرف ایک بار کھانا کھاتے اور وہ کھانا کیا ہوتا؟ صرف وہ تبرکات جو گرجا سے اتوار کے روز لائے جاتے تھے۔ راہبوں کے مسکن علی العموم اُس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنوئیں یا قبرستان۔ بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے۔ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے۔ عراق و شام میں ایک اور طائفہ اہل زہد کا رہتا تھا جس کا مسلک

یہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ کھلے میدانوں میں پہاڑوں کی وادیوں میں رہتے تھے اور گوشت یا روٹی کے بجائے صرف گھاس کھاتے تھے۔ جسم کی طہارت، روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرتبۂ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے۔ اُسی قدر وہ مجسمۂ عفونت و غلاظت ہوتے جاتے تھے۔ سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انٹونی، بہ ایں کبیر سنی، کبھی مدۃ العمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا۔ سینٹ پمین میں اس قدر استقلال نہ تھا اُس سے آخر عمر میں ایک بار یہ گناہ سرزد ہو گیا تھا اور جب اپنی برئیت میں اُس نے یہ کہا کہ میرا مقصود جسم کشی نہیں بلکہ جذبات کشی ہے تو زاہدین و راہبین کی جماعت فرطِ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ سینٹ ابرہام جن کی بابت خوش عقیدہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ حُسن و جمال میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے اور اُن کے چہرہ سے نورِ باطن ٹپکتا تھا اپنی وضع کے ایسے پکے تھے کہ پچاس سالہ مسیحی زندگی میں انھوں نے اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی کبھی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ سینٹ امین نے کبھی اپنے تئیں برہنہ نہیں دیکھا۔ سِلویا ایک مشہور دوشیزہ ہوئی ہیں۔ ان کا سن شریف ساٹھ سال تک پہنچ گیا تھا اور بارہا کثافت کے باعث سخت بیمار ہوئیں۔ لیکن کبھی بجز اپنی انگلیوں کے اور کسی حصۂ جسم میں پانی نہیں لگنے دیا۔ سینٹ یوفریکسیا ۱۳۰ کنواریوں کی ایک جماعت میں شریک ہوئی جن کا اصول یہ تھا کہ یہ کبھی اپنے پیر نہیں دھوتی تھیں اور غسل کے نام سے تو لرز اُٹھتی تھیں۔ ایک زاہد صاحب ایک بار رستہ میں چلے جاتے تھے کہ حضرت کی نظر اپنے عکس پر پڑی تو یہ دیکھا کہ جنگل میں ان کے آگے آگے ایک ننگا دھڑنگا مرد جس کا سارا جسم شدت کثافت و غلاظت سے سیاہ پڑ گیا ہے چلا جا رہا ہے مگر خوش عقیدگی کا بھلا ہو کہ حضرت اسے بجائے اپنا عکس سمجھنے کے یہ سمجھے کہ کوئی شیطان وسوسہ اندازی کے لئے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ مصری سینٹ میری اپنے زمانہ میں ایک بہت حسین عورت تھی اس نے اپنے گناہوں کا کفارہ یوں کیا کہ پورے ۴۷ سال تک کبھی اپنے کسی حصۂ جسم کو نہیں دھویا۔ بعض زاہد کبھی جرأت کر کے صفائی جسم پر اگر کبھی توجہ کرنے بھی لگتے تو اُن پر سخت لعن طعن ہوتی۔ راہب الگزنڈر کس تاسف و تحیر سے

فرماتے ہیں کہ "ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں"۔ اسی ضمن میں ایک روایت یہ مشہور ہے کہ ایک صحرا کے خانقاہ نشین زاہدوں کو پانی کی سخت تکلیف تھی تھیوڈوسیس نے جناب باری میں اس کی فریاد کی۔ دُعا قبول ہوئی اور ایک چشمہ جاری ہو گیا۔ پانی دیکھکر زاہدوں کے دل میں لہر آئی اور وہ اس میں غسل کرنے لگے۔ ابھی ایک ہی بار غسل کیا تھا کہ غضب الٰہی نازل ہوا یعنی چشمہ بند ہو گیا توبہ و استغفار۔ کفارہ و روزہ شروع ہوئے۔ لیکن سال بھر تک یہ تمام چیزیں بے اثر رہیں۔ آخرکار جب حمام مسمار کر دیا گیا تب چشمہ دوبارہ رواں ہوا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی روایات منقول ہیں۔ مگر شاید سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ سینٹ سیمو کا ہے جس کے متعلق یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رہبانیت کی تاریخ میں اس سے بڑھکر غلاظت و نجاست کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ حضرت نے اپنے جسم کے گرداگرد ایک رسی اس قدر مضبوط اور کس کرکے باندھی تھی کہ وہ گوشت کے اندر پیوست ہو گئی تھی اور سارا گوشت سڑ گیا تھا۔ یہ سڑاند اس قدر تیز تھی کہ پاس بیٹھنے والے ناک نہیں دے سکتے تھے اور زخموں میں سے کیڑے برابر ٹپکا کرتے تھے۔ بعض دفعہ آپ خانقاہ کا قیام چھوڑ کر ایک خشک کنوئیں میں جو شیاطین کی بستی سمجھا جاتا تھا، سکونت اختیار فرماتے تھے۔ حضرت نے تین منارہ بنوائے تھے جن میں سے ایک ۶۰ فٹ بلند اور صرف ۲ گز کے دور کا تھا آپ اس کے اوپر ۳۰ سال تک سکونت گزیں رہے اور اکثر اس تیزی سے سجدہ کرتے رہے کہ ایک شخص نے جب ان سجدوں کو شمار کرنا چاہا تو اس نے ۱۲۴۴ تک شمار کیا تھا کہ تھک گیا۔ یہی بزرگ پورے سال بھر تک صرف ایک پیر کے بل کھڑے رہے اور دوسرا پیر زخموں اور ناسوروں سے چُور ہو گیا تھا لیکن ایک مُرید کو جو ہر وقت پاس ہی رہتا تھا یہ حکم تھا کہ جوں ہی اس زخم سے کوئی کیڑا نکل کر گرے اُسے پھر اُٹھا کر اُسی جگہ پر رکھدے اور خود اُس کیڑے سے فرماتے جاتے تھے

کہ خدا نے تجھے جو رزق دیا ہے اسے کھا"۔ ان حالات کو سن سن کر صدہا زائرین دُور دراز ممالک سے اس کی زیارت کو آتے تھے اور جب ان کا وصال ہو گیا تو زاہدین و راہبین کے ایک جم غفیر نے جنازہ کی متابعت کی۔ ان کے تعمیر کردہ ستون کے اوپر ایک ستارہ درخشاں طلوع ہوا۔ سب نے انھیں ایتٌ مِنْ اٰیاتِ اللہ قرار دیا اور صدہا راہبین ان کے نقش قدم کی پیروی پر کمربستہ ہو گئے۔

راہبوں کے سوانح زندگی یہاں جو زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے نزدیک درج۔ خلاق پر جتنی ان سے روشنی پڑتی ہے اتنی کسی اور شئے سے نہیں پڑتی۔ خالص تاریخی حیثیت سے ممکن ہے کہ یہ کچھ بھی اہم نہ ہوں۔ لیکن اخلاقی حالت کا سراغ لگانے کے لئے بیحد اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے یہ بے شبہ نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے اعمال و افعال کیا تھے۔ تاہم ان کی اندرونی زندگی کا اگر پتہ چل سکتا ہے تو اسی ذریعہ سے۔ پادریوں کی تصانیف گرجا کے فرامین اور اور تحریروں سے صرف ظاہری معلوم ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اہل کلیسا اپنے تئیں دنیا کے سامنے کس رنگ میں ظاہر کرنا پسند کرتے تھے لیکن اس امر پر کہ وہ فی الواقع کیا تھے اگر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے تو صرف ان کی سوانح عمریوں پر نظر کرنے سے اُن کے اعمال دست و زبان کا سراغ اور طریقوں سے بھی چل سکتا ہے لیکن اعمال دل و دماغ کا صرف اسی ایک طریقہ سے اور اس ذریعہ سے جو کچھ حالات ہم تک چشم دید گواہوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں گو ان کی جزئیات و تفصیلات میں رنگ آمیزیوں سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ بحیثیت مجموعی یہ بالکل صحیح و مطابق واقعہ ہیں۔ خود آزادیوں کی چند مثالیں جو اوپر درج کی گئی ہیں انھیں صرف مشتے نمونہ از خروارے سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ اس قسم کے واقعات اگر ہم تفصیل سے درج کرنا چاہیں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں اور ہو جائیں کیا معنی، واقعۃً تیار ہوئی ہیں۔ سینٹ بنڈیکٹا کے وقت تک یہ معیار اخلاق تمام دنیائے مسیحیت پر مسلط رہا کہ جو جتنا زیادہ جسم کو مبتلائے آزار و تکلیف رکھے گا

اُسی قدر روحانی ترقی حاصل کرے گا۔ مغرب کی آب وہوا ایسی نہ تھی کہ وہاں کے راہبین عملاً مصری راہبوں کا زہد وریاضات میں مقابلہ کرسکتے۔ تاہم معیار اخلاق ان کا بھی یہی تھا اور وہ عملی زندگی میں اپنے ریاضتوں کی کمی کی تلافی معجزات وکرامات میں افراط کے ذریعہ سے پوری کردیتے تھے۔ سینٹ جروم اور اُس کے بعض رفقا نے زہد وریاضات کی ان ناقابل برداشت سختیوں کو کسی قدر ہلکا کرنا چاہا جن کے نتائج جنون خودکشی کی شکل میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ اور جن کے باعث بیسیوں راہب گرجائی حکومت سے آزاد ہوکر ادھر اُدھر اب مانگتے پھرتے تھے۔ لیکن ان مصلحین کی کوششیں کچھ زیادہ چلنے نہ پائیں۔ اکثر راہبوں نے تاڑ کے پتوں کی چٹائیاں بنانے کو اپنا ذریعۂ معاش قرار دیا لیکن بادیہ نشینی نے ان کی ضروریات زندگی تو کچھ رکھی ہی نہ تھیں اس لئے رفتہ رفتہ انھوں نے یہ پیشہ بھی ترک کردیا۔ اور اب سب سے زیادہ تقدس واحترام کا حقدار وہ سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ خود آزاریوں کا عادی ہو۔ لیکن اس اخلاقی معیار کی یکسانیت ویکرنگی کے باوجود اختلاف طبائع بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا۔ مثلاً بعض جاہل، کاہل، اپاہج وکندۂ ناتراش راہب ایسے بھی ہوتے تھے جو دنیا کی جد وجہد سے رہبانیت کی پناہ میں آجانا غنیمت جانتے تھے اور اپاہج پن کی زندگی پڑے پڑے گزارا کرتے تھے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو خوشنما کیاریاں اور چمن وغیرہ کے بنانے میں مشغول رہتے تھے۔ سینٹ سراپین کے متبعین کاشتکاری میں مصروف رہتے تھے اور غربا کے لئے غلہ کی کثیر مقدار مفت روانہ کیا کرتے تھے۔ ایک راہب زندہ دلی میں اس قدر مشہور تھا کہ لوگ اُس کی صورت دیکھتے ہی اپنے غم وحزن کو بھول جاتے تھے۔ لیکن یہ ایک استثنائی مثال تھی۔ ورنہ عام حالت یہ تھی کہ راہب کا حجرہ ایک دہشت کدہ رہا کرتا تھا۔ شیاطین کے وسوسہ اندازی کا خوف عالم آخرت کی دہشت، آہ واشکباری، نالہ وفریاد یہ ان زاہدوں کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ علم وتعلیم کے تذکرہ گویا بالکل ممنوع تھے سینٹ جروم کا مقولہ تھا کہ "راہب کا فرض تعلیم دینا نہیں بلکہ رونا رُلانا ہے۔"

ایک بڑی بات یہ تھی کہ التباس حواس کے اثر سے دیو و شیاطین کی خیالی صورتوں کا
نظر آنا برگزیدگی و تقدس کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور چونکہ تعلیم یافتہ دماغوں پر
یہ اثر کم ہوتا تھا۔ اس لئے راہبین کی جماعت میں جہلا اور جہالت کو خاص فروغ حاصل تھا
سینٹ انٹونی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں محض اس بنا پر پڑھنا چھوڑ دیا تھا کہ پڑھنے
لکھنے میں دوسرے طالب علموں کا ساتھ ہوگا اور اُن سے مکالمت و مجالست کرنا پڑے گی
سینٹ جروم ایک زمانہ میں سسرو کے بڑے معترف تھے۔ خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک
روز شب کے وقت انھیں فرشتہ آسمان پر مسیح کے سامنے اُٹھا لے گئے اور وہاں یہ فرد جرم
عاید کی گئی کہ یہ مسیح کے بجائے سسرو کے کلام کو پڑھتا ہے۔ چنانچہ اس جرم پر فرشتوں نے
اچھی طرح ان کی تازیانہ بازی کی۔ ان کے اوپر ان کے رفقا کی طرف سے بھی ایک خاص اعتراض
یہ ہوتا تھا کہ وہ مشرک مصنفوں سسرو، ورجل وغیرہ کو پڑھتے اور ان کی تعلیم دیتے ہیں
بعض راہبوں کا کتب خانہ تمامتر انجیلوں پر مشتمل ہوتا تھا، جسے وہ فروخت کرکے غربا کی اعانت
کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک راہب نے کسی دوسرے راہب کے پاس چند کتابیں رکھی ہوئی دیکھ لیں
اور اس پر وہ نہایت برہم ہوا۔ ایک اور راہب کی بابت روایت ہے کہ وہ علم اللسان کا بڑا ماہر
تھا۔ راہب ہو کر اُس نے اس گناہ کا کفارہ یوں کیا کہ ۳۰ سال تک سکوت مطلق اختیار کئے رہا۔

یہ طرز معاشرت و زندگی رکھنے والوں کے لیے معجزات و کرامات میں کوئی استبعاد
باقی ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ اور التباس حواس کے جتنے عناصر ہیں وہ سب کے سب آکر اس طرز معاشرت
میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ جہالت وہم پرستی، خلوت نشینی، استہلاک زہد و ریاضت اور دیو و شیاطین
کے وجود پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد، ان سب چیزوں کے مجموعہ کا قدرتاً یہ اثر پڑتا تھا کہ خیالی
صورتیں حقیقی نظر آنے لگتی تھیں۔ پھر قبرستانوں میں لاشوں کے انبار کے درمیان سکونت
اختیار کرنے سے اور شب تاریک سنسان ولق و دق صحرا میں تنہا ریاضت کرتے وقت جبکہ
کان میں صرف وحشی درندوں کی آواز ہر طرف سے آتی ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں کثر ان

عابدوں کا واہمہ یہاں تک زور پکڑتا تھا کہ شہوت انگیز یا دہشت ناک مناظر متشکل ہو ہو کر انکی آنکھوں کے آگے چلتے پھرتے نظر آنے لگتے تھے۔ متخیلہ پر فوق الحد بار ڈالنے اور جسم کو بیحد کمزور و ناتوان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف و متضاد جذبات مثلاً فرط طرب و فور غم دفعتہً تیزی کے ساتھ ان عابدوں کے نفوس پر مسلط ہو جایا کرتے تھے اور یہ انھیں کسی فوق الفطرت قوت کی کرشمہ سازیوں کا خیال کرتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس تنہائی اور سناٹے میں جبکہ یہ اہل تقویٰ اپنی توجہ کی یکسوئی و استغراق کی کوششوں میں مصروف ہوتے تھے۔ یک بیک ان کے ذہن میں پچھلی مسرتوں کی یاد آجاتی۔ کبھی یہ یاد اُن پیاری صورتوں کی ہوتی جن پر ایک زمانہ میں اُن کی نگاہ محبت پڑا کرتی تھی کبھی اُن نغمہ ہائے شیریں کی ہوتی جن کی آواز کو ایک وقت میں یہ جان کے برابر عزیز رکھتے تھے اور کبھی یہ عبّاد یہ خواب بیداری دیکھتے کہ گویا یہ یانی کے اکھاڑے میں موجود ہیں۔ اور سامنے جوڑ ین ہو رہی ہیں۔ ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف ہر خفیف سے خفیف امر کا انتساب شیطانی مداخلت کی طرف کیا جاتا تھا۔ ایک راہب کی بابت روایت ہے کہ جب وہ جنگل میں چلتے چلتے بہت خستہ ہو گیا تو اُس نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اس وقت تازہ شہد کہیں مل جاتا تو طبیعت کو کیسی تفریح ہو جاتی۔ اتنے میں اس کی نگاہ سامنے کی چٹان پر پڑی تو دیکھا کہ واقعی کھینوں کا چھتا لگا ہوا ہے۔ یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ لیکن راہب پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ وہ اسے قطعاً شیطان کی وسوسہ اندازی سمجھا اور ردِ سحر کی دُعائیں پڑھتا ہوا بھاگا۔ اس طرح کی بیسیوں روایات ہیں مگر ان سب میں زیادہ دردناک روایات نوجوان راہبوں کی ہیں۔ ان غریبوں کے خون میں بدستور حدت ہوتی تھی طبیعت میں بدستور اُمنگ و جوش ہوتا تھا اور اوائل عمر میں پری جمالوں کی ہم صحبتی و ناز برداری کی خو پڑ چکی ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کے لئے محال تھا کہ فطرت کے یہ قوت جذبات کو اکبارگی مٹا دیں۔ یہ جذبات بڑے بڑے جتنوں سے دبائے جاتے۔ لیکن رہ رہکر

اُبھرتے اور اس زور سے اُبھرتے کہ عابدانِ شب زندہ وار کے نظام دماغی کو تخیل اور ان کی جمعیت حواس کا شیرازہ یکسر منتشر کر دیتے۔ جنونِ خودکشی یہ دو نتائج علی العموم ظہور پذیر ہونے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سینٹ پلیمن و سینٹ پیکومیس جنگل میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ یک بیک ایک نوعمر راہب جس کے چہرہ سے آثارِ وحشت و جنون عیاں تھے دوڑا ہوا آیا اور رو رو کر اور ہچکیاں لے لیکر اُس نے اپنا پُرالم دُکھڑا یہ سُنایا کہ ایک حسین عورت اُس کے حجرہ میں چلی آئی اور اسے اپنے سے ملوث کر کے دفعتہً غائب ہوگئی یہ کہکر اُس نے زور سے ایک چیخ ماری اور تیزی سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے سارا جنگل ختم ہوگیا اور وہ ایک موضع کے سرحد پر پہنچا جہاں حمام کے سامنے خوب آگ روشن تھی۔ اس آگ میں اُس نے اپنے تئیں جھونک دیا اور چند لحظہ میں تودۂ خاکستر ہوگیا۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اس قبیل کے واقعات صرف نوعمر و نومشق ہی عبّاد کو نہیں پیش آتے تھے بلکہ بڑے بڑے پُرانے زاہدانِ مرتاض بھی بسا اوقات ان کا شکار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک راہب کا واقعہ مشہور ہے جو زہد و تقویٰ میں خاص شہرت رکھتا تھا اور جس کی ریاضات ضرب المثل تھیں یہاں تک کہ اسے خود بھی اپنی جذبات کشی پر غرّہ ہوگیا تھا کہ ایک روز ایک راہ گم کردہ اور تھکی ماندی عورت نے آکر اس کے حجرہ پر دستک دی اور دو گھڑی کے لئے جنگلی جانوروں کے خوف سے اس کی پناہ میں آجانا چاہا۔ زاہد نے رحم کھا کر یہ درخواست منظور کر لی اور اس عورت نے بہ کمال عقیدت اُس کے دست مبارک کو مس کرنا چاہا۔ ہاتھ کا ہاتھ سے مس ہونا تھا کہ حضرت زاہد کے جسم میں گویا ایک برقی رَو دوڑ گئی اور چشم زدن میں سارا زہد و تقوےٰ کافور ہوگیا۔ ہاتھ ہم آغوشی کی تمنا میں بڑھے۔ لیکن قبل اس کی کہ جسم سے جسم مس ہو وہ عورت نظروں سے اوجھل تھی۔ گویا ایک چھلاوا تھا جو معاً نظر سے غائب ہوگیا اور شیاطین و ارواح خبیثہ کی جماعت کے قہقہوں کی آوازیں چلی آنے لگیں۔ اب حضرت زاہد کو نظر آیا کہ ان کی سرشت میں ریاضت و زہد کے علاوہ بھی کوئی اور عنصر شامل ہے جسے کوئی ورع و تقوےٰ

مغلوب نہیں کر سکتا۔ کوئی اور شخص اُس کی جگہ پر ہوتا تو فرط حسرت و ندامت سے مجنوں ہو جاتا اور یا خودکشی کر لیتا۔ لیکن اس کی طبیعت پر یہ اثر پڑا کہ اس نے اسی وقت زاہدانہ زندگی کو خیرباد کہا اور عام دنیوی طرز معاشرت اختیار کر کے بقول مورخین مسیحیت کے جہنم کے لیے اپنے تئیں تیار کرنے لگا۔

اس طرز کے قصص و روایات کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنس اناث سے ربط و تعلق رکھنا ہی سخت خطرناک سمجھا جانے لگا۔ لیکن ترک تعلق کر لینا بھی آسان نہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کی تاریخ میں جہاں اس طرح کے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں کہ یہ زہاد عورت کے سایہ تک سے بھاگتے تھے۔ وہاں اس طرح کی مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ عورت بکمال خوش عقیدگی و استقلال ان کا پیچھا کیے چلی جا رہی ہے بلکہ بعض عورتیں اس حیثیت سے بہت کامیاب رہی ہیں مثلاً سینٹ میلینیا کہ قطع نظر اپنی بڑی جائداد کو راہبوں پر وقف کر دینے کے اُس نے مورخ روفینس کی معیت میں شام و مصر میں ایک بڑا دورہ بھی کیا اور تمام زاہدین و راہبین کی زیارت کرتی رہی۔ مگر یہ ایک خاص صورت تھی ورنہ زاہدوں کا عام قاعدہ یہ تھا کہ ان میں سے جو عورت کے سایہ سے جتنے دنوں زیادہ محترز رہتا تھا اُسی قدر زیادہ متقی و متورع خیال کیا جاتا تھا۔ سینٹ بیسل نے بجز کسی شدید مجبوری کے عورت کا چہرہ دیکھنا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ سینٹ جان نے ۴۸ سال تک عورت کی صورت نہیں دیکھی بالآخر اس کی بیوی نے مجبور ہو کر اُس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر وہ اُسے دیکھنے نہ آئے گا تو وہ اپنی جان دیدے گی۔ یہ سن کر آپ نے یہ جواب دیا کہ "آج رات کو جس وقت وہ اپنی خوابگاہ میں ہوگی میں آؤں گا" اور اس وعدہ کا ایفا یوں ہوا کہ بیوی نے رات کو اُسے خواب میں دیکھ لیا۔ رومہ کی ایک نہایت خوش عقیدہ لڑکی کا ذکر ہے کہ وہ اٹلی جیسے دور دراز مقام سے سفر کر کے اسکندریہ محض اس غرض سے آئی کہ سینٹ آرسینیس سے دعا لے۔ کس مشکل سے اُسے باریابی نصیب ہوئی اور اُس وقت اس نے بہ کمال الحاح وزاری فقیر سے التجا کی کہ "مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔" اس پر فقیر آپے سے باہر ہو گیا اور

نہایت غضبناک ہوکر بولا کہ "تجھے یاد رکھوں! اب ساری عمر اس دعا میں صرف ہو گی کہ تجھی بھلاؤں"۔ غریب لڑکی مایوس ہوکر اسکندریہ کے لاٹ پادری کے پاس گئی، اُس نے فقیر کے ارشاد کی یوں تاویل کی کہ "وہ تجھے بھلاوے گا۔ لیکن تیری روح کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھے گا"۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ عورتیں خوش عقیدگی کے جوش سے لبریز ہوکر مردانہ لباس اختیار کر لیتیں اور ساری عمر زاہدانہ زندگی میں بسر کر دیتیں ان میں سب سے قابل ذکر سینٹ پلیجیا ہی جو پہلے ایک مشہور ایکٹرس تھی۔ اسے عبادت کا شوق ہوا اور معمولی عبادت میں سیری نہ پاکر اس نے زاہدانہ زندگی اختیار کرنا چاہی۔ یہ ٹھان کر اس نے مردانہ وضع اختیار کی اور روپ بدلنے میں اسے یہ کمال حاصل تھا کہ ساری عمر مردوں کے ساتھ ریاضات میں مشغول رہی اور وفات کے وقت تک کسی کو اس کے عورت ہونے کا پتہ نہ چل سکا۔

بیانات بالا سے رہبانیت وخانقاہ نشینی کی ابتدائی تاریخ کا ایک صاف نقشہ نظر کے سامنے پھر گیا ہوگا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہی کہ اس طرز معاشرت کا مسیحی اخلاق و معیار اخلاق پر کیا اثر پڑا؟ سب سے پہلی تبدیلی اس سلسلہ میں یہ نظر آتی ہے کہ مختلف محاسن اخلاق کے مدارج باہمی اُلٹ پلٹ گئے۔ مثلاً مسیحیت کے قرون اولیٰ میں اور خاص انجیل کی تعلیمات کے مطابق اُمّ الاخلاق ایثار، ہمدردی یا محبت والفت تھی۔ لیکن چوتھی اور پانچویں صدیوں میں رہبانیت کے زور سے اخلاق کا مرکز ثقل بدل گیا تھا۔ اب اُمّ الاخلاق الفت وہمدردی نہیں بلکہ عصمت وعفت تھی۔ اور عصمت سے یہ مراد نہ تھی کہ آدمی سوا اپنی منکوحہ بیوی کے اور کسی سے تعلق نہ رکھے بلکہ جائز ازدواجی تعلقات سے اجتناب بھی داخل عصمت تھا اور انسان کے لئے کمال اخلاق یہ قرار پایا گیا تھا کہ وہ اپنے تمام جذبات شہوانی کو یکسر فنا کر دے۔ اس طرز عمل کے مُہمات نتائج میرے نزدیک حسب ذیل ہوئے:-

(۱) ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مذہب میں تلبیس وتعبس بہت آگیا۔ رہبانیت پرستوں نے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا تھا کہ تقاضائے جنسی فی نفسہٖ ایک معصیت کبیرہ ہی۔ اور چونکہ یہ تقاضائے

فطری، جذبات حسد وغضب وغیرہ کی طرح عارضی وہنگامی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی گدگدی رہ رہ کر دل میں اٹھا کرتی ہے اور ان زاہدوں کو اسے ہر وقت دبائے رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ خیال قایم کیا کہ اوّل تو نفس انسانی بجائے خود بدی وبدکاری کی جانب مائل ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر لذّت معصیت کی طرف مُودّی ہوتی ہے لہذا ہر لذّت معصیت ہے۔ یہ اعتقاد صحیح نتیجہ تھا جذبۂ شہوانی کو بالکل مار دینے کا۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے یونانی فلسفہ سے تلازم لذّت ومعصیت کا فقدان، نتیجہ تھا اس حقیقت کا کہ یونانی حکما، ازدواجی بدچلنی کو چنداں معیوب نہیں خیال کرتے تھے اور یونانی پبلک تو ناجائز شہوت رانی کو علانیہ جائز رکھتی تھی۔

(۲) دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ جبر واختیار کے مقدمہ میں فیصلہ اختیار کے حق میں ہو گیا۔ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ انسان کے جذبات اُسے برائی وبدکاری کی طرف لے جاتے ہیں لیکن وہ خود اپنے ارادہ سے رُکتا ہے، وہ انسان کو فاعل مختار لامحالہ مانے گا۔

(۳) تیسرا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی یا جوانمردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پا گئے۔ مثلاً زندہ دلی۔ خوش طبعی، صاف گوئی۔ فیاضی، شجاعت۔ جراءت کہ عابدان مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے اور فرقہ کیتھولک ہمیشہ انھیں دباتا رہا۔ حالانکہ پروٹسٹنٹ ومادّی تمدن کا اقتضا ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھیں کو سراہا جائے۔

(۴) چوتھا مگر نہایت اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشرت کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزہ کا احترام واجب کافور ہو گیا۔ درحقیقت اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اور اعزّہ کے ساتھ قساوت قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں اس کا عام ناظرین اندازہ نہیں کر سکتے۔ لوگ آج ان زاہدوں کے اعلیٰ زہد وریاضت ورع وتقویٰ پر سر دُھنتے ہیں۔ لیکن اس سے بے خبر ہیں کہ ان کریہ ممدوح کس بیدردی سے اپنی ماؤں کی دلشکنی کرتے تھے۔ بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انھیں بے والی ووارث محض دوسروں کے

ٹکڑوں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ ان کا مقصود زندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اُخروی حاصل ہو۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین جئیں یا مریں ایک راہب صاحب کے پاس مدّت دراز کے بعد اُن کے والدین کے خطوط دریافت خیریت کے لئے پہنچے۔ حضرت کو یہ خیال گزرا کہ کہیں ان کے پڑھنے سے میری یکسوئی خیال میں انتشار نہ پیدا ہو۔ اور ان کو بے پڑھے آگ میں پھونک دیا۔ ایک اور شخص کا قصہ مشہور ہے کہ اُسے راہب بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ ساری جائداد و املاک پر لات مار کے صرف اپنے ہشت سالہ بچّہ کو ہمراہ لے کر خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ راہبوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن وہ ابھی اُسے اپنی جماعت میں کیونکر شریک کر سکتے تھے۔ گو وہ اپنی دولت و ثروت کو بھول چکا تھا۔ تاہم اولاد کی مامتا تو اس کے دل سے ابھی نہیں نکلی تھی۔ اس خیال کی بنا پر اُس کا بچّہ اُس سے لے لیا گیا۔ کھانے، پہننے، چلنے، پھرنے غرض ہر شے سے متعلق اُس پر ہر طرح کی سختیاں برتی جانے لگیں اور ہر طرح کی ذلتوں اور سزاؤں کا اُسے شکار بنایا جانے لگا۔ بیدرد اور اپنی نجات کا حریص، باپ روزمرّہ یہ تماشہ دیکھتا لیکن کبھی مُنہ سے اُف تک نہ نکالتا۔ یہاں تک کہ ایک روز پیر خانقاہ کا اُسے یہ حکم ملا کہ بچّہ کو لیجا کر دریا میں ڈال آئے۔ باپ کے جبین استقلال پر اب بھی شکن نہ آئی وہ تعمیل ارشاد کے لیے مستعد ہو گیا۔ لیکن عین لب دریا چند راہبوں نے درمیان میں پڑ کر اس جان گزا امتحان سے معافی دلوادی۔ یہ شخص آگے چل کر بہت بڑا زاہد مشہور رہا۔ بالکل اسی طرح کا قصہ ایک اور اُمیدوار منصب راہبیت کا منقول ہے۔ ان کو بھی یہی حکم ملا تھا کہ اپنی اکلوتی اولاد کو دریا برد کر آئیں۔ لیکن عین موقع پر ایک خاص قاصد نے آکر بچّہ کی جان بچالی کبھی کبھی ان واقعات میں خرق عادت کی آمیزش بھی ہو جاتی تھی۔ مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ کسی شخص نے اپنے بچوں کو چھوڑ کر خود راہب بننا چاہا۔ تین سال کے بعد اُسے خیال ہوا کہ ان لڑکوں کو بھی خانقاہ میں لانا چاہیئے۔ اس خیال سے وہ مکان واپس گیا

لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ تین میں سے دو وفات پا گئے ہیں اور صرف سب سے چھوٹا زندہ رہ گیا ہے اُسے اس نے گود میں لیا اور خانقاہ میں لایا، یہاں پہنچکر پیر خانقاہ نے دریافت کیا کہ کیا تمھیں اس سے محبت ہے؟ جواب ملا کہ "ہاں" مکرر ارشاد ہوا۔ کہ کیا تمھیں اس سے بہت محبت ہے؟ مکرر جواب اثبات میں ملا۔ اس پر ارشاد ہوا کہ فوراً اسے سامنے والے آتشکدہ میں پھینک دو۔ معاً تعمیل ارشاد ہوئی، لیکن باپ کی متحیر آنکھوں نے دیکھا کہ بیٹے پر آتشکدہ گلزار خلیل ہو گیا ہے۔

اس طرز عمل کی سب سے زیادہ پر اثر و دردانگیز مثالیں جنس نسواں سے تعلقات کے سلسلہ میں ملتی ہیں کہ یہاں خیال یہ تھا کہ عورت کی موجودگی کہیں دفعتاً تمام محنت کو غارت نہ کر دے۔ ہمارے بعض ناول نویسوں نے اس خیال کے چربہ اُتارنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ کو قدماء راہبین نے جس حد تک عملاً برتا تھا۔ وہاں تک ہماری ناول نویسوں کا طائر فکر نہیں پہنچ سکتا۔ مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو۔ مشہور امام رہبانیت سیویس جب نہایت ضعیف اور اپاہج ہو گیا تو اس کی انتہائی کبرسنی پر نظر کر کے اُس کے تلامذہ ورفقاء نے چاہا کہ وہ جنگل کو چھوڑ کر کسی بستی میں سکونت اختیار کرے۔ وہ اس درخواست کو قبول کرنے پر راضی ہو گیا۔ لیکن شرط یہ پیش کی کہ وہ بستی ایسی ہو جس میں کبھی کسی عورت سے دوچار ہونے کا احتمال نہ ہو۔ ایسی بستی کا وجود ظاہر ہے کہ ناممکنات سے تھا۔ چنانچہ بالآخر وہ بدستور جنگل ہی میں مقیم رہا اور وہیں جان دیدی۔ ایک اور راہب صاحب سفر کر رہے تھے اور اپنے فرقہ کی عام روش کے خلاف گویا اپنی طبیعت پر بہت جبر کر کے اپنی والدہ کو بھی اپنے ہمراہ لئے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک چشمہ پڑا جس پر کوئی پل نہ تھا۔ حضرت نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ اور سارے جسم کو کپڑے میں خوب کس کر لپیٹنا شروع کیا۔ ماں نے متحیر ہو کر سبب پوچھا تو جواب دیا کہ تمھیں کندھے پر بٹھا کر اُس پار کرنا ہے۔ ڈر ہے کہ اگر کہیں میرا جسم تمہارے جسم سے مس ہو گیا تو میرا سارا کیا کرایا ایک دم میں رائیگاں جائیگا۔ سینٹ جان آف

کی ہمشیر کو اُس سے بیحد اُنس تھا جب سینٹ مذکور کو بادیہ نشینی اختیار کیے بہت زمانہ گزر گیا تو ہمشیر
کے دل میں دیکھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوا۔ بلانے کے بہت سے خطوط لکھے مگر ادھر سے انکار ہی
رہا۔ آخر مجبور ہو کر خود جنگل میں جا کر ملنے کا ارادہ کیا۔ اب سینٹ مذکور کو وحشت ہوئی اور خط میں لکھ
بھیجا کہ خود ہی آتا ہوں"۔ چنانچہ آپ آئے ضرور مگر اس قدر تبدیل ہیئت کے ساتھ کہ بہن نے پہچانا تک نہیں
اسی حالت سے آپ واپس چلے گئے اور بدعہدی کے شکوہ کے جواب میں لکھ بھیجا کہ "میں آیا تو تھا
مگر مسیح کے فضل و کرم سے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ اب ہرگز کبھی میرے دیدار کا قصد نہ کرنا"۔
سینٹ تھیوڈورس کی ماں بے اختیار ہو کر اپنے لڑکے کو دیکھنے آئی اور احتیاطاً بہت سے پادریوں
کے سفارشی خطوط بھی لیتی آئی لیکن صاحبزادہ کا دل کسی طرح نہ پسیجا۔ اور بالآخر ماں کو اپنی بیٹی کے ساتھ
ناکام ہو کر واپس ہونا پڑا۔ سینٹ مارکس کی والدہ نے اس کے پیر سے اس کے ملنے کی اجازت
حاصل کر لی۔ اب سینٹ صاحب اس مشکل میں پڑے کہ یا تو پیر طریقت کی عدول حکمی کریں اور یا
ماں کا چہرہ دیکھنے کی معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوں۔ مگر دیکھئے کہ ظالم نے اس اشکال کو کیونکر رفع
کیا ہے یعنی ماں کے پاس گیا ضرور مگر بھیس بدلے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے جس سے
نہ اس نے ماں کو دیکھا اور نہ ماں نے اسے پہچانا بالکل اسی طرح کا واقعہ سینٹ پیور اور اس کی ہمشیر
کا ہے۔ سینٹ پیمین کی بابت یہ روایت ہے کہ اُس نے مع اپنے چھ بھائیوں کے دفعتہً ترک خاندان
کر کے جنگل کی راہ لی جس ضعیف ماں کی ساتوں اولادیں اُسے اکبارگی چھوڑ دیں اُس کے دل پر
کیا کچھ گزر گئی ہوگی۔ غریب بیتاب ہو کر خود بھی جنگل میں آئی یہاں وہ ایسے وقت پہنچی جبکہ یہ لوگ
اپنے حجرہ سے نکل کر گرجا جا رہے تھے۔ ماں کی صورت دیکھتے معاً سب دہشت زدہ ہو کر پلٹے ماں نے
فوراً تعاقب کیا۔ لیکن کبرسنی کے پاؤں جوانی کے پاؤں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قبل اس کے
کہ ماں دروازہ پر پہنچے صاحبزادوں نے اندر سے حجرہ بند کر لیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ضعیف و ناچار
ماں، دروازہ پر کھڑی اپنی جگر دوز چیخوں سے سارے جنگل کو ہلائے دیتی تھی۔ اس حالت میں
سینٹ پیمین نے دروازہ کے قریب آکر اس آہ و شیون کا سبب پوچھا۔ ماں نے ہچکیاں لیکر

تقریر شروع کی کہ یہ سارا صدمہ تمہارے نہ دیکھنے کا ہے۔ کیا تم مجھے نہیں جانتے ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں؟ کیا میں نے تمہاری رضاعت نہیں کی؟ تمھیں پال چلا کر اتنا بڑا نہیں کیا؟ کیا میرے ان احسانات کا یہی معاوضہ تھا؟ کیا میرے سارے حقوق تم نے بھلا دیئے؟ یہ ساری تقریر بے اثر رہی۔ اہل زہد کی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملا کہ تم اپنی موت کے بعد ہی ہمیں دیکھ سکو گی۔ یہاں تک کہ دکھیاری ماں کو مجبوراً اسی سے تسلی پا کر ناکام واپس جانا پڑا اسی کے قریب قریب سینٹ سیمون کا واقعہ ہے جس کے ترک خانماں کرنے کا باپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مر گیا۔ ماں البتہ زندہ رہی۔ لیکن جب ۲۷ سال گزر چکے اور اسے سینٹ موصوف کی قیام گاہ کا پتہ معلوم ہوا تو وہ ملاقات کے لئے خود جنگل میں آئی۔ لیکن اس کی تمام تقریریں خوشامدیں آہ وزاریاں سب بیکار گئیں اور سینٹ موصوف نے کسی طرح ملاقات کی ہامی نہیں بھری۔ آخر جب دیکھا کہ ماں کی بے قراری حد سے گزری جاتی ہے تو یہ کہلا بھیجا کہ میں عنقریب ملنے آتا ہوں۔ تین شبانہ روز اس وعدہ کے گزر گئے یہاں تک کہ اسی حجرہ کے دروازہ پر فرط یاس سے ماں نے دم توڑ دیا۔ تب مقدس راہب حجرہ سے مع اپنے تلامذہ کے باہر تشریف لائے اور ماں کی میت پر چند آنسو گرائے اور دعائے مغفرت کی اس پر ایک خوش عقیدہ سوانح نویس کی روایت ہے کہ نعش میں حرکت ہوئی اور سینٹ موصوف نے مکرر دعائے مغفرت کی۔ پھر سینٹ موصوف جا کر بدستور اپنے خلوتکدہ میں مصروف عبادت ہو گئے۔ اور ان کی کرامت و اتقا کا شہرہ ہر زبان پر جاری ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ روایات بالا میں ایک بڑا حصہ اغراق و مبالغہ کا بھی ہوگا۔ تاہم جتنی اصلیت ہے وہ بھی اس حقیقت کے علم کے لئے بالکل کافی ہے کہ ترک خانماں و قطع تعلقات خانگی کرنا اس وقت کے مسیحیوں میں اعلیٰ فضائل اخلاق سے سمجھا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی قانون و شریعت کی طرف سے ان سختیوں کو ہلکا کرنے کی بھی کوشش ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً شروع شروع میں یہ اصول رکھا گیا تھا کہ جن بچوں کو بغیر ان کی مرضی لئے ہوئے ان کے

والدین راہب بنا ڈالتے ہیں وہ مجاز ہیں کہ بالغ ہو کر پھر دنیوی زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ یا ایک بار گرجا کی کونسل نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ اولاد کے لئے اپنے والدین کو چھوڑ دینا خواہ وہ راہ مذہب ہی میں ہو ناجائز ہے۔ لیکن اس طرح کی صدائیں خال خال اُٹھتی تھیں۔ ورنہ عام حالت یہی تھی کہ قانون نے اس باب میں والدین کو اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں دیا تھا۔ اور جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی۔ اس کے نام پر پبلک میں ہر طرف سے واہ واہ ہوتی تھی سینٹ کریزوسٹم فخریہ بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکے کو اس کے باپ نے کسی فوجی عہدہ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ لیکن میں اُسے خانقاہ میں اُڑا لایا۔ سینٹ ایمبروز میں اس قسم کے اغواء کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اُسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کر دیتی تھیں۔ محبت شعار والدین کا اس زمانہ میں عجیب پُر درد حال تھا۔ سینٹ کریزوسٹم کی والدہ کی تقریر اب تک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ جو کہتی ہے کہ "بیٹا اگر تیرا یہی ارادہ ہے تو اس قصد کو میری وفات کے وقت تک ملتوی رکھ" سینٹ ایمبروز کا ایک پورا مقالہ اس موضوع پر موجود ہے کہ رہبانی زندگی کی برکتیں والدین کی خوشنودی کی برکتوں سے کس قدر بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں والدین کو ناخوش کر دینا کتنا آسان ہے۔ پھر جو لوگ اپنی اولاد واعزہ کو رہبانیت اختیار کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود بقول سینٹ کریزوسٹم کے عذاب الیم کے مستوجب ہوں گے۔ بلکہ بہ قول سینٹ ایمبروز کے ممکن ہے کہ وہ اُن پر اسی دنیا میں نازل ہو جائے۔ جیسا کہ ایک یتیم ولیسیر لڑکی نے جب راہبہ بننا چاہا اور اس کے اعزہ نے اسے اس قصد سے باز رکھنا چاہا اور اس درمیان میں ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ تمہارے والدین اگر آج زندہ ہوتے تو وہ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔ تب تم کیا کرتیں؟ اُس لڑکی نے جواب دیا کہ اسی باعث تو خدا نے آج انھیں زندہ نہیں رکھا۔" یہ کہنا تھا کہ جس شخص نے یہ گستاخانہ سوال کیا تھا وہ خود بھی مر گیا اور لوگوں کے دل میں یہ دہشت سما گئی کہ اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا مشیت الٰہی سے لڑنا ہے۔ ایک مشہور خاتون کی بابت منقول ہے

کہ اپنے شوہر کے انتقال پر وہ دفعتہً ترک خانماں کرکے اور اپنی اولاد کی طرف سے بالکل ذی اعتنا ہو کر راہبوں کی جماعت میں جا شامل ہوئی۔ اپنی ساری جائداد خیرات کر ڈالی اور اولاد کے لئے بجز مالی زیر باری اور قرضہ کی پریشانیوں کے اور کوئی ترکہ نہیں چھوڑا۔ اس زمانہ میں یہ عقیدہ بھی عام طور سے شایع کر دیا گیا کہ اعزہ و اقربا پر روپیہ صرف کرنے میں مطلق ثواب نہیں بلکہ جو کچھ ثواب ہے وہ فقرا، پر خیرات کرنے میں ہے۔ چنانچہ بہت سے اہل ثروت حصول ثواب کے لئے اسی عقیدہ پر عامل بھی تھے۔ البتہ ایک سینٹ گشا ین و آریلیس کی استثنائی مثالیں ایسی ملتی تھیں جو اعزہ کی حق تلفی کرکے خیرات کا روپیہ لینا حرام جانتے تھے۔ انھیں بالکل مستثنیات میں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ عام عقیدہ کا ترجمان تو یہ اصول تھا کہ "جو شخص اپنی ماں کی دلشکنی برداشت کر سکتا ہے وہی بڑی سی بڑی ریاضتیں بھی جھیل سکتا ہے"۔ سینٹ جروم ایک شخص کو راہبانہ زندگی کی ترغیب دیتے ہیں اور اس ضمن میں ترک تعلقات خانگی کے باب میں کیسی داد بلاغت دیتے ہیں:-

"تمہارا ننا بھتیجا تمہارے گلے میں باہیں ڈال دے گا۔ تمہاری ماں آنسوؤں کا تار باندھ دیگی اپنے احسانات کو یاد دلائے گی۔ اپنے کپڑے اور بال نوچ نوچ کر اپنے حقوق پر توجہ دلائے گی؛ تمہارا باپ اپنے تئیں تمہارے قدموں پر گرا دے گا۔ لیکن تمھیں چاہیئے کہ اس کے جسم کو پامال ہو جانے دو اور ان میں سے کسی شے کی پروانہ کرو۔ تمہاری بیوہ ہمشیر تمہارے گرد پروانہ ہو جائے گی۔ تمہارے والد یہ کہیں گے کہ "میری موت کے وقت تک اپنا ارادہ ملتوی رکھو" اعزہ یہ سمجھائیں گے کہ خاندان کا شیرازہ صرف تمہاری ذات سے قائم ہے۔ لیکن تمھیں ان میں سے کسی شے کی پروانہ ہونی چاہیئے۔ تمہارے کان میں مسیح کی صدا آ رہی ہے۔ اُس کے مقابلہ میں تمھیں کسی اور آواز سے متاثر نہ ہونا چاہیئے مسیح کی محبت اور جہنم کے خوف کے سامنے ساری محبتیں اور رشتہ داریاں ہیچ ہیں"۔

یہ حالات و قصص تو قدما کے تھے۔ لیکن متاخرین میں بھی یہ کیفیت بدستور قایم رہی۔ چنانچہ

سینٹ گری گوری روایت کرتے ہیں کہ "ایک شخص اپنی صغر سنی سے راہب بن گیا تھا مگر والدین کی محبّت ہنوز اُس کے دل سے نہیں نکلی تھی آخر ایک روز خفیہ طور پر وہ ان کی ملاقات کے لیئے چلا گیا اس جرم پر غضب الٰہی یوں نازل ہوا کہ جوں ہی لوٹ کر آیا مر گیا۔ اور جب نعش دفن کی جانے لگی تو زمین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ متعدد ناکام کوششوں کے بعد جب سینٹ بینیڈکیٹ نے اس کے سینہ پر تبرّکات رکھے ہیں تب تدفین ہو سکی۔ اسی طرح کی اور روایات بھی اسی زمانہ سے متعلق مشہور ہیں۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی۔ پہلے جو اثر واقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔

رہبانیت کی تاریخی سرگزشت بیان ہو چکی۔ اب اس پر کوئی میری رائے پوچھے تو میں مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ علایق دنیوی سے آزادی حاصل کرنا اگرچہ بہت بڑی ہمت وجوانمردی کا کام ہے۔ تاہم جس ترک تعلقات کی بنا محض خود غرضی پر ہو وہ کبھی محمود نہیں کہی جا سکتی قدماء یونان وروم اگر ایثار و مجاہدہ سے کام لیتے تھے تو ملک و قوم سلطنت وجماعت کی بہبود کے لئے۔ لیکن ہماری مسیحی رہبانیت کا مقصد محض اپنی نجات اُخروی کا حصول تھا جو خود غرضی ہی کی ایک شکل ہے۔ دنیوی نہ سہی دینی سہی۔ ایسا شخص جو آخرت میں اپنے نفع و آرام کے خاطر ماں باپ، دوست آشنا، بھائی بہن، اور اولاد کے حقوق کو یکسر تلف کر دے اور فرائض کو بالکل پس پشت ڈال دے۔ اگر وہ خود غرض نہیں تو دنیا میں اور کسے خود غرض کہہ سکتے ہیں؟

پانچواں نتیجہ رہبانیت و ترک تعلقات کا تعصب و عدم مسالمت مذہبی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بے تعصبی و رواداری کی بنیاد وسیع ہمدردیوں پر ہے۔ جس شخص کی ہمدردیاں جتنی زیادہ وسیع ہوں گی وہ اسی قدر وسیع المشرب و بے تعصب ہوگا۔ لیکن ہمدردیوں اور جذبات لطیف کا گہوارہ خانگی زندگی ہے جس کا بیج ہی راہبانہ طرز معاشرت نے مار دیا تھا۔ جہالت تعصب، بیدردی، و وہم پرستی کا اجتماع رواداری کے لئے کہاں گنجایش باقی رکھ سکتا تھا

ہر راہب اپنے اپنے گرجا کے معتقدات پر شدت سے کاربند اور اُن سے کسی جزی اختلاف کی بھی تاب لانے کے ناقابل تھا۔ اُس کے ذہن میں اس کا امکان بھی نہیں گزرتا تھا کہ مخالف کی رائے میں واقعیت کا جزو شامل ہے۔ اور پھر جب خود مسیحی فرقوں میں باہمی تعصب و عدم رواداری کا یہ حال تھا تو اُس وحشیانہ تعصب کا کیا پوچھنا جو انھیں مسیحیوں سے تھا مشرکوں کے بڑے بڑے معابد، ان کی عظیم الشان یادگاریں اور شاندار قربان گاہیں۔ دم کے دم میں مسمار کر دی جاتیں اور ان کے گرانے میں ایسے لوگوں کو کیا درد ہو سکتا تھا جن کے دل کبھی اپنے والد کی آہ و فریاد پر بھی نہیں پسیجے تھے۔ کبھی کبھی ملکی قوانین ان سختیوں کو ہلکا کر دیتے تھے۔ لیکن ناہبان انھیں انھیں کبھی اسے جائز نہیں رکھ سکتے تھے۔ بلکہ حکومت کی کمزوریوں پر نہایت سختی سے احتساب کرتے تھے۔

چھٹا نتیجہ یعنی فضائل سیاسی و وطنی کا انحطاط اپنی غایت اہمیت سے ایک مستقل فصل کا محتاج ہے۔

فصل (۷)

جذبات وطنیت کا انحطاط

سب سے آخری مگر سب سے اہم نتیجہ رہبانیت کا یہ نکلا کہ وطنیت و قومیت کے جذبات کا خاتمہ ہو گیا۔ بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسیحی تمدن جس قدر فضائل عصمت و عفت اور انسانیت کے لحاظ سے بلند ہوا ہے۔ اُسی قدر کمالات علمی و جذبات قومیت کے لحاظ سے پست رہا ہے۔ یہ ہمیں کسی گزشتہ باب میں معلوم ہو چکا ہے کہ ظہور مسیحیت سے ذرا پہلے جو علمی تحریک شائع ہو رہی تھی وہ بجائے خود جذبہ وطنیت کو پامال کرنے والی تھی۔ اور اُس کی بنا پر جوشِ روم و یونان کی فہرست فضائل اخلاق میں راس الفضائل کا مرتبہ رکھتی تھی وہ فنا ہو چکی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس انقلاب حالت کے خاص اسباب یہ دو تھے۔ ایک

یہ کہ سلطنت رومہ کے حدود کے اندر مختلف قوموں، نسلوں، اور مذہبوں کے لوگ اس شدت سے
آپس میں خلط ملط ہوگئے تھے کہ کسی ایک خاص ملک یا قوم کے جذبہ کو مخاطب بنانا قطعاً
ناممکن ہوگیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اب سلطنت رومہ میں مشرقی فلسفوں کا عروج شروع ہوا
اور ان انتظامات فلسفہ میں رواقیت کے بالکل برخلاف وطن پرستی یا قوم پرستی کا کوئی
درجہ نہ تھا۔ غرض ظہور مسیحیت کے وقت جذبۂ وطنیت خود ہی ایک بڑی حد تک فنا ہوچکا تھا
اور سچ یہ ہے کہ اسی سنگ راہ کے دور ہو جانے سے خود مسیحیت کی اشاعت بے روک ٹوک
آسانی سے ہوسکی۔ کیونکہ ایک بالکل قطعی تاریخی حقیقت ہے کہ جو مذہب خصایص قومی کے
معارض ہوتے ہیں وہ کبھی چلنے نہیں پاتے۔

لیکن اس جذبہ کے جو کچھ باقیات الصالحات رہ گئے تھے مسیحیت نے ان کا بھی استیصال
کردیا۔ مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق رومہ کی عظمت دجال کی عظمت تھی جس کا مٹنا دور ربانی
کا لازمی مقدمہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنا ایک پورا جتھا قایم کرکے زوال حکومت کے منتظر و ساعی
رہنے لگے اور ایسے تمام مناظر، ملاعب و مشاغل سے بالکلیہ احتراز کرنے لگے جن سے جذبۂ
قومیت کو تقویت پہنچنے کی توقع ہوسکتی تھی۔ بے شبہ انھوں نے کبھی حکومت سے براہ راست
بغاوت نہیں کی تاہم وہ ہمیشہ رعایا کو حکومت کی جانب سے برگشتہ یا کم از کم بے تعلق بنا تے رہے
اور اسے علانیہ فخر کے ساتھ کہتے رہے کہ ملک و قوم وغیرہ کی دنیوی ترقیوں سے انھیں کوئی
واسطہ نہیں، کیونکہ حقیقی ترقی روحانی ترقی کا نام ہے۔ پھر سپہگری کے پیشہ اور فوجکشی کو کبھی
انھوں نے پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھا۔ بلکہ ان کے جواز میں بھی انھیں تامل رہا۔ یہ نقطۂ
خیال عام مسیحیوں کا شروع ہی سے رہا تھا۔ اس پر راہبوں کے ترک تعلقات ترک دنیا صحرانشینی
و خلوت گزینی نے اور چار چاند لگا دئے اور یہ بالآخر زوال حکومت کا ایک سبب قوی ثابت ہوا۔

مذہب و اخلاق کے تعلقات باہمی کے باب میں لوگوں کو عجیب غلط فہمی ہے۔ مذہب اخلاق
پر موثر ضرور رہتا ہے۔ مگر کس طرح؟ اس طرح کہ اخلاق کے چشمہ کو وہ اپنے قایم کردہ راستہ پر

تیزی سے بہانے لگتا ہے۔ اخلاقی قوت قوم میں پہلے سے موجود ہونا چاہیئے۔ مذہب اُسے پیدا نہیں کرسکتا البتہ وہ اس کا رُخ متعین کر دیتا ہے اور اس کا ایک مخصوص راستہ قایم کر دیتا ہے اس حقیقت کی توضیح رومی انقلاب معیار اخلاق سے خوب ہوتی ہے۔ شروع شروع میں اگر کسی شخص کی بابت یہ کہا جاتا کہ وہ بڑا صاحب اخلاق ہے۔ تو رومہ میں ہر شخص یہ معنی لیتا کہ وہ بہت بڑا محب وطن ہے اور جتنی اُس میں وطنیت زیادہ ہے اُسی نسبت سے وہ فضائل اخلاق سے زیادہ آراستہ ہے۔ لیکن مسیحی رہبانیت نے آکر چونکہ اخلاق کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا اس لئے وطن پرستانہ جذبات لامحالہ مردہ ہوگئے۔ اب راہبانہ شغل و ذکر اور زاہدانہ تعبد و استہلاک کے پہلو بہ پہلو یہ صورت واقعات تھی کہ جمہوری زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ حکومت کے ہر شعبہ میں ناانصافی، رشوت خواری و دغا بازی کا بازار گرم تھا۔ فوج پر نامردی و بُزدلی چھائی ہوئی تھی اور عام اہل ملک کے تعیش کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ اغیار کے مقابلہ میں شکست کھاتے تھے مگر عین شکست کے دن سارے وقت کو تھیٹر سرکس وغیرہ مختلف ملاعب کی زندہ دلی میں صرف کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور جو قوت ملک کے تحفظ میں کام آتی اب اُس کا مصرف فقیہانہ موشگافیاں رہ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ عین اُس وقت جبکہ الارک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے پڑا تھا، ائمہ مسیحیت بکمال انہماک مسایل فقہ والٰہیات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت ہزارہا جوان جو ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں آکر داد شجاعت دیتے، اپنے وطن سے کوسوں دُور جنگل و بیابان میں پڑے ہوئے ریاضتوں میں مشغول تھے۔ روم کو فتح ہونا تھا وہ فتح ہوا اور انقلاب حکومت کا جو خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے وہ اہل شہر کو اُٹھانا پڑا۔ لیکن سینٹ آگسٹائن اسی پر فخر کرتے رہے کہ کلیسا پر کوئی آنچ نہیں آنے پائی۔ بلکہ بعض جگہ تو اس سے بھی بڑھکر مظلوم مسیحیوں نے یہ ستم کیا کہ فاتحین کا بڑھکر خیر مقدم کیا (مثلاً افریقیہ میں) درہ تھرماپولی کا سا ناقابل تسخیر درہ بھی غالباً انھیں کی سازش سے مسخر ہوگیا اور آگے چل کر مسلمانوں کو مصر پر جو فتح نصیب ہوئی اس کا بھی ایک بڑا عنصر یہی مسیحی سازش تھی۔ غرض اس طرح کے متعدد واقعات سے

یہ حقیقت بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کے لئے اپنے وطن سے غداری کرنا اب قطعاً کوئی اخلاقی جُرم نہیں رہا تھا بلکہ ایک بڑے سے بڑا مذہبی اور پابند اخلاق شخص بآسانی وطن و ملک کے ساتھ غداری کر سکتا تھا۔ اور اخلاقی تخیل میں یہ انقلاب صاف مسیحیت کا اثر تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں کہ مسیحیوں کا یہ طرز عمل دنیا کے حق میں کہاں تک مفید پڑا؟ لیکن اس قدر بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت میں گھن لگ گیا تھا انحطاط کے علامات پورے پیدا ہو گئے تھے اور اس کا زوال قطعی تھا جو کسی کے روکے نہیں رُک سکتا تھا۔ پھر مسیحیت نے ایسے وقت میں جو کچھ بھی کیا اُس سے اخلاق کو یقیناً ترقی ہوئی۔ ایسے وقت میں مسیحی پادریوں نے نہ صرف اپنے ذاتی خیر و خیرات اور فیاضیوں سے خلق اللہ کو نفع پہنچایا۔ بلکہ اپنی بے طرفی و بے تعلقی کی بنا پر فاتحین کی نظروں میں ایسا اثر و اقتدار پیدا کر لیا جس سے آگے چل کر اُنھوں نے غربا پروری، وادرسی وغیرہ میں بہت مفید کام لیا اور جو ان کے رومی وطن پرست ہونے کی صورت میں ناممکن تھا۔ غرض گو اُن کے طرز عمل کے اِن فوائد کو ہرگز نظر انداز کیا جا سکتا تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے دنیا کے تخیل اخلاق میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی فضائل اخلاق کی فہرست میں وطنیت کا جو درجہ شروع سے سب کو مُسلّم تھا وہ اب بالکل بدل گیا یہ سچ ہے کہ آگے چل کر کبھی کبھی کلیسا کے حدود کے اندر جذبات مذہبیت و وطنیت میں اتحاد ہو گیا۔ لیکن وطنیت کو بطور ایک فرض کے، بطور ایک فضیلت اخلاقی کے کبھی مسیحی اخلاق میں کوئی درجہ نہیں نصیب ہوا۔ بلکہ فقیہانہ رائے ہمیشہ اس جذبہ کو دباتی ہی رہی ہے۔ یا پھر ائمہ کلیسا نے جب جب سیاسی معاملات میں دخل دیا ہے تو ہمیشہ اُن کا مقصد یہ رہا ہے کہ سیاسیات کو مذہب کی ماتحتی میں لائیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ کلیسا کی برابر کبھی کسی جماعت نے اپنے جماعتی اغراض پر ملک و وطن کے فوائد کو قربان نہیں کیا ہے مسیحیت و وطنیت کے اس تنافر کے اسباب خاص میرے نزدیک یہ تین تھے۔ اوّلاً یہ کہ مذہبیت میں

غلو وانہماک بجائے خود دنیوی منافع کی طرف سے انسان کی طبیعت ہٹا دیتا ہے۔ کیونکہ جو شخص نفع اُخروی کی تحصیل میں مصروف رہتا ہے اُسے ان مادی وعارضی منافع کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر مذہب اپنا ایک خاص کلیسا قایم کرتا ہے یعنی جماعت کو ایک خاص منتظم ومرتب شکل میں رکھتا ہے جس کا ایک مخصوص نظام ترکیبی ہوتا ہے۔ ایک مخصوص ضابطہ عمل وطریق کار ہوتا ہے۔ کچھ مخصوص مقاصد واغراض ہوتے ہیں جن کی بناء پر اکثر اُس میں اور ملکی اغراض ومصالح میں تصادم واقع ہو جاتا ہے اور اس لئے حاملین شریعت کی جو قوت دنیوی انتظامات ملکی وسیاسی میں صرف ہوتی وہ ان مذہبی کارفرمائیوں کی طرف منتشر ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ شہداء وطنیت وشہداء مذہب جو اپنے اپنے پیرووں کے حق میں نصب العین کا کام دیتے ہیں۔ وہ بلحاظ اپنے خصائص کے باہم بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ تینوں سبب ہر مذہب کو وطنیت سے مغائر رکھتے ہیں۔ مگر مسیحیت کے حق میں اس کی شدید رہبانیت کی بنا پر اور زیادہ قوی ثابت ہوئے۔

اس اہم بحث کے خاتمہ سے قبل دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) اوّل یہ کہ موجودہ زمانہ کا تخیل علمی وسیاسی زندگی کے باب میں قدماء کے تخیل سے بالکل مختلف ہو گیا ہے۔ قدماء میں رواقیئن اخلاق کو اگرچہ نوعی حیثیت سے دنیا کی تمام چیزوں سے مختلف جانتے تھے۔ تاہم سیاسی زندگی میں حصہ لینا فرض قرار دیتے تھے۔ بخلاف ان کے لذتیئن جو حُسن اخلاق کو افادہ کے مرادف قرار دیتے تھے۔ سیاسی زندگی سے محترز رہتے تھے مسیحی رہبانیت نے اگرچہ اس باب میں رواقیت کی تائید کی کہ اخلاق ومسرت دو بالکل متبائن چیزیں ہیں۔ تاہم اُس نے سیاسی زندگی سے اپنے پیرووں کو ہمیشہ علحدہ رکھا۔ بخلاف اس کے ہمارا موجودہ تجارتی وکاروباری تمدن جو استیصال غلامی کے بعد سے پیدا ہوا ہے برابر سیاسی زندگی کے نشو ونما میں ایک عنصر قوی کا کام دیتا رہا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ اخلاق میں یہ انقلاب تخیل خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جس پر مؤرخین نے کافی توجہ نہیں کی ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اب تک مؤرخین نے، اخلاقی زندگی کے صرف اُن مؤثرات کا استقصا کیا ہی جن کا اثر جماعات پر خاص طور سے نمایاں رہا ہی۔ مثلاً مذہب یا فلسفہ۔ لیکن اُن مؤثرات کو تقریباً یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو افرادکی خانگی اور روزمرہ کی معاشرتی زندگی پر اندرونی اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ حالانکہ میرے نزدیک زیادہ گہرا اثر انھیں آخرالذکر جزئی اور بظاہر حقیر موثرات کا ہوتا رہا ہی۔ مؤرخین کی اس بے اعتنائی کے کم و بیش جملہ مذاہب شکار ہوئے ہیں۔ لیکن مسیحیت خصوصیت کے ساتھ اس کا ہدف رہی ہے۔

فصل (۸)

بازنطینی حکومت کی عام اخلاقی حالت

دورِ مسیحیت میں رومی و بازنطینی حکومت کی عام اخلاقی حالت کا اندازہ کرنے میں آج ہمیں اس کا خصوصیت سے لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ہمارے پیش نظر جو مآخذ ہیں۔ اُن میں اُس وقت کے اخلاقی معائب و نقائص کے درج کرنے میں کس سختی سے کام لیا گیا ہی۔ ہمارے ان ماخذ کے جو مصنفین ہیں وہ خود رہبانیت کے رنگ سے اس قدر متاثر تھے کہ ہر خفیف سی خفیف لغزش ہیں وہ نہایت ہولناک رنگ بھر کر اُسے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ان واقعات کو کہ کچھ عرصہ کے بعد عام مسیحیوں نے ویسا ہی پرتکلف لباس پہننا شروع کر دیا تھا جیسا اُن کے گرد و پیش رائج تھا۔ یا یہ کہ جو مسیحی اب تک قدیم سادگی پر قایم تھے اُن پر یہ لوگ مضحکہ کرتے تھے۔ یا پھر یہ کہ جو لوگ پہلے برائے نام مشرک تھے وہ اب برائے نام مسیحی ہو گئے۔ ان واقعات کو آج ہر شخص معمولی و غیر اہم سمجھے گا۔ لیکن قدیم مورخین کے نزدیک انھیں کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور گویا یہ بہت بڑے اخلاقی جرایم تھے۔ یا پھر قدیم مؤرخین کی، خواہ وہ مسیحی ہوں یا مشرکین ایک عام عادت یہ ہی کہ وہ معاشرتی زندگی کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے

واقعہ کو لے کر اُس کی مذمت و منقصت پر اپنا سارا زور بیان صرف کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں اُن کے زور بیان کے اس اسراف پر حیرت ہونے لگتی ہے۔ اس قبیل کی چند مثالیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جوتنیل نے صفحات کے صفحات ایک امیر کے اوپر اظہار غیظ و غضب کی نذر کر دیئے ہیں۔ اس جرم عظیم پر کہ وہ جس روز کانسل مقرر ہوا ہے اُسی کی شام کو اُس نے اپنے ہاتھ سے شارع عام پر اپنی گاڑی ہانکی! سینکا اس اخلاق شکنی پر آپے سے باہر ہوا جاتا ہے کہ بعض اُمرا مشروبات کو برف میں ٹھنڈا کر کے پیتے ہیں! پلینی صاحب بکمال سنجیدگی فرماتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑا مجرم، سب سے بڑا خاطی، اور سب سے بڑا بداخلاق وہ شخص ہوا جس نے پہلے پہل طلائی انگشتری کا استعمال کیا! آپولیس نے ایک بار کہیں یہ کہدیا تھا کہ دانتوں کو منجن سے صاف رکھنا چاہیئے اس پر اُس کی وہ لے دے ہوئی کہ الاماں۔ بالآخر غریب کو یہ کہہ کر اپنی بریت کرنا پڑی کہ گھڑیال بھی دریائے نیل سے کبھی کبھی باہر آ کر اپنے دانت کھول کر لیٹ جاتا ہے اور کوئی پرندہ آ کر اُس کے دانتوں کو صاف کر جاتا ہے! کلیمنٹ آف الگزنڈریا کا ارشاد تھا کہ مصنوعی بال لگانے والے یا بال دار ٹوپی دینے والے کے بعض مراسم گرجا میں آ کر ناقص رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ جس وقت پادری اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے وہ دراصل اُس کے سر کو نہیں بلکہ مصنوعی بالوں کو مس کرتا ہے! ٹرٹولین کا قول تھا کہ جو لوگ خضاب کا استعمال کرتے وہ صریح اس حکم ربانی کی تکذیب کرتے ہیں کہ "انسان ایک بال کو بھی سفید یا سیاہ نہیں کر سکتا" اور جو لوگ مصنوعی بال لگاتے ہیں اُن کے حشر کا خیال کر کے تو وہ لرز اُٹھتا تھا! یہ خیال اس قدر دیرپا ثابت ہوا کہ بہت آخر زمانہ تک قایم رہا۔ صدیاں گزر گئیں رومی سلطنت کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ ملک میں معاصی و رذایل کے صدہا سیلاب آ اور جا چکے۔ لیکن جو صور کلیمنٹ آف الگزنڈریا پھونک گیا تھا۔ اُس کی صدائے بازگشت سینٹ ایمبروز، سینٹ جروم و سینٹ گریگوری نیزیانزن کے صفحات سے برابر آتی رہی۔

لیکن ان بیانات سے ہمارا یہ مقصود نہیں کہ ہم اُس زمانہ کی اخلاقی زندگی کو بے عیب یا
موجودہ حالت سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کے تذکرہ سے ہمیں ناظرین کو محض محتاط و خبردار کر دینا
منظور تھا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ پادری مصنّفین کے روایات کو کافی مبالغہ آمیز مان لینے کے بعد
بھی اس زمانہ کا اخلاقی انحطاط بالکل ثابت شدہ رہتا ہی۔ رومی معاشرت کی جو تصویر ایمینس ماریلینس
نے کھینچی ہی، مارسیلز کی زندگی کی جو تصویر سیلوین نے کھینچی ہی اور ایشیائے کوچک و قسطنطنیہ کے
حالات کا جو نقشہ کریزوستم نے کھینچا ہے اور جن کی تائید متعدد مؤرخین اور صدہا دیگر مُصنّفین کے
ضمنی بیانات سے ہوتی ہی اُن سے یہ حقیقت بالکل مُسلّم ہو جاتی ہے کہ اخلاقی انحطاط جیسا اُس وقت
میں تھا اس سے زیادہ شاید ہی کسی زمانہ میں رہا ہو۔ اور یہ اُمرا یا اوباشوں کے طبقہ تک محدود نہ تھا
بلکہ ارباب تقدس کا دامن اس میں خصوصیت کے ساتھ آلودہ نظر آتا تھا۔ مذہبی ضیافتیں جن کا
مقصد مسیحیوں میں باہم اخوت پیدا کرنا تھا۔ اب بادہ نوشی و بدچلنی کی تماشہ گاہ رہ گئیں تھیں۔
اور کن مشکلوں سے جا کر ساتویں صدی میں بند ہوئیں۔ شہدا، کی برسیوں یا سالانہ فاتحوں کا بھی
یہی حشر ہوا۔ اُن کی یاد و تذکرہ کے بجائے وہاں میلہ لگنے لگے اور شہوت رانی و بدچلنی کو گویا
ایک مرکز ہاتھ آگیا۔ یہاں تک کہ بالآخر اسی علت میں انھیں بند کر دینا پڑا۔ ازدواج کے بارہ میں
پادری تو شروع ہی اس کی مخالف رائے پر عمل کرتے تھے۔ یعنی مجرد رہا کرتے تھے۔ لیکن اس تجرد
کے پردہ میں ناجائز تعلقات کا وجود بھی سینٹ سایپرین ہی کے زمانہ سے تھا جو قسطنطین کے
بعد سے بہت ترقی پکڑ گیا اور پادریوں پر بدچلنی کا الزام علانیہ لگایا جانے لگا۔ اکثر یہ ہوتا کہ
بن بیاہیاں اور پادری تنہا ایک مکان میں رہتے۔ بلکہ ساتھ نہاتے، بلکہ ایک ہی بستر پر ساتھ
سوتے اور یہ دعویٰ کرتے رہتے کہ ہم نے اس قدر ضبط نفس حاصل کر لیا ہی کہ باوجود اس قدر
اختلاط کے کبھی جذبہ جنسی کو تحریک نہیں ہوتی۔ امیر بیواؤں کے گرد پادریوں کا ایک ہجوم
رہا کرتا جو ہر وقت اُن کی خوشامد میں مشغول رہتے تاکہ انھیں خوش کر کے اُن کے ترکہ پر قبضہ
کریں یا نذر کے نام سے کچھ حاصل کریں۔ یہ مرض اس قدر متعدی ہوا کہ بالآخر ولینٹینین کو

قانوناً اس کی ممانعت کرنا پڑی کہ کوئی پادری کسی غیر کی جائداد کا وارث بن سکے اور سینٹ جروم افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ اس قانون کی سخت ضرورت تھی۔ بہت سے لوگ اس لئے گرجا کے خدام بننے لگے کہ ملکی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتے تھے اور بہت سے افراد راہبوں کے حلقہ میں ایسے شامل تھے جو محض اس لئے کہ ہاتھ پیر ہلا کر روٹی کھانا نہ پڑے۔ خانقاہ میں جا کر راہب بن گئے تھے۔ صدہا سپاہی جنگی خدمت سے جی چرا چرا کر اسی طرح راہبوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اونچے طبقہ کی عورتوں کو کسی نیچے طبقہ کے شخص سے آشنائی پیدا کرنے کا سب سے آسان ذریعہ یہ معلوم تھا کہ خانقاہ نشین ہو جائیں۔ فلسطین جو زائرین کا مرجع عام تھا سینٹ گریگوری کے زمانہ میں شہوت رانی کا چکلہ ہو کر رہ گیا تھا اور یہ حالت چند روزہ نہ تھی، بلکہ صدیوں تک قائم رہی چنانچہ آٹھویں صدی میں سینٹ بونیفیس اپنے ایک خط میں آرچ بشپ آف کنٹربری کو تحریر کرتا ہے کہ "خدا کے واسطے اپنے وطن کی عورتوں کو شوق زیارت سے رد کیجئے" کیونکہ لنڈن سے لے کر روم تک یورپ کا کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جس میں انگریزی خواتین علانیہ طوائفوں کا پیشہ اختیار کئے نہ ہوں۔ اس زمانہ کے پادریوں کے کھانے پینے اور طرز معاشرت کو دیکھئے تو (بقول سینٹ جروم کے) معلوم ہوگا کہ بڑے بڑے امراء دولت ان کے آگے ماند ہیں۔ اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے تو وہ اور اُن کے پیرو جو جوڑ توڑ کرتے تھے ان کی شہادت گرجا کی تاریخ کے ہر صفحہ پر ثبت ہے۔

یہ حال تو مذہبی دنیا کا تھا۔ دنیا داروں کی عام دنیا کی اس وقت سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت طفل مزاجی تھی۔ اخلاقی قوت یوں خواہ اس وقت مشرکوں کے زمانہ سے زائد ہو مگر جو کچھ تھی سب صحرا کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور اس لئے دنیا پر اُس کا کوئی خاص اثر نہیں باقی رہا تھا۔ اس زمانہ میں لوگوں میں جو طفلانہ خرابی پھیل گئی تھی، اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مذہبی، سیاسی، علمی مناقشہ سب دب گئے تھے۔ اور ان کی جگہ جس چیز پر روز بلوہ و فساد، بلکہ کشت و خون اور بغاوت تک کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ گاڑیوں کی

دوڑ میں کس فریق کی فتح ہوگی اور کس کی شکست؟ جرأت و دلیری اور وطن پرستی کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور خلقت میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرایش اپنے شباب پر تھیں۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد و راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی و بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہوگیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ رائے جمہور اس قدر ضعیف ہوگئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہوسکتا تھا۔ لیکن اُسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہوسکتے ہیں۔ مکاری، دغابازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم، تشدد، شقاوت، وبحیائی اتنی نہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ حریت فکری، آزادخیالی و جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔

لیکن ان معائب و نقائص کے ذکر کے ساتھ "عیب مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو" کے سر رشتہ اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے۔ اور اس دور میں جو کچھ محاسن تھے ان کا بھی پورا اعتراف کرنا چاہیئے۔ رذائل بالا کے پہلو بہ پہلو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت سے فضایل بھی بھی موجود تھے اور یہ سب مسیحیت کے پیدا کردہ تھے۔ مناظر سیافی و مغرب کی حکومت (یعنی روم) سے بالکل رخصت ہوگئے تھے اور مشرقی حکومت (یعنی قسطنطنیہ) میں تو اُن کا قدم ہی آنے نہ پایا۔ طوائفوں کے بڑے بڑے چکلے جو زہرہ کے مندروں میں قایم تھے یکسر بند کر دئے گئے تھے اور مذہب بجائے خود بدچلنی و شہوت پرستی کا محرک نہیں باقی رہنے پایا تھا۔ قدیم فحش تصویریں اور نقاشیاں جن کے آثار اب تک موجود ہیں، امرا کی ضیافتوں کا یہ دستور کہ خواصیں برہنہ ہوکر کھانا کھلاتی تھیں۔ جرایم خلاف وضع فطرت جن کا رومی فرماں روا تک

علانیہ ارتکاب کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں ایک ایک کرکے رخصت ہوگئی تھیں۔ شہوت پرستی
اب بھی زوروں پر تھی۔ تاہم اُس کا اعلان اور اُس کے غیر فطری طریقہ مسدود ہو گئے تھے۔
گرجا کی ایک پُر قوت جماعت ہونے کا یہ اثر تھا کہ لوگوں پر اخلاق کی ایک ہیبت طاری ہوگئی
تھی۔ نیکی کی انھیں ترغیب ہوتی تھی اور بدی کی طرف سے ایک جھجک قایم تھی۔ لوگ گناہ کرتے
تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی دہشت دلوں پر طاری رہتی تھی کہ عاقبت میں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔
صحت و خوشحالی میں ممکن ہے کہ خدا کو بھولے رہتے ہوں لیکن بیماری و مصیبت کے وقت فوراً
خدا یاد آجاتا تھا۔ یا جب کسی معصیت کا ارتکاب کرنے لگتے۔ تو ضمیر کی ملامت شروع ہوجاتی
اور ضمیر کی ملامت بھی نہ سہی تو کم از کم دنیا کے سامنے اپنی رسوائی و ذلت کا خوف ہر حال
لگا رہتا تھا۔ غرض وہ بے خوفی، ڈھٹائی اور بے شرمی۔ جو مشتر گنہگاروں میں تھی مسیحیت کے
اثر سے جاتی رہی تھی اور ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہ ہونا چاہیئے کہ گو مشرکوں کے بڑے
سے بڑے متقی و پاک باز مسیحیوں کے بڑے سے بڑے متقی و پاک بازوں کی ٹکر کے تھے۔ تاہم
مسیحیوں کے بڑے سے بڑے گنہگار و مجرم، مشرکوں کے بڑے سے بڑے گنہگاروں و مجرموں
کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ مشرکوں کی سیہ کاریاں مسیحیوں کی سیہ کاریوں سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں۔ مسیحی واعظین کے اثر سے
خیر و خیرات کے بھی بہت سے طریقے رائج ہوگئے تھے۔

فصل (۹)

دَوُرِ رہبانیت کے فضائل مخصوص

پچھلی فصل میں مسیحیت کے عام اثرات کا بیان تھا۔ خالص رہبانی اثرات کا سُراغ لگاتے
ہوئے جیسا کہ بعض پچھلی فصلوں میں گزر چکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت کے بالکل ابتدائی اثرات
تمام تر مُضر تھے۔ مصلحوں کا ترک دنیا کرکے جنگل و بیابان کو ہجرت کر جانے اور دنیا کے سامنے

تزکیہ نفس کا ایک غلط نصب العین کے پیش ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداً کئی صدیوں تک یورپ کی اخلاقی زندگی میں کوئی اصلاح نہ ہو سکی۔ تاہم بعض فضائل اخلاق شروع ہی سے رہبانیت کے جلو میں تھے۔

سب سے زیادہ حقیقی اخلاقی ترقی کی بنیاد، ایثار و خود فراموشی پر ہے۔ رفق و لطف متانت تہذیب، اعتدال وضبط، یہ سب بجائے خود فضائل اخلاق کے عنوانات صحیح ہیں تاہم نفس بشری کی اصلی عظمت و شرافت کا پتہ ان سے نہیں چلتا۔ اس کے لئے ان سے بالاتر جانا چاہئے اس کا صحیح معیار یہی ایثار ہے اور یہی نصب العین زہاد و راہبین نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور خود اس پر عمل کیا۔ ان کے طرز عمل میں گو اتنی خامی ضرور رہ گئی تھی کہ ایثار کو وہ اپنی روحانی خود غرضیوں کی آمیزش سے پاک نہیں رکھ سکتے تھے۔ تاہم اتنا بھی دنیا میں کون کرتا ہے کہ ثواب آجل کے لئے ہزار ہا لذائذ عاجل سے دست بردار ہو جائے اور مال و دولت، بال بچہ، عزت و شہرت سب کو چھوڑ چھاڑ کر صحرا نشینی اختیار کرے۔ ایسے نازک وقت میں جبکہ ساری دنیا پر دولت کی حکومت تھی اور اس سے اہل کلیسا بھی مستثنیٰ نہیں رہے تھے یہ صدا صرف راہبوں کے حلقہ سے بلند ہوتی تھی، کہ

"انسان کے حق میں محنت، آرام سے بہتر، گمنامی، نام و نشان سے بہتر، اور داد و دہش، قبول عطیات سے بہتر ہے"

یا پھر جس زمانہ میں کہ ائمہ کلیسا اپنی خفیف الحرکتی سے نام پیدا کر رہے تھے، رہبانی جماعت کی طرف سے یہ ندا آتی تھی کہ

"راہبو، حذر کرو، دو جماعتوں کے قربت سے حذر کرو، ایک عورتوں سے دوسری پادریوں سے"

یہ صدائیں بے اثر نہیں رہ سکتی تھیں اور الفاظ سے زیادہ موثر راہبوں کا طرز عمل تھا ان کی بدقطع شکلیں نفرت انگیز وضعیں، اور وحشت خیز ریاضتیں ہی غیر متمدن دماغوں پر اور زیادہ اثر ڈالتی تھیں لوگوں کے عام تخیل میں راہب کی تصویر یہ تھی کہ ایک لانبی سفید ڈاڑھی والا شخص

جس کے چہرہ پر نور برس رہا ہے۔ بکمال سکون تاڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ شیاطین آ آکر وسوسہ اندازی کرنا چاہتے ہیں مگر اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ جنگلی درندے اُس کے اشارے پر کام کرتے ہیں اور درد دکھ بیماری کاہلی کو وہ ایک جنبش لب سے فوراً دفع کر سکتا ہے۔ اس تخیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مقدس بزرگوں کے متعلق صدہا قصے و افسانے ملک میں شائع ہو گئے۔ یہ قصے عموماً مہمل و مضحکہ انگیز ہیں۔ تاہم اپنے اندر اعلیٰ ترین اخلاقی نتائج رکھتے ہیں۔ یہ اس قدر شائع ہو گئے تھے کہ مائیں اپنے بچوں کو سلاتے ہوئے انھیں کو بطور کہانیوں کے بیان کرتیں اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کا دائرہ نہایت وسیع ہوتا جاتا۔ ذیل میں ہم ناظرین کے تفنن و واقفیت کے لئے ایک آدھ کہانی اس طرح کی درج کرتے ہیں:-

سینٹ انٹونی کو بیٹھے بیٹھے ایک شب کو یہ خیال گزرا کہ اس سے بڑا زاہد تمام صحرا میں کوئی نہیں۔ معاً القا ہوا کہ "نہیں ایک زاہد تم سے بھی زیادہ برگزیدہ ہے" یہ معلوم کر کے سینٹ انٹونی کو اس کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور صبح وہ اس کی تلاش میں سفر کو نکلا۔ راستہ میں اُسے عجیب الخلقت انسان ملتے رہے۔ مثلاً ایسے کہ جن کے سر پر سینگ تھے اور جن کے پیر بکریوں کے سے تھے۔ اُنھوں نے منزل مقصود کا پتہ بتایا یہاں تک کہ سینٹ انٹونی سینٹ پال کے دروازہ پر پہنچا جس کی عمر اس وقت ۱۱۳ سال کی تھی۔ اسے پہلے دروازہ کھولنے میں تامل ہوا۔ لیکن بالآخر کھول دیا۔ اور جب سینٹ انٹونی سے بغلگیر ہو چکا تو دنیا کی حالت سے متعلق سوالات شروع کئے۔ مثلاً یہ کہ اب بھی دنیا میں نئے نئے مکانات تعمیر ہوتے ہیں؟ اب بھی دنیا میں بت پرستی کا وجود ہے؟ وغیرہ۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک کوا ایک چپاتی لا کر ڈال گیا۔ سینٹ پال نے کہا کہ "ساٹھ برس گزرے کہ میرا رازقہ آدھی چپاتی روز کا ہے۔ یہ آج پوری روٹی تمہارے حصہ کے لئے آئی ہے" یہ کہکر دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک چشمہ کے کنارے کھانے کو بیٹھے۔ لیکن اب ایک سخت غامض مسئلہ چھڑ گیا۔ وہ یہ کہ ابتدا کون کرے؟ سینٹ پال کہتا تھا کہ "آپ مہمان ہیں، حق تقدیم آپ کو حاصل ہے" سینٹ انٹونی

اس کے جواب میں یہ استدلال پیش کرتا تھا کہ آپ میرے بزرگ ہیں۔" آپ کا سن ۱۱۳ سال کا
ہے اور میں ۹۰ سال کا ہوں"۔ کئی گھنٹے گزر گئے اور اس نازک بحث کا کسی طرح تصفیہ نہ ہو سکا
تاآنکہ جب بالکل شام ہو گئی۔ تب یہ خیال پیدا ہوا کہ اس چپاتی کو دونوں ایک ساتھ اپنی اپنی
طرف کھینچیں چنانچہ اسی فیصلہ پر عمل ہوا۔ چند روز کے بعد سینٹ پال کا انتقال ہو گیا۔ سینٹ
انٹونی کے دست و بازو میں اتنی قوت نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں تجہیز و تکفین کرتا۔ اس فکر میں تھا کہ
دو قوی ہیکل شیر جنگل سے نکلے۔ انھوں نے قبر کھود کر نعش کو دفن کیا۔ قبر پر روئے اور پھر
سینٹ انٹونی کے آگے سر جھکا کر برکت چاہی۔

یہ قصہ سینٹ جیروم بکمال سنجیدگی و پختگی اعتقاد بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جو
اس کی صداقت میں شک کرے وہ ملحد و زندیق ہے۔ اسی طرح مورخ پیلیڈیس روایت
کرتا ہے کہ میں نے سینٹ پیکیریس کے سفر کا حال خود انھیں کی زبان سے یہ سنا ہے کہ جب
انھیں اُس مشہور طلسمی باغ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا جس پر شیاطین کی عملداری ہے اور وہ
اس قصد سے نکلے تو متواتر نو دن تک وہ ستاروں کی مدد سے سفر کرتے رہے اور راستہ
یاد رکھنے کے لئے برابر لکڑیاں گاڑتے جاتے تھے۔ لیکن شیاطین یہ تدبیر نہیں چلنے دیتے
تھے اور لکڑیاں اکھاڑ کر روزرات کو اُن کے سرہانے رکھ دیتے تھے۔ جب وہ باغ نزدیک
آگیا تو ستر ذریات شیطان نے نکل کر اُس سے کہا کہ "کیوں ہمیں دق کرنے آئے ہو"۔ مگر پیکیریس
نے کہا کہ "میں صرف یہاں کے عجائب دیکھنے آیا ہوں"۔ تم سے کچھ تعرض نہ کروں گا۔ چنانچہ
اُس نے باغ کی سیر کی اور بیس دن کے بعد اپنے زاویہ کو واپس پہنچا۔

اس طرح کے صدہا قصہ اور مشہور ہیں جو اس قدر مستبعد تو نہیں۔ مگر جن میں اخلاقی سبق ان سے
بہتر نکلتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب ہی سینٹ میکریس بیمار پڑا اور کسی مُرید نے انگور لا کر دئے تو اس نے
کسی اور راہب کے نذر کر دیئے اُس نے بھی کسی تیسرے راہب کے نذر کر دیئے یہاں تک کہ سارے
صحرا کا چکر لگا کر بالآخر وہ پھر خود سینٹ میکریس کے پاس واپس آگئے۔ یہی زاہد ہمیشہ خلوت

ہیں گدلا پانی پیتا تھا۔ لیکن جب کوئی دوسرا راہب شراب پیش کرتا تو اس کی خاطر شکنی کے
خیال سے یہ کبھی انکار نہ کرتا اور اس کے بعد اس کا کفارہ یوں کرتا کہ جتنے جام شراب کے
پیئے تھے اُتنے دنوں سادہ پانی تک نہ پیتا۔ اسی کے ایک مُرید نے ایک بار یہ دیکھا کہ
ایک مشرک بڑی سی لاٹھی ہاتھ میں لیئے ہوئے بہت تیزی سے صحرا کی طرف لپکتا جا رہا
ہے۔ اور پکار کر پوچھا کہ "اے دیوزاد کہاں چلا؟" مشرک کو سخت غصہ آیا اور اُس نے اُسی
لاٹھی سے ان کی خوب مرمّت کی۔ مار پیٹ کر کے چلا ہی تھا کہ سینٹ میکریس کا سامنا ہو گیا
جس نے اس فروتنی و انکسار کے ساتھ اس سے خطاب کیا کہ مشرک کا دل موم ہو گیا وہ
فوراً عیسائی ہو گیا اور جسے ابھی زدوکوب کیا تھا اُس کی تیمارداری و علاج میں مصروف ہو گیا
سینٹ آیونیس ایک بار سینٹ کیمن کی ملاقات کو گیا۔ میزبان نے روٹیاں لا کر سامنے رکھیں
مہمان نے کہا کہ "قبل غروب آفتاب میں منہ پر کبھی دانہ نہیں رکھتا" میزبان نے اصرار کیا
اور جب وہ بھی ناکام رہا تو کہا کہ "آہ! مجھے کس قدر ندامت ہے کہ تم مجھے ایک زاہد سمجھکر ملنے
آئے مگر آکر دیکھا تو ایک شکم پرست شخص پایا" اس پر مہمان نے کہا کہ "آپ آزردہ نہ ہوں
آپ کی آزردگی کے مقابلہ میں میں گوشت تک کھا لینے کو تیار ہوں" جب کھانا ہو چکا تو
میزبان نے کہا کہ "بھائی دستور میرا بھی وہی ہے جو تمہارا ہے۔ لیکن مہمان نوازی کا ثواب
ثواب صوم سے زیادہ ہے" ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک امیر خاتون جس وقت ایک راہب کی
مہمان نوازی میں مصروف تھی، اس کا بچہ کنوئیں میں گر پڑا۔ مگر راہب کی کرامت یہ تھی کہ اسے
ذرا گزند نہیں پہنچا۔ سطح آب پر بے تکلف لیٹا رہا اور بعد کو اپنی ماں سے بیان کیا کہ "جس وقت
میں کنوئیں میں گرنے لگا ہوں میں نے دیکھا کہ راہب نے ہاتھ پھیلا کر مجھے گود میں لے لیا"
سینٹ میکریس کی بابت ایک اور روایت یہ مشہور ہے کہ اُس پر ایک بار یہ القا ہوا کہ کسی
پڑوس کے شہر میں دو شادی شدہ عورتیں اس سے زیادہ برگزیدہ ہیں۔ حالانکہ ازدواج
برگزیدگی میں اُس وقت تناقض سمجھا جاتا تھا۔ سینٹ موصوف جا کر اُن سے ملا اور ان سے

اُن کے تقدس کا راز پوچھا۔ انھوں نے پہلے تو کانوں پر ہاتھ رکھکر کہا "ہمیں تقدس و برگزیدگی سے کیا واسطہ، آج ہی رات کو ہمارے شوہروں نے ہم سے صحبت کی ہے۔ ہم میں کیا نیکی پیدا ہو سکتی ہے؟" مگر جب سینٹ کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو انھوں نے بیان کیا کہ "ہم دونوں دو بھائیوں کی بیویاں ہیں۔ اور پندرہ سال سے ہم نے کبھی کسی پر غصہ نہیں کیا ہے۔ ہم نے اپنے شوہروں سے بہت منت کی کہ ہمیں چھوڑ دیں مگر انھوں نے ہمیں نہ چھوڑا۔ تب سے ہم نے یہ عہد کر لیا ہے کہ کبھی کوئی گناہ کی بات مُنہ سے نہ نکالیں گے۔" اس پر سینٹ بے اختیار چلاّ اُٹھا کہ "واللہ، خدا ازدواج و تجرد، اور خانقاہ نشینی و دنیاداری کو نہیں دیکھتا بلکہ دل اور نیت کو دیکھتا ہے۔ اور برگزیدہ ہیں وہ جن کی طبیعت نیک ہے۔"

فصل (۱۰)

حیوانات پر شفقت

روایات بالا کی طوالت سے شاید بعض ناظرین اُکتا گئے ہوں لیکن میں نے اس طوالت کو اس لئے اختیار کیا کہ ان کی مدد سے اُس وقت کے مسیحیوں کے اصلی اندرونی جذبات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں میں فصل ہذا میں اُن قصوں اور روایتوں کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو راہبان صحرا اور حیوانات کے باہمی تعلق سے متعلق شائع تھیں۔ ان کا تذکرہ اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان سے تاریخ اخلاق کے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے کہ حیوانات کے ساتھ ہمدردی و شفقت کا خیال کیونکر پھیلا۔ یہ خیال قدماء کے یہاں ناپید نہ تھا بلکہ ان کے ہاں متعدد روایات ایسی مشہور تھیں جن میں حیوانات کے ساتھ اعلیٰ ذہنی و اخلاقی قویٰ کا انتساب کیا گیا تھا جس سے یہ بھی ضمناً پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ علم الحیوانات اور حیوانی خصائص سے کس قدر ناواقف تھے۔ ہاتھی کے دانشمند و فیاض ہونے کا عقیدہ عام طور پر شائع تھا بلکہ اس کی

ایک گونہ پرستش ہوتی تھی۔ شہد کی مکھیوں کے بارہ میں یہ یقین تھا کہ جب اُن سے خلاف آئینِ حکومت کوئی فعل سرزد ہوتا ہے تو وہ خودکشی کر ڈالتی ہیں۔ یا بعض اور حیوانات اپنے بچّوں کے تغذیہ کے لئے خودکشی کر لیتے ہیں۔ ایک عقاب کی بابت مشہور تھا کہ وہ ایک نوعمر لڑکی پر عاشق تھا اور جب اُس کی وفات پر اُس کی نعش جلائی جانے لگی تو عاشق نے بھی اپنے تئیں شعلوں پر گرا کے اپنی جان دیدی۔ اور کتّوں سے متعلق تو دو ایک نہیں صدہا قصّے اس کے مشہور تھے کہ اپنے آقاؤں کے ساتھ اُنھوں نے بھی اپنی جان دیدی۔ بعض حکماء کا مقولہ تھا کہ حیوانات میں مثل انسان کے روح وعقل ہوتی ہے اور فیثاغورس تو اس کا قایل تھا کہ انسانی روحیں بہ قاعدہ تناسخ حیوانات میں منتقل ہوجاتی ہیں۔ رواقیہ اور بعض اور حکماء کا یہ مسلک تھا کہ روح انسانی و روح حیوانی دونوں روح ربّانی کے برابر درجہ کے مظاہر ہیں۔

خیر، یہ تو افسانہ تھے۔ لیکن ان کے علاوہ تحفظ حیوانات کے قانونی آثار بھی قدماء کے یہاں ملتے ہیں۔ زراعت کا دارمدار چونکہ زیادہ تر بیل پر ہے۔ لہذا یہ شروع سے مختلف ممالک میں خاص طور پر مقدس سمجھا گیا ہے۔ مثلاً مصر میں۔ اور توریت میں تو بیل کے ساتھ بدسلوکی کی خاص ممانعت آئی ہے۔ روم قدیم میں اس خیال میں اس قدر مبالغہ کیا گیا کہ بیل کو ہلاک کرنا، قتل عمد انسانی کے مرادف سمجھا جانے لگا۔ اور منقول ہے کہ اسی طرح کا ایک قانون یونان قدیم میں بھی رائج تھا۔ مور کا احترام بھی یونان و یروشلم میں یکساں فرض تھا۔ کوئی پرندہ جب کسی انسان کے پاس آکر پناہ لے تو اس کی حفاظت کرنا اور اسے رہائی دینا فرایض میں داخل تھا۔ بلکہ ایک روایت یہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ یونان میں کوئی بچّہ پرندوں کے ساتھ بیرحمی سے پیش آیا تھا۔ اس کی پاداش میں اسے سزائے موت دیدی گئی۔

ارتقاء اقوام کی رفتار کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بیدردی و بہیمی سے ذکی الحسی و دردمندی کی طرف صعود ہوتا رہتا ہے۔ جو انسانیت و لطافتِ شائستگی کا سنگ بنیاد ہے۔ لیکن اس عام

رفتار میں بعض خاص حالات سے رُکاوٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت یہاں بھی پیش آئی
قوانین بالا کا مقصد یہ تھا کہ بیل وغیرہ کار آمد حیوانات کے تحفظ کے ذریعہ سے ایک خانہ بدوش
وجنگجو قوم میں زراعت پیشگی کے عادات پیدا کئے جائیں۔ لیکن اس رحیمانہ احساس کے بڑے
دشمن وہ کھیل یا بازیاں ثابت ہوئیں جن میں حیوانات کی خونریزی لازمی تھی یونان قدیم
میں بیل بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی کا دستور عام تھا اور حکومت کی طرف سے اس کی اور
تائید واشاعت ہوتی تھی تاکہ اہل فوج جرأت وشجاعت کا ان سے سبق حاصل کریں۔ رومہ
قدیم میں ان چیزوں کی جو افراط تھی اُس کا ذکر پیشتر گزر چکا ہے۔ لیکن جس طرح ہم یہ پہلی جلد کے
کسی باب میں دکھا چکے ہیں کہ باوجود مناظر سیانی کی کثرت کے انسانیت کا معیار گرنے نہیں
پایا تھا۔ اسی طرح یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ باوجود حیوانات کی خونریز جنگوں اور بازیوں کے
خود رومی لٹریچر، اور نیز اُن ممالک کے لٹریچر میں جو روم کے ماتحت تھے حیوانات کے ساتھ
بہ لطف وشفقت پیش آنے کے بہ کثرت نظایر ملتے ہیں۔ ورجل، لُکریشیس، پلوٹارک، آوِڈ،
جونیل، اپولونیس، وآرین، ان سب کے یہاں یہ خیال کسی نہ کسی پیرایہ میں ملتا ہی۔
ایمفی تھیٹر (جانوروں کے دنگل) میں صدہا حیوانات کے کٹنے کے ساتھ ساتھ اس احساس کا قایم رہنا بجائے خود
حیرت انگیز ہی۔ لیکن اس سے بڑھکر یہ کہ صرف یہ احساس ہی نہیں موجود تھا بلکہ اس کی متعین طور
پر تعلیمات موجود تھیں۔ فیثاغورث وایمپیڈوکلس نے اس تعلیم کی بنا تناسخ ارواح پر رکھی تھی
یعنی اس مسئلہ پر کہ وہی ارواح ادل بدل کر انسان وحیوان کے قالبوں میں آتی جاتی رہتی ہیں
اور فلسفۂ فیثاغورث کی اشاعت کے ساتھ اس عقیدہ کی تعلیم بھی عام ہوتی گئی۔ پارفری نے
ترک لحم کی تلقین کی اور سنیکا نے کچھ روز کے لئے اس پر عملدرآمد بھی کیا۔ لیکن ان سب سے
بڑھ چڑھ کر کارنامہ پلوٹارک کا تھا۔ اُس نے تناسخ سے بالکل قطع نظر کرکے شفقت حیوانات
کو فرایض انسانی میں داخل کیا اور اس شد ومد سے اس کی وکالت کی کہ اس کی نظیر مسیحی
لٹریچر میں بھی کم از کم سترہ سو سال تک نہیں ملتی۔ وہ اس کا قایل ہے کہ حیوانات کے ساتھ

حُسن سلوک اسی قدر قطعی ولازمی ہے، جتنا خود بنی نوع انسان کے ساتھ اور ایمفی تھیٹر کے مناظر وغیرہ کی پرجوش مخالفت کرتا ہی۔

مسیحیت کا دور اولی اس کا مویدنہ تھا۔ کہیں کہیں اتفاقی طور پر اس زمانہ میں بھی پادری ترک لحم وشفقت حیوانات کے باب میں تلامذۂ فیثاغورث کی بولی بول گئے ہیں۔ تاہم عام حالت یہ تھی کہ اُن کے عقیدۂ تناسخ کی کُلّی تغلیط ہوتی تھی۔ نوع انسان جملہ انواع عالم سے کلیتہً واصولاً ممتاز سمجھی جاتی تھی، اور تمام فرایض انسانی کا دائرہ صرف بنی انسان تک محدود تھا۔ بلکہ اس خاص باب میں تو انجیل سے زیادہ توریت نے کام کیا ہی کہ اُس میں حیوانات کے ساتھ حسُن سلوک کے اگر صریح احکام نہیں مقرر ہیں تو کم از کم ایسے اشارات تو بہ کثرت ہیں جن سے دل میں اس کا احساس پیدا ہو جاتا ہی۔

لیکن مسیحی شریعت میں حقوق حیوانات کے متعیّن نہ ہونے کی تلافی ایک دوسری صورت سے ہوگئی، یعنی راہبوں کے طرز زندگی سے۔ صحرا و بیابان میں تن تنہا رہنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حیوانات کے ساتھ زیادہ تعلقات پیدا ہوں اور اس بنا پر عوام کے ذہن میں راہبانہ زندگی کا جو تخئیل تھا اُس کا ایک لازمی عنصر حیوان دوستی بھی ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ تخئیل طرح طرح کے افسانوں میں جلوہ دکھلانے لگا۔ مثلاً یہ کہ پرندہ پیرِ صحرا کی آواز پر اپنی پرواز روک دیتے ہیں، شیر اُس کے قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں اور راہب کا دل اگرچہ اپنی ہمجنسوں کی محبت سے خالی ہوتا ہی۔ تاہم اپنے ان احباب صحرائی کے لئے ہمدردی والفت رکھتا ہے اور اس کی تقدس وبرگزیدگی اس کے ہمنشینوں میں بھی سرائت کر جاتی ہے۔ سینٹ پقیون جب سفر کے لیے باہر جاتا تھا تو درندے رفقاء سفر کا کام دیتے تھے اور وہ اس رفاقت کے معاوضہ میں انھیں اپنے کنوئیں کا پانی پلاتا تھا۔ مصر کے ایک راہب نے بیابان میں ایک خوشنما باغ تیار کیا تھا اور وہاں ایک تاڑ کے نیچے بیٹھکر شیروں کو اپنے ہاتھ سے پھل پھلاری کھلاتا تھا۔ سینٹ پومن ایک بار رات کے وقت سردی سے لرز رہا تھا کہ ایک شیر نے آکر اُس کے سارے

جسم کو چھالیا اور اس طرح سردی کی اذیت سے وہ محفوظ ہو گیا۔ شیر متعدد راہبوں کی خدمات کیا کرتے تھے۔ بلکہ بعض بعض کی تجہیز و تکفین تک انھیں نے ہی کی ہے۔ ایک ضعیف العمر راہب ایک مرتبہ پیدل سفر کر رہا تھا۔ اور اپنا اسباب ایک گدھے پر بار کئے ہوئے تھا۔ راستہ میں ایک شیر نے گدھے کو ہلاک کر ڈالا۔ لیکن اس کے بعد راہب کے اشارہ پر اُس کا اسباب خود اپنی پشت پر بار کر کے منزل مقصود تک پہنچا آیا۔ ایک اور راہب نے ایک مرتبہ جنگل میں جنگلی گدہوں کے ایک جھنڈ کو آواز دی جس میں سے ایک گدھا نکل کر آیا اور وہ ان کا سامان بار کر کے ساتھ چلا۔ بعض راہبوں نے گھڑیال و دیگر دریائی جانوروں کی پشت پر سوار ہو کر دریائے نیل و سمندر کو عبور کیا ہے اور آہوؤں کے تذکرہ تو ان قصوں میں نہایت کثرت سے آتے ہیں جن میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ قصہ یہ ہے کہ ایک شکاری ایک آہو کا تعاقب کر رہا تھا کہ دفعتاً آہو نے اپنی اصلی شکل اختیار کر لی یعنی خود مسیح کی اور اس کی پیشانی پر صلیب لٹک رہی تھی یہ معجزہ دیکھکر شکاری معاً ایمان لے آیا۔ سینٹوں کی جماعت میں متعدد سینٹ ایسے ہوئے ہیں جو خاص خاص نوع حیوانات کے مخصوص پیر یا سینٹ ہوئے ہیں۔ مثلاً سینٹ ارلیمس بیلوں کے پیر ہوئے ہیں۔ اسی طرح کوئی سوروں کا ہوا ہے۔ کوئی آہوؤں کا، کوئی کووں کا وغیرہ سینٹ گولیٹرز کے تین رفیق تھے، ایک مرغ، ایک چوہا، اور ایک مکھی۔ مرغ کا کام یہ تھا کہ اوقات عبادت پر بانگ دیتا تھا اور اگر راہب کو اُٹھنے میں دیر ہوتی تو چوہا اس کا کان کترنے لگتا۔ اور مکھی کا فرض یہ تھا کہ دوران مطالعہ میں راہب کو اگر کسی وقت اپنی نظر ہٹا لینا پڑتی تو مکھی عین اُس لفظ پر بیٹھ جاتی جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔ اور اس طرح نشان کا کام دیتی۔ ایک اور راہب کا معمول تھا کہ شب کا کھانا ایک بھیڑیئے کے ساتھ کھاتا تھا۔ ایک روز بھیڑیا قبل از وقت آکر وہ کھانا تنہا کھا گیا۔ مگر اس خطا پر اُسے اتنی ندامت ہوئی کہ ایک ہفتہ تک اُس نے راہب کو مُنہ نہیں دکھایا اور بالآخر جب آیا تو سرنگوں جس سے انتہائی انفعال برستا تھا۔ راہب نے اس کا قصور معاف کیا اور اُس روز خوش ہو کر اُسے دُہرا حصہ دیا۔ اسی طرح اور صدہا روایات اس

طرح کی مشہور ہیں کہ کسی راہب نے ایک شیرنی کے اندھے بچہ کو بینا کر دیا۔ کسی زخمی پرندہ کو فوراً اپنی دعا سے اچھا کر دیا۔ کسی مُردہ پرندہ کو زندہ کر دیا۔ اور ان سے بھی بڑھکر یہ کہ حیوانات کی اخلاقی زندگی میں معاً اصلاح کر دی۔ یعنی جو جانور چور تھے اُن سے چوری کی عادت چھڑا دی۔ جو بدعہد تھے انھیں باوفا بنا دیا۔ رقس علیٰ ہذا۔

میں نے ابھی کہا کہ اس قبیل کی صدہا روایتیں مشہور تھیں۔ اس میں مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے صدہا کیا معنی ہزارہا روایات اس قسم کی شائع تھیں اور ان کی یہ افراط و کثرت بلا وجہ نہ تھی ایک تو صحرا کی خلوت نشینی بجائے خود انسان و حیوان کے درمیان میل جول کی طرف موّدی ہے۔ دوسرے غیر تربیت یافتہ نفوس خصائل و رذائل کو مجسم شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں اور تجسیم کے لئے حیوانات کا قالب موزوں نکلا۔ تیسرے مشرکوں کے زمانہ کے توہمات ابھی باقی تھے۔ جو حیوانات کے جانب عقل و اخلاق کا انتساب کرتے تھے۔ ان مختلف قوتوں نے مل کر اس طرح کے قصص کو خوب چمکا دیا۔ موجودہ ناظرین انھیں مزخرفات کے درجہ میں رکھیں گے اور ایک سنجیدہ تالیف میں ان کے داخلہ پر معترض ہوں گے۔ لیکن درحقیقت یہ اعتراض بالکل بیجا ہوگا۔ کیونکہ صدیوں تک یہی مزخرفات جزو معتقدات رہے ہیں۔ بلکہ یہی خوش اعتقادیاں مذہب، اخلاق، اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ناقابل انفصال طور پر وابستہ ہونے کے ساتھ قوم کے اندرونی جذبات کی بہترین ترجمان رہی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ سے شفقت حیوانات کے مسئلہ پر جو روشنی پڑتی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن خوش اعتقادیوں کی اس مسلسل داستان کے علاوہ دو چار واقعات مستند تاریخی ذرائع سے بھی ہم تک پہنچے ہیں جن سے راہبوں کی واقعی ہمدردی حیوانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً تیرھویں صدی میں وینس میں ایک غیر معروف سینٹ جمیس ہوا ہے۔ اس کا دستور تھا کہ لڑکے جن چڑیوں کی ٹانگ میں ڈور باندھ باندھ کر اُن سے کھیلا کرتے تھے۔ یہ اُنھیں اُن سے خرید کر کے رہا کر دیا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ "میں ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق پر بھی ظلم نہیں دیکھ سکتا ہوں"۔ یا پھر مثلاً سینٹ فرانسس آف اسیسی

کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے بادشاہ کے دربار میں کبھی باریابی نصیب ہو تو میں اُسے خدا کا واسطہ دلا کر یہ التجا کروں گا کہ لوون (چنڈولوں) کی اسیری کی ممانعت کردے اور یہ قانون جاری کردے کہ گدھوں اور بیلوں کو بڑے دن کے دن خصوصیت کے ساتھ زیادہ اور عمدہ کھانا دیا جائے۔" اسی راہب کی بابت بیسیوں افسانے بھی مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے ایک بار ایک بھیڑیئے سے یہ وعدہ لے لیا کہ آیندہ کبھی بھیڑوں پر حملہ نہ کرے گا اور بھیڑیئے نے پیماں باندھنے کے طور پر اپنا پنجہ اس کے ہاتھ پر مارا اور اس کے بعد سے اہل شہر روزانہ اُسی بھیڑیئے کا ازوقہ دیدیتے تھے۔ وغیرہ

لیکن بحیثیت مجموعی ہم سے کوئی رائے پوچھے تو ہم یقیناً کہیں گے کہ کتھولک امم نے شفقت حیوانات کے باب میں جو کچھ کیا وہ برائے نام سے زاید نہیں۔ علم برداران مذہب کا یہ ہمیشہ شیوہ رہا ہے کہ وہ ہر شے کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھتے ہیں اور چونکہ اُن کے نظام نجات وکفارہ میں حیوانات کا کوئی درجہ نہ تھا۔ اس لئے کبھی انھوں نے ان کے حقوق کی طرف اعتنا نہ کی، بلکہ کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ اُن کا کوئی حق بھی ہمارے اوپر ہے۔ قصص بالا میں بھی جتنی مثالیں حیوانات کے ساتھ ہمدردی وشفقت کی ملتی ہیں اُن میں سے کوئی اس حیثیت سے نہیں کہ حیوان فی نفسہ ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے بلکہ محض اُن حیوانات سے محبت ہی جنھیں مسیح یا دیگر بزرگان دین کے ساتھ کوئی نسبت تخصیص رہی ہے۔ مثلاً گدھے سے اس لئے محبت تھی کہ مسیح اس پر سوار ہوئے تھے۔ آہوؤں سے اس لئے کہ ان کے ذریعہ سے بزرگوں کے مخفی قبروں کا پتہ لگتا تھا۔ وقس علیٰ ہذا۔

غرض جتنی روایات ہیں سب کسی مذہبی تخصیص کی بنا پر حسن سلوک کی ہیں ورنہ حیوانات کے ساتھ من حیث الحیوان کسی فرض کی ادائی کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اس مسئلہ پر دو بالکل مختلف حیثیات سے نظر کی جاسکتی ہے۔ ایک اس لحاظ سے کہ حیوانات کو اذیت وتکلیف کس درجہ کی ہوتی ہے؟ دوسرے اس نقطہ نظر سے

کہ ان سے انسان کی سرشت اخلاقی ہیں شقاوت وسنگدلی کہاں تک پیدا ہوتی ہی؟ یہ دونوں
چیزیں ایک دوسرے کی متناسب ہرگز نہیں ہوتیں۔ کیونکہ آج بھی ہمارے شکار کے وقت
شکار کو جو اذیت وتکلیف ہوتی ہے وہ ہرگز اُس اذیت تکلیف سے کمتر نہیں جو جانوروں کو
اکھاڑہ میں باہم لڑائے جانے سے ہوتی تھی۔ تاہم چونکہ تعاقب کے وقت ہم میں خود بخت
جوش ہوتا ہے اور شکار اپنی تکلیف کو ظاہر نہیں کرسکتا، اس لئے شکار سے ہمارے نفس میں
وہ شقاوت وقساوت نہیں پیدا ہوتی جو قدیم خونریز ملاعب کے نظارہ سے پیدا ہوتی تھی
وہ قدیم خونریز مناظر آج بے شبہ دنیائے مسیحیت سے معدوم ہوگئے ہیں۔ لیکن ان کی معدومیت
میں مسیحیت کا کیا خاص احسان ہی؟ جس زمانہ میں اور جن ممالک میں مسیحیت اپنے عروج پر رہی
وہاں یہ خونریز ملاعب برابر قایم رہے اور آج جو معدوم ہوئے ہیں تو اس لئے کہ تمدن کی
ترقی اور شایستگی کی لطافت سے لوگوں کے مذاق میں اس قدر نزاکت ونفاست پیدا
ہوگئی ہی کہ وہ مناظر خونریزی کے نظارہ کی تاب نہیں لاسکتے۔ نیز اس لئے ڈراما وتھیٹر کی گرم بازاری
نے تفریحات وملاعب کا رُخ اب بالکل دوسری سمت پھیر دیا ہی۔ اس انقلاب احساس کی
پروٹسٹنٹ کلیسا نے اپنے اپنے ممالک میں تائید کی ہی۔ لیکن کیتھولک ممالک میں ائمہ کلیسا
کو یہ فخر بھی نہیں دیا جاسکتا۔ وہاں یہ کام والیٹر وبیکیریا جیسے اشخاص کے ہاتھوں سرانجام
پایا ہی۔ اسی حالت میں اصل مسئلہ کے ان دو پہلوؤں کی تفریق کو ملحوظ رکھ کے ایک حکیم اخلاق
بالآخر یہ فیصلہ کرے گا کہ موجودہ طرق شکار وصید افگنی سے اگرچہ نفس میں وہ قساوت نہیں پیدا
ہوتی جو قدیم ملاعب سے پیدا ہوتی تھی۔ یا آج کل طبی وعضویاتی معلومات کی غرض سے زندہ
حیوانات پر جو اعمال جراحی کئے جاتے ہیں وہ چونکہ دنیا کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اس لئے
ان کا زہریلا اثر عام اخلاق پر نہیں پڑنے پاتا۔ تاہم ہم میں سے کون رحیم المزاج شخص ایسا ہی
جس کے حسّ اخلاقی کو ان واقعات کے نظارہ سے صدمہ نہیں پہنچتا؟ اور ان چیزوں کو باضابطہ
حدود اخلاق کے اندر لانا یا حیوانات کے ساتھ حسن سلوک کو ایک اخلاقی فرض سمجھنا تو اٹھارھویں

صدی کے بالکل مادّی تمدن و دنیوی شائستگی کا نتیجہ ہے جس میں راہبان صحرا کی سعی و کوشش کو کوئی دخل نہیں مسیحی دنیا کو اس کا اعتراف کرلینا چاہیئے کہ اس باب میں ہندو مسلمان دونوں اس سے بہت سبقت لے گئے ہیں، بلکہ آج تک جن ممالک میں رومن کیتھولک فرقہ کا غلبہ ہے (مثلاً اسپین و اٹلی) وہاں اب بھی حیوانات پر بکمال شقاوت و بالاعلان مظالم جاری ہیں۔

خانقاہیت کا ابتدائی اثر دنیا پر جس حد تک مفید پڑا وہ تخیل کے ذریعہ سے قصوں اور افسانوں کی وساطت سے پڑا۔ مشرق میں بعض خانقاہ نشین بڑے مشہور عالم ہوئے ہیں اور ان میں سے اکثر زاہدان مرتاض پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن مغرب میں خانقاہیت نے اس سے اعلیٰ تر مظاہر میں اپنا جلوہ دکھلایا۔ شروع شروع میں یہاں بھی زہد خشک و عبادات و ریاضات کی گرم بازاری رہی۔ لیکن تین سبب ایسے پیش آئے جنھوں نے رہبانیت کا رُخ عملیت کی طرف پھیر دیا۔ ایک یہ کہ مغرب کی آب و ہوا اور یہاں کی اقوام کی نسلی خصوصیات خود ہی جسم کو ریاضات شاقہ کے برداشت کی قابل نہیں رکھتیں اور نہ دماغ میں زیادہ توہمات پیدا ہونے دیتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ چھٹی صدی میں ایک مقنن اعظم ایسا پیدا ہوا جس کا اثر رفتہ رفتہ سارے یورپ پر محیط ہو گیا اور جس نے غیر ضروری و مہلک ریاضات کو ناجائز اور محنت و کاروبار کو راہبانہ زندگی کا جزو قرار دے کر موجودہ تمدن کی داغ بیل ڈال دی۔ تیسرے یہ کہ بربریوں کے پیہم حملوں نے نظام حکومت و معاشرت کو درہم و برہم کرکے پھر اُسے اُس کی ابتدائی صورت میں پیدا کر دیا اور اس طرح سیاسی علمی و معاشری نظامات کا بار خانقاہوں ہی پر آپڑا۔

بعض مؤرخوں نے کہا ہے کہ الارک کے ہاتھوں تسخیر رومہ سے چونکہ مشرکانہ مذہب کی بڑی بڑی عظیم الشان یادگاریں ہٹ گئیں اس لئے یہ واقعہ بجائے خود اس شہر میں مسیحیت کی تقویت کا باعث ہو گیا۔ میرے نزدیک اسے ذرا زیادہ وسعت دے کر اسے مغربی تمدن کے عام انحطاط پر منطبق کرنا چاہیئے۔ اس تمدن میں مسیحیت اگرچہ ملکی مذہب کا مرتبہ رکھتی تھی تاہم

سلطنت کا سارا فلسفہ، ساری روایات کا دار و مدار بت پرستانہ مذہب پر تھا۔ جس کے پیدا کردہ قدیم دمتروک خصائل لوگوں کے خمیر میں داخل ہو گئے تھے۔ بربریوں کے حملوں نے اس تمدن کو منہدم کر کے مسیحیت کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

اس دورِ ابتلا میں ارکان کلیسا نے جس جرأت و دانشمندی کا اظہار کیا ہے۔ درحقیقت اُس کی نظیر آسان نہیں۔ یہ ہمیں گزشتہ فصل میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کس بے خوفی کے ساتھ مفتوحوں کو فاتحوں کے غضب سے بچاتے تھے۔ اور کس ایثار و عالی ہمتی کو صرف کر کے قحط زدوں کی رفع تکالیف میں مشغول رہتے تھے، ایسے زمانہ میں جبکہ غلہ کی درآمد مکاسبیا مسدود ہو گئی تھی اور جبکہ بڑے بڑے وسیع و شاداب کھیت حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپ سے پامال ہو رہے تھے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بربریوں کا قبول مسیحیت ہے مگر افسوس ہے کہ تاریخ کا یہ صفحہ ہمارے لئے تقریباً بالکل سادہ ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ قوموں کی قومیں اور قبایل کے قبائل ایسے ہیں جن کے تحولِ دین کے اسباب ہمیں مطلق نہیں معلوم ہیں۔ قوم گوتھ تو زوالِ رومہ سے پیشتر ہی مسیحی ہو چکی تھی۔ لیکن بڑا حصہ دنیا سے بربریت کا اُس وقت مسیحی ہوا جبکہ دنیوی حیثیت سے بربروں کا عین عروج تھا۔ ان وحشیوں کو جو اپنے وطن میں اپنے کلید برداران شریعت کی حلقہ بگوشی کے عادی تھے جب ایک غیر ملک میں پہنچ کر ایسے اساطین مذہب سے سابقہ پڑا۔ جو اُن سے بدرجہا زاید متمدن و شایستہ تھے۔ ان کے پرشوکت مذہبی مراسم، وہیبت ناک عقاید حشر و نشر سے ان کا متخیلہ خاص طور پر متاثر ہوا۔ قدیم تعلقات کو تو یہ خیرباد کہہ ہی چکے تھے۔ اب انھوں نے تمدن کی عظمت کے آگے اپنی گردن خم کر دی۔ اور لاطینی زبان کے ساتھ لاطینی مذہب بھی ساری جماعت پر محیط ہو گیا۔ اور اس راہ دعوت و تبلیغ میں مسیحیت کے دو عقیدے اُس کے حق میں خصوصیت کے ساتھ مفید پڑے۔ ایک عقیدہ نجات مخصوص برائے مسیحیان، دوسرا وجود شیاطین۔ نجات مخصوص کے اعتقاد کی بنا پر مسیحیوں کے لئے قدیم معتقدات سے تایب ہونا لازم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی چونکہ وہ اپنے

قدیم معبودوں کے تصور کو ذہن سے یکسر خارج نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انھیں دوسرے مسئلہ یعنی وجود شیاطین سے یہ مدد ملی کہ اب وہ انھیں شیاطین کے درجہ پر رکھنے لگے۔ پھر اُس وقت کے داعیان مسیحیت میں علاوہ جوش خلوص و سرگرمی کے دانشمندی بھی انتہا درجہ کی تھی۔ انھوں نے یہ تاڑ لیا تھا کہ یہ بربری اپنے بادشاہوں اور بادشاہ بیگموں کے دین کے مطابق ہمیشہ اپنا دین رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا اصل مرکز انھیں کو بنایا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ملکہ "کلوٹلڈا" ملکہ برتھا، و ملکہ تھیوڈولنڈا کے قبول مسیحیت کے اثر سے اُن کے شوہروں اور پھر ساری قوم کے مسیحی بنا لینے میں کیسی مدد ملی۔ ایک مرتبہ مسیحیوں نے یہ کیا کہ ایک نقاش کو کچھ دے دلا کر اُس سے میدان حشر وجہنم کی ایک تصویر بنوائی جس میں منکرین بڑے عذاب جھیل رہے تھے۔ اسے دیکھکر منکرین قدرتاً دہشت و ہیبت سے سخت متاثر ہوئے۔ اس طرح کی ترکیبیں اُس وقت کے داعیان مسیحیت اکثر کیا کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ سب سے زیادہ چلتا ہوا جادو ان کو یہ یاد تھا کہ ہر طرح کا دنیوی عیش و آرام، دولت و حکومت ایمان و مسیحیت کے ثمرات ہیں اور ہر طرح کی مصیبت، قحط، سیلاب، وبا وغیرہ بُت پرستی یا معصیت سے پیدا ہوتی ہے۔ وحشیوں کے دماغ میں تحقیق و تنقید کی قوت کہاں تھی۔ وہ اس سے خصوصیت کے ساتھ متاثر ہوتے۔ اور جب وہ خوف و طمع دونوں کے اثر سے اس میں جوق جوق شریک ہونے لگے تو انھوں نے اپنے قدیم تہواروں اور میلوں کا نعم البدل مسیحی بزرگان دین کے سالانہ فاتحوں و یادگاروں کو پایا۔ علاوہ باضابطہ مبلغین کے دعوت و تبلیغ ایک ایسا فریضہ تھا جسے مسیحی اسیران جنگ بھی ادا کرتے تھے اور جب ان مختلف ذرائع سے ایک بڑی تعداد فاتحین کی مسیحی ہوگئی تو شدید تعزیری قوانین نافذ کر کے مسیحیت کی مخالفت کا سدّ باب کر دیا گیا۔

غرض بالآخر ان مختلف تدابیر و ذرائع سے مسیحیت کو فتح حاصل ہوئی لیکن یہ فتح جس قدر وسیع تھی اُس قدر قطعی و خالص نہ تھی۔ کیونکہ اب مسیحیت سے آمیزش بنس رہی تھی بلکہ بُت پرستی

سے کشمکش میں خود اس کی آمیزش اس میں بہت کچھ آگئی تھی۔ بُتوں کے جگہ پر اب مسیحی شہداء و بزرگان دین کے نام زبان پر چڑھ گئے تھے۔ اور گو اسماء بدل گئے تھے۔ لیکن صفات و خصوصیات سب جوں کے توں رہے تھے۔ آئمۂ کلیسا نے اس کے روک تھام کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی۔ بجز اس کے کہ وہ مختلف افسانوں اور قصوں کے ذریعہ سے اس عقیدہ کو پھیلاتے رہے کہ معبودان قدیم شیاطین کی صورت میں اب بھی زندہ ہیں اور لوگوں کو ورغلا کر راہ حق سے منحرف کرایا کرتے ہیں۔ مثلاً چھٹی صدی کے ایک مشہور پاپا پاررومہ یہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک یہودی تنہا سفر کر رہا تھا۔ راستہ میں رات ہوگئی۔ سامنے اپولو کا ایک ویران مندر تھا۔ اُس میں وہ شب بسر کرنے کے ارادہ سے گیا۔ مگر اُس کے اندر پہنچکر اُس پر سخت دہشت طاری ہوئی۔ اُس نے شیاطین کے گزند سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے جسم پر انگلیوں سے صلیب کی صورت بنائی۔ اس کے اثر سے وہ شیاطین کے گزند سے تو محفوظ رہا لیکن اُس نے دیکھا کہ آدھی رات کو اپولو اپنا دربار کر رہا تھا۔ اور بڑے بڑے ہیبت ناک شیاطین اپنے یہ پُر فخر کارنامہ بیان کر رہے ہیں کہ ہم اس طرح مسیحیوں کو ورغلایا کرتے ہیں یا اس طرح آیرلینڈ کا ایک مشنری سینٹ گال ایک بار رات کے وقت مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ جھیل کے قریب ہی اُس نے خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی کہ اُسے اس سناٹے میں عجیب و غریب روتی ہوئی آوازیں سُنائی دیں۔ یہ آوازیں پانی کے دیوتا اور پہاڑوں کے دیوتا کی تھیں، جو اس باب میں مشورہ کر رہے تھے کہ نئے دشمن (مسیحیت) کو کیونکر شکست دینا چاہیئے۔

فصل (۱۱)

خانقاہیت

مغرب میں خانقاہوں کی اشاعت کے مسئلہ پر متعدد مؤرخوں نے لکھا ہے۔ اور یہ مسئلہ

اب کچھ ایسا دشوار و غامض نہیں رہا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ جو اسباب عام رہبانیت کی اشاعت کے باعث ہوئے۔ ایک بڑی تعداد اُن میں کی اب بھی موثر رہی اور پھر ایک سبب مزید یہ ہوا کہ بربریوں کے متعدد حملوں سے ملک میں جو عام انتشار و بدنظمی پھیل گئی تھی اُس کے لحاظ سے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ کوئی ایک مرکز تو کم از کم ایسا ہو جہاں امن و سکون نصیب ہوسکے اور خانقاہیں اس ضرورت کو بہ احسن وجوہ پورا کرتی تھیں۔ یہ درحقیقت ایسی چیز تھیں جن کی طرف خواص و عوام دونوں کو یکساں کشش ہوتی تھی۔ خوش اعتقادوں کے لئے خانقاہ میں داخل ہونا جنت میں داخلہ کی ضمانت تھا۔ اہل کرم و متقی اس میں اس لیے داخل ہوتے تھے کہ مختلف تبلیغی و کریمانہ فرایض کی انجام دہی کا موقع ملے گا۔ جاہ پسندوں کے لئے یہ ترغیب تھی کہ بڑے بڑے عہدہ ملیں گے جو ممکن ہے کہ پایائیت پر ختم ہوں۔ کتاب کے کیڑوں کو یہ طمع تھی کہ سکون کے ساتھ مطالعہ و کتب بینی کا وقت ملے گا۔ اپاہجوں اور کاہلوں کو یہ کشش تھی کہ ہاتھ پیر نہ ہلانا پڑے گا۔ غرض یہ کہ ہر طبقہ و ہر مزاج کے لوگوں کو اس میں شرکت کے لئے کافی محرکات موجود تھے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ خواہ اس میں کتنے ہی کثرت سے لوگ شریک ہوں، معاش کی طرف سے کبھی تنگی نہیں ہونے کی۔ اُمرا و اہل ثروت جب تک زندہ ہیں ہمیشہ حصول ثواب و نجات کے لئے اپنی جائدادیں وقف کرتے جائیں گے اور راہب صاحبان ٹیکس وغیرہ سے مستثنیٰ رہ کر ان جائدادوں کا پورا انتظام کرتے رہیں گے پھر معاش کی طرف سے بے اطمینانی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ بلکہ ایک شورش و بدنظمی کے زمانہ میں ہی واحد مرکز سکون ہونے کی حیثیت سے تمدن، زراعت و کاروبار کا بھی مرکز اب یہی خانقاہیں رہ گئی تھیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ خانقاہیت کے یہ مفید اثرات دیرپا نہیں ہوسکتے تھے۔ ابتدائی جوش و غلبہ کے گزر جانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ بڑی بڑی جماعتیں مجرد اور جائدادوں کی مالک غیر مسئول رہ کر پاکباز رہ سکیں، چنانچہ یہی ہوا کہ چند روز میں بدچلنی کا بازار خوب گرم ہوگیا

اسی طرح جب جنگ و جدال کی بدنظمیاں موقوف ہوگئیں اور ملک کے سارے کاروبار اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔ تو خانقاہوں کے وجود سے جو تمدنی منافع تھے یعنی اُن کا زراعتی و کاروباری مرکز ہونا، ان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اب صورت حالات کے بدل جانے سے خانقاہیت کی بعض تعلیمات راہ ترقی میں حایل ہونے لگیں۔ مثلاً اس کی یہ تعلیم کہ فقر و افلاس موجب تقدیس و احترام ہے۔ صریحاً ترقی تمدن کے منافی تھی۔

مگر ایک شے خانقاہیت کی پیدا کردہ ایسی تھی جو گویا جزو سرشت ہوگئی اور جو صورت حالات خارجی کے بدلنے کے ساتھ بدلنے والی نہ تھی۔ اس سے ہماری مُراد خوئے فروتنی و انکسار سے ہے۔ راہبوں میں اور سب صفات تو موجود ہوتی تھیں لیکن انانیت و خودی اکثر پیدا ہو جاتی تھی اور کیوں نہ پیدا ہوتی؛ وہ کسی کے نوکر چاکر نہ تھے۔ کسی کے پاس غرض لے کر نہیں جاتے تھے۔ صدہا ہزارہا اہل غرض ان کے پاس البتہ آیا کرتے تھے۔ غرض انانیت و خودی راہبوں کا ایک عام شیوہ ہو چلا تھا کہ مغرب کی خانقاہیت نے اس خطرہ کو مٹا دیا۔ یہاں کی باضابطہ و مرتب خانقاہانہ زندگی کی شرط اولین یہ تھی کہ اطاعت و انکسار ہو۔ اطاعت کے فواید سے قدیم تمدن بیگانہ نہ تھے۔ تاہم زوال رُومہ کے وقت اور وحشیوں کی ہنگامہ آرائیوں کے درمیان یہ جوہر گویا دنیا سے ناپید ہوگیا تھا۔ مسیحیت نے آکر پھر اعادہ معدوم کیا۔ اسی لئے دنیا نے بھی بڑھکر اس کا خصوصیت سے خیر مقدم کیا۔ اور گرجا کی اس تعلیم کی تقلید دیگر حلقوں میں بھی ہونے لگی اور اطاعت کا جوہر تو خیر دنیا میں پیشتر سے موجود تھا۔ لیکن انکسار و فروتنی کا وصف تمامتر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے اور اس تعلیم پر جس پابندی کے ساتھ خانقاہوں میں عملدرآمد ہوتا تھا اور کہیں نہیں ہوتا تھا۔ درحقیقت خانقاہانہ زندگی کا نظام ہی اس ترتیب کا واقع ہوا تھا کہ غرور و پندار کا شائبہ تک نہ رہنے پائے اور اس کی جگہ تواضع و تذلّل لے لے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان رحیم، خلیق و فیاض طبع ہو اور منکسر و متواضع مطلق نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ کہ انسان میں انکسار و تواضع ہو مگر رحم، خلق و فیاضی نہ ہو۔ اس بنا پر اس جذبہ کو اُم الفضائل کہنا

چاہیئے۔ اور یہی خیال کرکے مسیحیت نے اس پر اتنا زور دیا۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ تو بہرحال دیکھنے میں آیا کہ خانگی و معاشری زندگی سے قطع تعلق کرکے خانقاہوں میں نظر بند ہو کر رہنے سے جو شقاوت، تعصب و سنگدلی، راہبوں کے دل میں پیدا ہو جانی چاہیئے وہ نہیں پیدا ہونے پائی لیکن یہ وصف بھی گو ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا تاہم تمدن کی زورافزوں رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقی تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں۔ اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے۔ لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہی زندگی کا مطمح نظر تھا۔ کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے۔ اسی کو دیکھکر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں۔ ایک آزادگی دوسرے خودداری۔ انھیں پر زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی آزادخیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ان کے بجائے یہاں دنائت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی و گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں اُن سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔

فصل (۱۲)

خانقاہیت کا تعلق فضائل عقلی کے ساتھ

یہ فضائل عقلی کیا ہیں؟ فضایل اخلاقی کا مفہوم تو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن یہ فضائل عقلی

کیا معنی ہیں؟ اس سے ہماری مُراد یقین و اعتقاد کی دیانت داری اور ضمیر کی آزادی سے ہے۔ ذہن کو ہر قسم کے تعصبات و جذبات شدید کی گرفت سے آزاد رکھنا راہ صداقت پر بلا خیال نتایج عملی قایم رہنا اور مقدمات کی شہادت جن نتایج پر پہنچائے اُنھیں کو اختیار کرنا خواہ اس سے کسی جذبہ کو کتنا ہی صدمہ پہنچے، یہ سب فضیلت عقلی کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس کو اختیار کرنا دنیا کے دشوار ترین کاموں میں سے ہے اور اگر کوئی مذہب یا اصول اخلاق ضمیر کی آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے۔ یا بعض جذبات کی پاس داری کے خیال سے عقل و شہادت کی قوت کو محدود کرنا چاہتا ہے تو وہ یقیناً فضیلت عقلی کا ہادم ہے۔

قدما کے ہاں قوانین استقرار اگرچہ اس قدر منضبط نہ تھے تاہم آزادی ضمیر کا پورا احترام تھا۔ بے شبہ اُن کے ہاں بھی حکومت کی طرف سے بعض قوانین اس قسم کے نافذ تھے کہ فلاں فلاں اہم مذہبی رسوم کی پابندی لازمی ہے۔ یا بعض ایسے تعلیمات فلسفہ کی جو صریحاً اخلاق شکنی کی طرف لیجاتے تھے۔ اشاعت بھی حکماً بند کردی گئی تھی۔ تاہم اس طرح کی مثالیں صرف بطور مستثنیات کے ملتی ہیں ورنہ عموماً آزادی رائے کی حُرمت سب کو مُسلّم تھی۔ رائے کی غلطی کسی کے نزدیک معصیت نہ تھی، بلکہ جو لوگ بجمال جرأت و بے خوفی، علمی مسائل کی تحقیق میں مصروف رہتے تھے، اکثر وہی سب سے زیادہ معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔ اور بُت پرستانہ مذہب خواہ اور کتنے ہی معایب کا مجموعہ ہو۔ تاہم اس میں یہ تین صفات تو اعلیٰ درجہ کی موجود تھیں تخیُّل، وطنیت، و رواداری۔ یہ عقیدہ کہ اس نظام کائنات کی کُنجی دیوتاؤں کے ہاتھ میں رہے، جو انسان سے بدرجہا قوی مگر بہ لحاظ نوعیت اس کے بالکل مشابہ ہیں تخیُّل کو کتنا متاثر کرنے والا تھا! اسی طرح مذہب کی بنیاد قومیت پر رکھنا اور مذہبی مراسم کو ملکی فرائض سے بالکل مخلوط کردینا یقیناً جذبہ وطنیت کو مستحکم کر دینا تھا۔ یا پھر اسی طرح یہ مسئلہ کہ مختلف اقسام کے دیوتا ہیں جو مختلف طرق عبادت سے خوش ہوتے ہیں، رواداری کا سنگ بُنیاد تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ رومہ میں جو مختلف ادیان کی بجائے خود ایک نمایش گاہ بن گیا تھا۔ حُریت فکری اپنے منتہائے شباب پر تھی، ہر شخص اپنے

ضمیر و رائے کا مختار تھا۔ صدہا قسم کے مختلف معتقدات و خیالات شائع تھے۔ اور مشککانہ تحقیق وتنقید کو عیب نہیں۔ بلکہ ایک خاص وصف سمجھا جاتا تھا۔

یہ حال قدما کا تھا۔ لیکن ہمیں گزشتہ صفحات میں معلوم ہو چکا ہے کہ کلیسا کی وسعت اقتدار کا ایک خاص سبب اُس کا غیر مسئولانہ ادعا تھا اور زود اعتقادیوں کے دَور میں اُس کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ اپنے متبعین سے اپنے احکام کی بیچون وچرا تعمیل کراتا تھا۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ احکام شریعت پر کورانہ عملدرآمد کا رواج عام ہو گیا اور شک واعتراض ایک جرم قرار پا گیا اسی سلسلہ میں ہم اس مغالطہ کو بھی کھولے دیتے ہیں جو رائے کی غلطی کو اخلاقی جرم قرار دینے کا باعث ہوا۔ عقلی حیثیت سے دیکھے تو کسی رائے یا عقیدہ کو اخلاقی جرم قرار دینا سرے سے بےمعنی ہے۔ ہم نے مانا کہ کوئی شخص مہمل سے مہمل عقاید کا قایل ہے۔ کوئی شخص مثلاً یہ کہتا ہے کہ جزو کُل سے بڑا ہوتا ہے یا ایک خط مستقیم سے دائرہ بن سکتا ہے تو یہ عقاید خواہ کتنے ہی مہمل و مضحک ہوں لیکن اخلاقی معصیت ان میں کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے؟ کسی عقیدہ کو بجائے خود معصیت قرار دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ آواز کو رنگین قرار دیا جائے۔ یہ بےشبہ ممکن ہے کہ کسی رائے یا عقیدہ کے عملی نتائج اخلاق شکن ہوں، لیکن اس سے نفس اس رائے یا عقیدہ کو تو مجرمانہ نہیں کہہ سکتے۔

یہ ایک عام کلیہ ہے۔ مگر دو صورتیں ہمارے نزدیک ایسی ہیں جو جادۂ اخلاق کی خلاف ورزی یعنی غلطی رائے کی طرف منجر ہوتی ہیں:۔

(۱) اوّل یہ کہ غلط رائے عموماً ضمیر کی بددیانتی سے پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں اس طرح کے منافقین بہت کم ہوتے ہیں جو دیدہ و دانستہ ایک رائے کو غلط سمجھکر پھر بھی اُسے صحیح ظاہر کرتے رہیں لیکن اس طرح کے منافقین ہمیشہ اور ہر جگہ بہت کثرت سے موجود رہتے ہیں۔ جو تحقیق وتلاش کی محنت وتکلیف سے جی چُراتے ہیں جو کاہلی وآرام طلبی کے باعث اپنے سابقہ تخیلات ومعتقدات پر قانع رہا کرتے ہیں اور اپنے مخالف واقعات وشواہد سے بالکل چشم پوشی کئے رہتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں اُن کے جذبات پارینہ کو صدمہ نہ پہنچے۔

(۲) دوسری بات یہ ہی کہ انسان کی سیرت و افتادِ طبیعت کا اس کے خیالات و معتقدات پر بیحد اثر پڑتا ہے۔ بلکہ اگر ہم کسی شخص کے مزاج و سیرت سے پوری واقفیت رکھتے ہوں تو یہ تقریباً وثوق کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ یہ فلاں مسئلہ میں فلاں رائے کا قایل ہوگا۔ جو لوگ قدرۃً عالی ہمت، عالی ظرف، شجاع و بلند حوصلہ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی مذہب یا مسلک فلسفہ کی تعلیمات کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے اُن کے ان جذبات کو اُبھرنے کا موقع ملے بخلاف اس کے جن لوگوں کے مزاج میں سردمہری، دنائت، تنگ نظری و بزدلی ہوتی ہے وہ اپنے مذاق و مزاج کے موافق مذہب فلسفہ کی تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ تو بہ کثرت دیکھنے میں آتا ہی کہ سیرت و مزاج کے بدلنے سے انسان نے اپنا مذہب و اخلاق بدل دیا ہے۔ نیز یہ کہ رائے و خیال کا تغیر، تغیر سیرت کا باعث ہوا ہی۔ غرض یہ کہ اکثر صورتوں میں طینت کی خرابی رائے کی غلطی کا سبب ہوتی ہی۔

بہر حال ان دو صورتوں میں انسان کی طینت و سرشت کا اثر اُس کے اخلاق و مذہب پر بہت کافی پڑتا ہی۔ ان میں سے پہلے نقص کی اصلاح کی کلیسا نے کبھی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں تک ممکن ہوا اُس نے قوانین استقرا کے انضباط اور تشکیک و تنقید کا ہمیشہ سدباب ہی کرنا چاہا۔ حالانکہ علمی ترقیوں کا سنگ بنیاد بھی تشکیک و بے اطمینانی ہی۔ لیکن اگر قدما کے قایم کردہ اصول پر قانع اور لکیر کا فقیر بنا رہتا تو آج سائنس کا کیا حال ہوتا؟ کینٹ و ہیوم اپنی تشکیک سے اگر فلسفی دنیا میں تہلکہ نہ ڈال دیتے تو آج فلسفہ جدید کا کہیں بھی وجود ہوتا؟ دیکھو والیٹر، نیبور، ولیوس اگر قدیم مورخین کے نتایج تحقیقات کی طرف سے غیر مطمئن نہ ہوتے تو آج تاریخی نتایج کے مواد میں کچھ بھی اضافہ ممکن تھا؟

البتہ نقص دوم کی طرف مسیحیت نے پوری توجہ کی۔ اور رائے و خیال پر سیرت و طینت کی اہمیت اثر کا کلیسا کو ہمیشہ اعتراف رہا۔ اور درحقیقت یہی ایک شے تھی جس نے ایک بڑی حد تک اس کی تعلیمات میں تعصب و عدم رواداری کو جگہ دیدی۔ وہ اپنے اتباع میں ایک

خاص قسم کی سیرت دیکھنا چاہتا تھا اور اس راز سے آشنا تھا کہ جب تک وہ سیرت قایم ہے انسان کے معتقدات بھی ایک خاص نہج پر رہیں گے۔ اس لیئے اُس نے اس مخصوص سیرت کو قایم رکھنے کی پوری کوشش کی اور متعصب ارکان کلیسا کے ہاتھ میں پڑکر اس کوشش اصلاح نے تعصب و عدم رواداری کی شکل اختیار کر لی۔ چند مخصوص اعتقادی و تاریخی مسائل کو حقایق فطری کے مرتبہ پر رکھ دیا گیا، جن پر بحث و شک کرنا دائرہ مسیحیت سے خارج ہو جاتا تھا۔

یہ تو تعلیمات تھیں۔ عمل یہ تھا کہ رواداری و مُسالمت کا کہیں نام و نشان نہیں باقی رہنے پایا تھا۔ آج بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اُس وقت (یعنی قسطنطین کے زمانہ) سے بجائے ملکی جوش قومیت و وطنیت کے عام انسانی ہمدردی پھیل گئی تھی۔ لیکن یہ خیال قطعاً واقعات و تاریخی شہادات کے مخالف ہے۔ زوال رومہ کے وقت اخوت انسانی کا جذبہ دلوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن مسیحیت نے اس کی جگہ محبت و الفت کی بنیاد تمامتر ہم مذہبی پر رکھی۔ جو لوگ عیسائی نہیں وہ سب ملعون، جہنمی و قابل حذر ہیں۔ اوّل اوّل یہ خیال صرف عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کے تعلقات پر محدود رہا۔ اُس کے بعد رفتہ رفتہ عیسائیوں میں جو اسّی۔ نوّے فرقہ پیدا ہو گئے خود اُن میں سے ہر ایک اپنے طرز عمل میں دوسرے کے ساتھ اسی اصول پر عمل کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک فرقہ کا ہر شخص دوسرے فرقہ کے اشخاص کے سایہ سے بھاگنے لگا۔ اور ان فرقہ بندیوں کی بنیاد اس طرح کے اختلاف مسائل پر ہوتی تھی کہ مثلاً ایک گروہ کہتا تھا کہ خدا اور مسیح متحد الماہیت ہیں۔ دوسرا کہتا کہ نہیں مشترک الماہیت ہیں۔ ان جزئی موشگافیوں سے جو اختلاف پیدا ہوتا تھا۔ اُس کی بنا پر اس قدر سخت ہنگامہ آرائی ہوتی تھی کہ شہر میں سخت بلوہ ہوتے اور کثرت سے کشت و خون ہوتا۔ ایک موقع پر شہر قسطنطنیہ کے بلوہ میں ۳۰۰۰ آدمی کام آئے۔ ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ ۸۰ پادریوں کو دریا میں غرق کر دیا۔ ایک مقتدر پادری نے ایک بار فریق مخالف کی بیواؤں پر تازیانہ لگوانے شروع کیئے اور بن بیاہیوں کو برہنہ کر کے آگ پر کڑھاؤ چڑھا کر اُن میں ڈال کر تل ڈالا۔ ایک مشہور عالم فلسفی خاتون ہپشیا

پر اعتزال و بے دینی کی فردِ جرم لگا کر اُسے ایک گرجا میں قتل کیا گیا۔ اس کا برہنہ جسم سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُسے آگ میں ڈال دیا گیا۔ کیتھولکوں کو جب مصر پر فتح حاصل ہوئی تو کئی دن تک ملک قتل و غارت کا ہدف بنا رہا۔ اسکندریہ، ایڈیسہ و قسطنطنیہ بارہا مختلف مسیحی فرقوں کی دست درازیوں کا شکار ہوتے رہے خصوصاً قسطنطنیہ پر تو سب سے زیادہ مصائب نازل رہے۔ تیسری صدی سے یہ ہوا چلی کہ مخالف جماعتوں کے طریق عبادت کو قانوناً روکا جائے یہاں تک کہ کچھ روز میں بالکل بے ضرر مشرکانہ عبادتوں کو بھی روک دیا گیا اور مشرق کی بہتر سے بہتر تعمیری صناعیاں اور یونان کی بہتر سے بہتر نقاشیاں بکمال بیدردی خاک میں ملا دی گئیں۔

ان مذہبی و قانونی کارروائیوں کے علاوہ جو لٹریچر اُس وقت شائع ہوتا تھا وہ اپنے لہجہ کی دُرشتی کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ کی مناظرہ و کلام کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیے سخت کلامی و سب وشتم سے مملو ملیں گی جن میں ہر فریق اپنے مخالفین کو شیاطین و ملاعنہ کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ان کی موجودہ مصیبتوں کو خدائی تازیانہ سے تعبیر کرتا ہے اور بہ کمال خیانت نفس عقبیٰ میں اُن کی تعذیب و عقوبت کے تصور سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ سینس، بسیل وغیرہ دو چار مستثنیات کو چھوڑ دیجیے جو قدما مشرکین کی جائز مدح و ثنا سے دریغ نہیں رکھتے تھے۔ باقی علی العموم اُن کے لئے گویا زبان میں کوئی کلمہ خیر تھا ہی نہیں جس وقت ہم اس لہجہ کا مقابلہ یونانیوں و رومیوں کے اُس لہجہ سے کرتے ہیں جو وہ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں اختیار کرتے تھے تب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں و رومیوں کے اخلاق کا پایہ کس قدر بلند اور اُن میں کیسی فراخ دلی تھی اور ان کے مقابلہ میں اُس وقت کے مسیحی گویا چھچھورے پن اور تنگ نظری کا نمونہ تھے۔

فصل (۱۳)

خانقاہیں بطور خزاین علم کے

مغربی خانقاہوں نے جس زمانہ سے اپنے علمی و تعلیمی فرایض کو ادا کرنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کیتھولک ازم کا اقتدار تقریباً مُسلّم ہو چکا تھا اور جوش مناظرہ سرد پڑ چکا تھا تاہم کلیسا کے ذریعہ سے اشاعت و تحفظ علوم میں جتنی کوششیں ہوئیں سب خانقاہیت کے اثر سے ہوئیں۔ آج یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ اگر کیتھولک ازم کا وجود نہ ہوتا تو اب تک علمی زندگی کس اسلوب پر قایم رہی ہوتی لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ کیتھولک ازم کے زیر اثر خانقاہوں ہی نے علم کی مشعل کو روشن رکھا۔ دو چار سال تک نہیں صدیوں تک علوم کی تاریخ بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں البتہ تاریخ اخلاق کی ضمن میں ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ خانقاہیں اپنے ان فرایض کو کیونکر اور کہاں تک انجام دیتی رہیں۔

سب سے پہلا سوال اس بحث میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ گرجا نے علوم قدیم کی محافظت کہاں تک کی؟ یہ تو ہم پیشتر کہہ ہی آئے ہیں کہ اس باب میں خود کلیسا کے اندر مختلف خیالات تھے ایک گروہ جس کا سردار ٹرٹولین تھا مشرکین کی تصانیف کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا دوسرا گروہ جس کے مشاہیر ارکان جسٹن مارٹر، کلیمنٹ آف الگزنڈریا و آریجن تھے۔ اس کے بالکل برخلاف ان کے ساتھ کمال عقیدت و شیفتگی رکھتا تھا۔ بلکہ انھیں محرّف مسخ شدہ الہامی کتابیں قرار دیتا تھا۔ ایک اور گروہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ اس کا سرگروہ سینٹ آگسٹاین تھا جو یہ اعتراف کرتا تھا کہ معصیت سے اجتناب کا خیال اسے اوّل اوّل سسرو کی ایک تحریر سے پیدا ہوا۔ جولین نے قدما کی تصانیف کی تعلیم روکنا چاہی۔ لیکن اس کی جس قدر پُرجوش مخالفت ہوئی اُس نے صاف ثابت کر دیا کہ اُس وقت کے مقتدایان مسیحیت انھیں کتنا عزیز رکھتے تھے

پھر فلاطونیت جدید کی اشاعت، ہزارہا آدمی کا برائے نام اصطباغ، اور کچھ اُس جوش و خروش میں کمی جو فارغ البالی و خوش حالی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان سب چیزوں نے مل کر اور اس کی تائید کی۔ بلکہ سانیسیس نے تو پادری ہو کر یہ غضب کیا کہ اپنے تئیں نہ صرف ایک مشرک فاضلہ ہاپیشیا کا معتقد ظاہر کیا بلکہ مسئلہ روح میں بالکل فلاطون کا ہم آہنگ ہوگیا اگر کہیں یہ مقتدایان کلیسا کی آزاد خیالی عام ہوگئی تھی تو مسیحیت کی رفتار کا رُخ بالکل پلٹ گیا ہوتا۔ لیکن ایسا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ نجات مخصوص کا عقیدۂ رومی علما شریعت کا جمود، فلسفی الطبع یونان سے رومہ کی مذہبی و سیاسی بے تعلقی، بربریوں کا حملہ اور اُن کا قبول مسیحیت وغیرہ متعدد و بہیم واقعات نے کیتھولک عقاید کو بالآخر غالب کر دیا۔ اس وقت سے حرّیت فکری کا خاتمہ ہوگیا اور بجز چھٹی صدی کی ایک آدھ استثنائی مثال کر اب علم و ادب تمام تر عبارت رہ گیا مواعظ و سوانح شہدا سے۔ دُور دراز ملکوں میں کچھ عرصہ تک آثار حیات قایم رہے۔ مثلاً سیویل میں ایک اسکول ساتویں صدی میں موجود تھا اور آئرلینڈ کی خانقاہوں میں شاید اس کے بھی چند سال بعد تک علم کے چرچے رہے ورنہ عام حالت کے لحاظ سے تو اب سارے یورپ پر علمی موت طاری تھی اور یہ جمود برابر قایم رہا تاآنکہ ابیلارڈ کی عقلیت و محاربات صلیبی نے اس قالب مردہ میں ازسرنو روح پھونکی۔ اس ساری مدت میں کیتھولک ازم کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ لاطینی زبان کو اُس نے ایک مقدس زبان کی طرح زندہ رکھا۔ یونانی زبان تو گویا مردہ ہو چکی تھی، حالانکہ یونان سے آمد و رفت کے تعلقات کبھی منقطع نہ ہو سکے۔ اور لاطینی زبان جو زندہ تھی اس کی یہ حالت تھی کہ اس کی تحصیل قطعاً ممنوع تھی اُس زبان کے قدیم مصنفین جہنم کے کُندے سمجھے جاتے تھے اور قرب قیامت کے خوف سے کسی کو دنیوی علوم کی طرف توجہ کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی تھی۔ راہبین و زاہدین مشاہیر مصنفین رومہ مثلاً ورجل، ہوریس وغیرہ کا ذکر انتہائی اہانت و تحقیر سے کرتے تھے۔

خانقاہیں اُس زمانہ میں کتب خانوں کا کام ضرور دیتی تھیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا

ہمارے نزدیک صحیح نہیں کہ اگر خانقاہیں نہ ہوتیں تو کہیں کتب خانہ قایم ہی نہ ہوتے اور اگر آخر میں کوئی یہ جتائے کہ راہبین کس محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کتابوں کی نقلیں کر کرکے سرمایۂ علوم کو محفوظ رکھتے تھے تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس دیدہ ریزی کے ساتھ قدیم صفحات سے حروف کو مٹا مٹا کر اپنی مزخرف داستانیں اُن پر تحریر کرتے تھے۔

البتہ ایک بات ضرور ہے جس میں دورِ خانقاہیت کے مصنفوں کو موجودہ مصنفین پر فضیلت حاصل تھی اور وہ وہ سکون، اطمینان خاطر، و یکسوئی تھی جو آج کل کے مصنفوں کو تو اب میں بھی نہیں نصیب آج کل ہر وقت جو یہ فکریں ہجوم کئے رہتی ہیں کہ کتاب کیونکر طبع ہو؟ کیسے شائع ہوگی؟ لوگوں میں مقبول ہوگی؟ اس سے شہرت و ناموری میں اضافہ ہوگا؟ کوئی اس کا جواب یا رد تو نہ لکھے گا؟ اُس دور کا مصنف ان افکار و پریشانیوں سے بری رہتا تھا۔ اُس کی اُمیدیں و توقعات تمامتر عقبیٰ کے اجر و نفع سے وابستہ رہتی تھیں۔ اُسے دنیوی مقبولیت و ناموری کی کیا پروا ہو سکتی تھی؟ پھر بعض دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ علم و ادب کو مذہب کی طرف سے تحریک ہوتی تھی۔ مثلاً مشہور اینگلو سیکسن شاعر کیڈمن کی بابت منقول ہے کہ ابتداءً اُس سے کس طرح نظم نہیں کہی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز خواب میں اسے بشارت ہوئی کہ "اُٹھ اور حمد باری میں کلام موزوں کر" اُس وقت سے وہ شعر کہنے لگا اور بہترین شاعر اپنے ملک کا ہو گیا۔ یا ایک مرتبہ ایک بدشوق لڑکا والدین و اُستاد کی سخت گیریوں سے تنگ آکر گھر سے نکل گیا۔ راستہ میں ضعف و ماندگی سے نڈھال ہو کر ایک کنوئیں کے سامنے بیٹھ گیا جس پر ایک لڑکی پانی بھر رہی تھی۔ اتنے میں اُس کی نظر کنوئیں کی جگت پر پڑی جو ایک جگہ سے گھس گئی تھی۔ اس نے لڑکی سے اس کا سبب پوچھا اُس نے جواب دیا کہ روز رسی کی رگڑ لگتے لگتے یہ اتنی گھس گئی۔ لڑکے کو اس "القائے ربانی" پر معاً تنبّہ ہوا، اور اس نے اپنے دل میں کہا کہ جب پتھر کی سل رگڑ کھاتے کھاتے گھس جاتی ہے تو میں تو انسان ہوں میں کیوں نہیں متواتر کوشش سے تحصیل علم کر سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ گھر واپس آیا اور اتنی ریاضت

کہ موت کے وقت وہی بدشوق لڑکا اسپین کا مشہور سینٹ آلیڈور کہلایا۔ ایک راہب صاحب جنھوں نے اپنی زندگی بدکاری میں بسر کی تھی۔ جہنم میں جھونکے جا رہے تھے، مگر محض اس بنا پر بچ گئے کہ ان کے گناہوں کا شمار اُن حروف سے نہیں بڑھنے پایا جن کی انھوں نے ایک مذہبی تصنیف میں کتابت کی تھی۔ اسی طرح ایک اور راہب کی قبر جب ۲۰ سال کے بعد کھول کر دیکھی گئی تو پایا گیا کہ اور سارا جسم سڑ گل گیا ہے۔ لیکن ہاتھ جس میں وہ قلم لیتا تھا بدستور اپنی حالت پر ہے۔ یا پھر ایک مرتبہ ایک مُصنّف کے انتقال کے روز رات کے وقت پڑوس کے خانقاہ کی ایک راہبہ کی آنکھ دفعتہً ایک تیز روشنی سے کھُل گئی۔ وہ سمجھی کہ دن نکل آیا۔ مگر اٹھی تو معلوم ہوا کہ ابھی رات ہے۔ مگر سامنے ایک نور مجسّم خاتون بیٹھی ہیں۔ جن کے چہرہ کی ضیا سے اُس مُصنّف کی قبر منور رہے اتنے میں قبر کے اندر سے ایک سفید براق قمری نکلی جسے اُس خاتون نے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خاتون خود جناب مریم تھیں جو اُس مُصنّف کی روح کی تقدیس کے لئے آئی تھیں کیونکہ جو مصنف و عالم اپنی زندگی صبر و تقویٰ کے ساتھ گزارتا ہے اُسے درجۂ شہادت نصیب ہوتا ہے۔

لیکن ان افسانوں کی خوشنمائی و دلفریبی ہمیں اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتی کہ کیتھولک عروج کا زمانہ بحیثیت مجموعی تاریخ کے تاریک ترین زمانوں میں ہوا ہے۔ اس وقت دنیا سے مسیحیت کی تمام قوتیں علوم عالیہ و فنون نافعہ سے قطعاً بیگانہ اور فقیہانہ موشگافیوں کی طرف یکسر متوجہ تھیں۔ جو شخص کسی واقعہ طبعی، فلسفی مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہتا اُس پر سحر، الحاد، یا بیدینی کا الزام لگا کر اُسے خاموش کر دیا جاتا اور سب سے بڑھکر یہ کہ تحقیق و تنقید کے ہر طریقہ پر مسیحیت نے بالکل مہر لگا دی تھی۔ کسی مسئلہ میں شک کرنا موافق و مخالف دونوں دلائل کو سُن کر رلئے قائم کرنا کسی عقیدہ کے لئے دلیل طلب کرنا کسی مسئلہ پر خالی الذہن ہو کر غور کرنا یہ سب ممنوع قرار پا گیا تھا۔ اب اگر کوئی غلط واقعہ انسان کے ذہن نشین ہو گیا ہو اس کی تصحیح آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اگر کسی غلط اصول استدلال کا رواج پڑ گیا ہو اس کی بھی اصلاح ممکن ہے۔ گو بہ دقت۔ لیکن جب

سرے سے تحقیق وتنقید، غور وفکر ہی کو حرام بلکہ کفر قرار دے دیا گیا تو اس کا علاج کس کے بس میں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہالت، توہمات ضعیف الاعتقادیوں کی گھٹا یورپ پر صدہا برس تک چھائی رہی۔ تا آنکہ جب سررشتہ تعلیم کی باگ خانقاہوں کے بجائے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں آچکی مسلمان سائنس کی اشاعت کر چکے۔ قدما، یونان و رومہ کی تصانیف علمی بیداری پھیلانے لگیں اور اس سرے سے اُس سرے تک تجارتی وکاروباری آزادی پھیل چکی، تب کہیں جاکر یہ ظلمت دُور ہوئی۔

میں خوب جانتا ہوں کہ میرا قرون وسطیٰ کی ذہنی زندگی کی اس قدر بدنما تصویر پیش کرنا بہت سے لوگوں کے ملال کا باعث ہوگا۔ اس وقت متعدد جماعتیں ایسی موجود ہیں جو مختلف اسباب کی بنا پر قرون وسطیٰ کی حمایت پر آمادہ ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ اُس زمانہ کی خوش اعتقادیوں کی بنا پر کچھ آثار قدیمہ کے سہارے پر کچھ اس غلط تاریخی کلیّہ کی بنا پر کہ ترقی کے بعد تنزل محال ہے اور پھر کچھ لوگ کیتھولک ازم کے استبداد سے خوش ظنی کی بنا پر غرض کسی نہ کسی تاریخی غلط فہمی کی بنا پر متعدد جماعتیں ایسا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کی یہ مدح وستائش ہمیشہ مغالطات پر مبنی ہوتی ہیں۔ ذیل میں ہم اس قسم کے چند عامۃ الورود مغالطات کو صاف کیے دیتے ہیں۔

(۱) پہلا مغالطہ یہ ہے کہ "چونکہ ایک مُدّت دراز تک یورپ کی علمی زندگی خانقاہوں میں محدود رہی لہٰذا اگر خانقاہوں کا وجود نہ ہوتا تو آج علوم کا بھی پتہ نہ ہوتا۔" ہمارے نزدیک اس استدلال کا مقدمہ اگرچہ بالکل صحیح ہے تاہم نتیجہ قطعاً غلط ہے۔ یہ بے شبہ صحیح ہے کہ ایک مُدّت تک خانقاہوں نے تحفظ علوم میں بڑا کام کیا، لیکن مشرکوں کے زمانہ میں علوم کی اشاعت بہت دُور دراز ممالک میں ہو چکی تھی۔ مصر وایشیائے کوچک گویا مراکز تمدن تھے۔ یونان سے بھی علم رخصت نہیں ہوا تھا۔ اسپین، گال، و برطانیہ میں معلّمین، کتب خانوں کی افراط تھی۔ ناربون آرلیس، بورڈو، ٹولو، لیانس، ارسیلز، لوایٹرز، وٹریوس کے مدارس کی خاص طور پر شہرت تھی ۳۷۶ء میں مسیحی فرماں روا گرتیین نے گال میں وہی قانون جاری کیا جو انٹونائنس کے وقت میں

اٹلی میں ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ ہر بڑے شہر میں حکومت کی طرف سے معلّمین کو وظایف ملتے رہیں پس لاطینی لٹریچر کی اس قدر وسیع اشاعت کے بعد کون ذی عقل اسے تسلیم کرسکتا ہی کہ سخت سے سخت حالات مخالف بھی اسے دنیا سے فنا کرسکتے تھے؟ اگر کھولک ازم نہ اُٹھ کھڑی ہوتی تو کوئی دوسرا طریقہ تحفظ علوم کا نکل آتا۔ پھر خدمت علم کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تحفظ و بقائے علوم دوسرے اضافہ علوم۔ ظاہر ہی کہ ان میں سے دوسرا طریقہ بدرجہا بلند و ممتاز ہے۔ لیکن راہبان خانقاہ نے زیادہ سے زیادہ صرف پہلی صورت پر قناعت کی اور دوسرے طریقہ کو ہاتھ لگانا ہمیشہ گناہ سمجھتے رہی۔ قدماء کے ذخائر و خزائن کو محفوظ رکھنے کی جو کوششیں انھوں نے کیں، بے شبہ ہم ان کے لئے ان کے بہت ممنون ہیں۔ لیکن یہ بہت مشتبہ ہی کہ ان کی یہ خدمت کبھی اُن کے ان معاصی کا کفارہ کرسکتی ہے کہ انھوں نے حرّیتِ فکری کا خاتمہ کردیا۔ غور و فکر کا سدباب کردیا اور تحقیق و تنقید کو ممنوع قرار دیدیا۔

(۲) اسی مغالطہ کا کسی قدر مختلف پیرایہ میں یوں بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ "صدیوں تک جتنے علماء پیدا ہوتے رہی وہ سب کے سب فقہا و مقتدایان شریعت ہی تھے۔ پس اگر انھوں نے ادھر توجہ نہ کی ہوتی تو دنیا سے علم کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہوتا" اس طرز استدلال پر ہمیں ایک قصہ یاد آتا ہی۔ جو سروٹے نقل کیا ہی وہ کہتا ہے کہ ایک قیدی اپنے ایندا دہن سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری کے اندر نظر بند رکھا گیا تھا جس کے دیوار میں ایک شگاف تھا اور صرف وہی راستہ روشنی کا تھا۔ ایک مدت کی نظربندی کے بعد قیدی کو یقین ہوگیا کہ اگر یہ دیوار گر جائے گی تو یہ شگاف بھی نہ رہے گا۔ اور اس لئے اتنی روشنی بھی بند ہو جائے گی آپ کہتے ہیں کہ جو کچھ علمی روشنی تھی وہ ان فقہا کے دم سے تھی۔ میں کہتا ہوں کہ یہی ظالم تو علمی روشنی کے سدِّ راہ تھے۔ انھوں نے اگر اپنے مُتبّعین کے قوائے عقلی کو مُعطّل نہ کردیا ہوتا تو دنیا معلوم نہیں آج کہاں سے کہاں ہوتی۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس جماعت نے بعض نہایت مفید علمی خدمات انجام دیں۔ سینٹ ٹامس اکوناس و سینٹ بینڈیکٹ کے علم فضل

وکمال تبحر سے کس کی مجال انکار ہوسکتی ہے؟ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ اس جماعت نے کیا کیا؟
بلکہ یہ ہے کہ یہ جتنا کر سکتی تھی اُس میں سے کس قدر کیا۔ جس قدر غیر محدود مواقع اسے حاصل تھے
اُنھیں دیکھتے ہوئے اس نے کتنا کام کیا؟ دس بیس برس نہیں، صدیوں تک یہ حالت رہی
کہ جس شخص کو ذرا بھی علمی مذاق سے مَس ہوتا تھا وہ راہب بن جاتا تھا۔ یہ راہب رومہ کی
زبان سے واقف ہوتے تھے اور بآسانی اس کے اعلیٰ علوم سے واقفیت حاصل کرتے
اور پھر ان راہبوں کو ہر طرح پر یکسوئی، اطمینان، وفارغ البالی حاصل رہتی تھی۔ ان سب حالات
مساعد کو پیش نظر رکھکر اس کا خیال کیجیے کہ انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں اُن کا کیا وزن
اور کیا مرتبہ ہے، جب البتہ اس بحث کا صحیح فیصلہ ہوسکتا ہی۔ پھر سب سے بڑھکر یہ کہ جو زمانہ کیتھولک
علم پرستی کے شباب کا کہا جاتا ہی اُس میں بھی حقیقتاً جتنے دقیع واہم علمی کارنامے ہوئے اُن کا
فخر مقتدایان شریعت کو نہیں بلکہ اُن افراد وجماعات کو حاصل ہے جنھیں اس حلقہ سے کوئی
واسطہ نہ تھا۔ مشہور عالم طبیعات راجر بیکن کہنے کو راہب تھا۔ لیکن واقعتہً اُس نے جو کچھ
کام کیا وہ سب راہبانہ قواعد واحکام کے بالکل علی الرغم کیا۔ بالآخر وہ اسی جُرم میں قید کر دیا
گیا اور ۱۴ سال کی اسیری کے بعد جب مرا ہی تو اس کا نام ساحروں کے طبقہ میں لیا جاتا
تھا۔ معمل وتجربہ گاہیں جو کچھ بھی تھیں وہ یا تو کیمیا سازی کی تماشا گاہیں تھیں اور یا مُسلمانوں
کی قایم کردہ تھیں، قطب نما، بارود، وکاغذ کی ایجادیں اُسی زمانہ میں ہوئی ہیں۔ لیکن کیا
ان میں سے ایک شے بھی راہبوں اور خانقاہ نشینوں کی کوششوں کی شرمندۂ احسان ہی؟
ہرگز نہیں۔ قطب نما کی ایجاد کی تو پوری تحقیق نہیں۔ لیکن آخر الذکر دو چیزوں کو تو قطعاً مسلمان
اپنے ہمراہ یورپ میں لائے۔ اور روئی کے کاغذ کا رواج تو مُسلمانوں میں ۱۰۰۹ء سے شروع
ہو گیا تھا۔ حالانکہ مسیحی اس سے تیرھویں صدی کے آخر تک ناواقف رہی۔ عیسائیوں نے
سب سے پہلے توپخانہ کا استعمال جنگ کریسی میں کیا۔ اور بارود سے اوّل بار ۱۳۳۸ء میں
واقف ہوئے۔ لیکن مُسلمان اس سے گیارھویں صدی ہی کے آخر میں واقف ہو گئے تھے

خلاصہ یہ کہ اختراع و ایجاد، اکتشاف و اجتہاد سے قرون وسطیٰ کے مسیحی فضلا ہمیشہ بیگانہ رہے اور تحقیق و تنقید کے شوق کو پیدا کرنا کیسا، ہمیشہ اسے دباتے ہی رہے۔

(۴) ایک غلط فہمی کا اظہار ان الفاظ میں کیا جاتا ہے کہ "کیتھولک ازم اگرچہ ترقی تمدن جدید کی زیادہ معین نہیں بلکہ ایک حد تک اس راہ میں ہارج ہے۔ تاہم ایک زمانہ میں یہ بہت مفید رہی ہے اور جس وقت تک تمدن اس طرح پر نہیں پہنچا تھا وہ بہت کارآمد شے رہی ہے" مجھے اس دعوے کی صحت میں بہت تامل ہے۔ اگر کیتھولک ازم کے اصول ترقی تمدن کے معین تھے تو انھیں ہمیشہ معین رہنا چاہیئے تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت وہ مفید ہوں اور چند روز کے بعد مُضر ہو جائیں۔ میرے نزدیک وہ اصول شروع ہی سے ترقی تمدن کے مخالف تھے، البتہ شروع میں ان کی مضرت زیادہ ظاہر نہیں ہونے پائی۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے بعض زہر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کو ہلاک کرنے سے پیشتر اس پر سکون و افاقہ طاری کر دیتے ہیں۔ ان کا آخری نتیجہ اہلاک یقینی ہوتا ہے۔ البتہ وہ زود اثر نہیں ہوتے یہی حال کیتھولک ازم کا تھا۔

تمدن و شائستگی، اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی قوم جاہل رہکر متمدن ہو سکے۔ یہیں سے علم و اخلاق کے ارتباط کی بھی بنا پڑتی ہے۔ جو قوم علمی تحریک علمی زندگی کو مُردہ کرتی ہے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر اخلاقی زندگی پر نہ پڑے۔ اس عام جہالت نے دو طرح پر علمی زندگی کے انحطاط میں اخلاق پر مخصوص و براہ راست اثر ڈالا۔ سب سے پہلا اثر تو یہ پڑا کہ حق و صداقت کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو گئی۔ بڑے سے بڑے مصنفین و ثقات مؤرخین کی تصانیف اُٹھا کر دیکھو۔ کذب و افترا، مبالغہ و اغراق، تدلیس و تحریف کا انبار نظر آئیگا یہاں تک کہ ایک موجودہ مشہور جرمن مؤرخ گھبرا کر کہہ اُٹھا کہ "مسیحی صداقت" ایک ایسا مرکب اضافی ہے جس کے مضاف و مضاف الیہ باہم قطعاً متناقص ہیں۔ مگر یہ عام بد دیانتی و کذب شعاری اُن لوگوں کے نزدیک چنداں معیوب نہ تھی۔ جن کے نزدیک نجات کا دارومدا

اخلاق وحسن وعمل پر نہیں بلکہ اعتقاد پر تھا۔ وہ اگر اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو صرف کلیسا کی تائید وحمایت میں اور کلیسا کی تائید میں سب کچھ جائز تھا۔

دوسرا بڑا اثر اخلاق پر یہ پڑا کہ معاصی کا کفارہ فدیۂ زر سے ہونے لگا۔ شرک و مسیحیت میں ابتدا سے مابہ الامتیاز یہ چلا آتا تھا کہ آخر الذکر کے نزدیک طینت کی پاکیزگی و نیت کی صفائی کنج العبادت تھی۔ بخلاف اس کے مشرکوں کے یہاں باطنی پاکیزگی کو عبادات و مذہبیت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ خود مشرکوں کے یہاں اس کے خلاف بھی خال خال مثالیں ملتی ہیں (مثلاً سسرو، پولونیس، ومتبعین فیثاغورس کے ہاں) لیکن عام حالت مشرکوں کی یہ تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی فاسق وفاجر ہو بڑے سے بڑا مذہبی پیشوا بن سکتا تھا۔ مسیحیت نے شروع شروع میں اس کی شدید مخالفت کی تھی اور زہد وطاعت کو بالکل حسن اخلاق پر مشروط رکھا تھا، لیکن یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ امتداد زمانہ سے مشرکانہ جذبات کی اس میں آمیزش ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ابتدا میں اس کی بنیاد خیر وخیرات کے راستہ سے پڑی یعنی مسیحیت نے فیاضی پر زور دینا شروع کیا اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ جما دیا کہ جو لوگ اس دنیا میں راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں انھیں یہ سب آخرت میں واپس مل جائیگا اس عقیدہ کی بہترین شہادت ساتویں صدی کے ایک مصنف کے بیان کردہ افسانہ میں یوں ملتی ہے کہ ایک متمول مشرک نے قبول مسیحیت کے بعد پادری سائنسیس کے ہاتھ میں کچھ اشرفیاں اس غرض سے دیں کہ غربا کو تقسیم کر دی جائیں اور اُس سے بطور نائب مسیح کے یہ تمسک لکھوا لیا کہ عقبیٰ میں اس کا یہ قرض ادا ہو جائے گا۔ کئی سال کے بعد جب اُس پر حالت نزع طاری ہوئی تو اُس نے اپنے فرزندوں کو وصیت کی کہ میرے ساتھ کفن کے اندر وہ تمسک بھی رکھ دینا۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور تین دن کے بعد اس نے سائنسیس کو خواب میں یہ دکھلایا کہ وہ میرا قرض ادا ہو گیا۔ میری قبر کھودو اس میں رسید رکھی ہوئی ملے گی۔ چنانچہ سائنسیس نے قبر کھودی اور واقعۃً اُس میں مُردہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسید

اس مضمون کی نکلی کہ مسیح نے میرا قرض بیباق کر دیا!

اس خوش عقیدگی نے ترقی کرتے کرتے رفتہ رفتہ نہایت مبالغہ آمیز شکل اختیار کر لی بڑی بڑی جائدادیں خانقاہوں پر واقف کی جانے لگیں، مزارات شہدا و بزرگان دین پر افراط سے نذریں چڑھنے لگی مختلف سیاسی و مذہبی اسباب کی بنا پر راہبین بہترین امانت دار سمجھے جانے لگے اور صدمہ و غم، بیماری کاہلی، اور خوف و خطر کے ہر موقع پر نذر چڑھانا داخل فرائض ہو گیا۔ بلکہ اُمرار کے لئے اپنی موت کے وقت خانقاہوں کے واسطے جائدادیں وقف کرنا اس قدر لازمی قرار پا گیا کہ اس کا تارک تقریباً دائرہ مسیحیت سے خارج سمجھا جانے لگا۔

ایک مشہور مؤرخ نے کہا ہے کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کو ہم ادوار ثلٰثہ میں رکھ سکتے ہیں پہلا دَوروہ تھا جس میں مذہب عبارت تھا اخلاق سے دوسرا وہ جس میں مذہب مُرادف تھا جمود و تعصب و تقشف کے اور تیسرا دَور وہ جو ساتویں صدی سے شروع ہوتا ہے جس میں مذہب نام تھا خانقاہوں پر صرف زر کا۔ کیتھولک ازم کا استبداد، ملک کی عام ناخواندگی وجہالت اور چھٹی صدی سے لے کر بارہویں صدی تک کی علمی ظلمت ان سب چیزوں کا مل ملا کر یہ نتیجہ ہوا تھا کہ جو قوت پہلے الحاد و بیدینی کے رد میں صرف ہوتی تھی وہ اب اکتساب ثروت کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور بڑے سے بڑا سیہ کار بھی اپنے فسق و فجور کا کفارہ نذرونیاز، صدقہ و خیرات کی صورت میں دیدینا کافی سمجھنے لگا۔

ادھر راہبوں نے بھی جن کا اگلا جوش اب سرد پڑ چکا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کے افعال پر کوئی بازپُرس کرنے والا نہیں اور دولت مند تو وہ ہو ہی چکے تھے۔ پھر انھیں متقی و محتاط رہنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ اب یہ کھل کھیلے اور ہر طرح پر خوب داد عیش دینے لگے ان میں کے اکثر دل سے تارک الدنیا تو پیشتر سے بھی نہ تھے۔ بلکہ صرف محنت و مشقت و فوجی خدمت سے بچنے کے لئے اس جماعت میں آکر شامل ہو گئے تھے۔ ان آسانیوں کے مقابلہ میں قیود ان کے لئے صرف یہ دو تھے:۔ ایک تجرّد دوسرے افلاس۔ لیکن جب کبھی موقع ملتا

تو یہ ان قیود کو توڑ دینے میں کبھی تامّل نہ کرتے۔ بلکہ آزادی کے ساتھ عورتوں سے تعلق رکھتے اور خوب دولت جمع کرتے جاتے۔ تین چیزیں اس راہبانہ حُبّ دولت کی اور بھی معین ہوئیں ایک تو قُربِ قیامت کا اعتقاد خصوصاً دسویں صدی کے خاتمہ پر، دوسرے محاربات صلیبی کہ ان مواقع پر بہایت کثرت سے پُرانے عہود و مواثیق مالی کفارہ دیکر توڑے گئے۔ اور تیسرے وہ مُہلک وبائے طاعون جس نے سارے ملک پر ہیبت و دہشت مُسلّط کر دی تھی۔ ان تمام حالات کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمراء و سلاطین کی خوبیوں کا معیار تمامتر اُن کی یہی مالی فیاضیاں رہ گئیں اور جو شخص جتنا زیادہ اوقاف کلیسا میں صرف کرتا۔ معاصر راہب مؤرخین کی نظروں میں اُسی قدر بہتر و با اخلاق سمجھا جاتا

بے شبہ کوئی کلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا۔ اس ظلمت کدہ میں بھی کبھی کبھی ذرّات نور چمک اُٹھتے تھے۔ چنانچہ آیرلینڈ کے راہبین قبول وظائف میں جس استغنا کا اظہار کرتے تھے یا جن بعض خانقاہوں نے کبھی اعلیٰ سر رشتۂ اخلاق ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یا پھر بعض راہبوں نے جس قوت و استقلال کے ساتھ مذہبی مقاصد میں ناجائز رقموں کے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم ان سے ناواقف نہیں بلکہ ان کا پوری طرح اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال مستثنیات کا نہیں، بلکہ عام حالت کا ہے اور وہ ایک مُسلسل داستان ہے راہبوں کی زر پرستی اور عوام کی خوش اعتقادی کی۔ آخر کار یہ زر پرستیاں و سیہ کاریاں اتنی بڑھ گئیں کہ ان کے خلاف ردّ عمل شروع ہوا۔ مگر اس کا آغاز کہیں صدیوں کے بعد ہوا۔ اُس وقت تک یہ مذہبی قزاقی اپنا کام کر چکی تھی اور مقتدایان کلیسا کے کیسہ پُر ہو چکے تھے۔

ہمارے نزدیک اس مذہبی تخویف و دہشت زدگی نے جتنا کام مشرکوں کو مسیحی بنانے میں کیا تھا اُس سے کہیں زیادہ اس دَور خانقاہیت میں کیا۔ کبھی کبھی اتفاق سے ایسے بھی پادری پیدا ہو جاتے تھے جو ان متفق علیہ مسائل کو اختلافی بنانا چاہتے تھے

کہ کافروں پر عقوبت دائمی ہوگی مسیحیت کے قبل جتنے حکما گزرے ہیں سب جہنمی تھے اور بچے جو قبل بپتسمہ لینے کے فوت ہو جاتے ہیں عذاب ابدی کے مستحق ہوں گے۔ لیکن ان مشکلین کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہتی تھیں کیونکہ درحقیقت ان مسایل پر فقہا کا اجماع عام تھا اور یہ کیتھولک کلیسا کا اصل الاصول تھا کہ تمام کفار بلکہ خود مسیحیوں ہی کی ایک بڑی تعداد آخرت میں لیے عذاب ابدی میں گرفتار رہے گی اور عذاب بھی ایسا شدید جس کے مقابلہ میں دُنیا کی تمام آلام و شداید ایک راحت ہیں۔ کیتھولک کلیسا کا یہ اصل الاصول بجائے خود کیا کم تھا۔ راہبان خانقاہ نشین نے اسے اور مبالغہ ونگ آمیزی کے ساتھ بیان کرنا شروع کیا سینٹ میکیریس کی بابت روایت ہے کہ ایک بار اُسے جنگل میں ایک انسان کا کاسۂ سر پڑا ہوا ملا۔ اس نے اپنا عصا اُس پر مارا جس سے اُس میں قوت تکلم آگئی۔ اُس نے بیان کیا کہ "میں مشرکوں کے ایک بزرگ کا سر ہوں جو دنیا میں ظہور مسیحیت سے بہت پیشتر تھا اور اس لیے اب دوزخ کا کُندہ ہو رہا ہوں۔ جتنا فاصلہ زمین سے آسمان تک ہے اتنے ہی بلند آتش دوزخ کے شعلے اُٹھتے ہیں۔ کفار و گنہگاروں پر پشت کی طرف سے عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ میری التجا صرف اتنی ہے کہ آپ کی دعا سے سامنے کی طرف سے عذاب نازل کیا جائے تاکہ میں کم از کم اپنے رفقا کی شکل تو دیکھ سکوں اور "مرگ انبوہ جشنے دارد" ہی کے اصول پر کچھ تسکین حاصل کر سکوں"۔ اسی طرح سینٹ گری گوری کی بابت مشہور ہے کہ شاہ ٹریجین کے محاسن و فضائل سے متاثر ہو کر اُس نے اُس کی بخشش کی دُعا کی اُس کی اس دُعا پر خود اُس کے اوپر عتاب نازل ہوا اور بالآخر جب اُس نے اس کا عہد کیا کہ آیندہ کبھی اس طرح کی دُعا نہ کرے گا۔ تب جا کر اتنا ہوا کہ ٹریجن پر عذاب میں تخفیف ہو گئی۔

راہبوں نے بکمال سرگرمی چند ہی روز میں آلام و شداید جہنم کے مناظر سے متعلق اچھا خاصہ انبار پیدا کر دیا جس میں سے گری گوری اعظم کی ایک تالیف خاص شہرت رکھتی ہے۔ مگر جو اوّل سے لے کر آخر تک اکاذیب و موضوعات کا مجموعہ ہے۔ اسی کی ایک روایت

یہ ہے کہ ایک شخص اسٹیفن نامی غلطی سے مرگیا تھا۔ جب اس کی روح داور محشر کے حضور میں
پیش ہوئی تو ارشاد ہوا کہ اس اسٹیفن کی نہیں بلکہ اس کے ایک ہمنام کی روح قبض کرنے کا
حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی روح دوزخ کا ایک منظر دکھائے جانے کے بعد دنیا میں واپس
کردی گئی اور معاً ایک دوسرا اسٹیفن وفات پاگیا۔ کوہ آتش فشاں اس نقطۂ خیال سے
ابواب جہنم ہیں اور سسلی میں ان کے دہانے جو وسیع ہوتے جاتے تھے۔ اس کا سبب سینٹ
گری گوری کے الفاظ میں یہ تھا کہ قرب قیامت کے باعث ان میں عنقریب بہت بڑی تعداد
دوزخیوں کی داخل ہونے والی ہے۔ اسی واسطے یہ وسیع کیے جارہے ہیں۔ متعدد راہبوں
نے مشرک تاجداروں کی ارواح کو دوزخ میں پڑے ہوئے مکاشفہ میں بچشم خود دیکھ لیا تھا۔

مگر آگے چل کر متاخرین راہبین نے اس باب میں شدید مبالغہ آمیزیوں سے کام لینا
شروع کیا۔ ان کے سامنے سینٹ گری گوری کی داستان بھی پھیکی اور بے مزہ رہ گئی۔
ساتویں صدی سے لے کر بارھویں صدی تک عذاب اُخروی کے چشم دید حالات اس جزئی
تفصیل سے بیان کیے جاتے رہے کہ خالق کائنات کی جانب ذمایم اخلاق کا انتساب ان سے
زیادہ ممکن ہی نہیں۔ دوزخ کے وسط میں شیطان ایک دائرہ تار کے اندر لوہے کی دہکتی ہوئی
زنجیروں سے جکڑا ہوا کھڑا ہوا ہے۔ مگر اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جن سے وہ
دوزخی ارواح کو پکڑ پکڑ کر اپنے دانتوں سے نوچتا ہے اور پھر اپنے شکم میں جو معدن آتش ہے
ڈال لیتا ہے۔ فرشتگان عذاب لوہے کے دہکتے ہوئے گرز لیے ہوئے ارواح کو آگ سے برف
میں اور برف سے آگ میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عذاب کے اور مختلف طریقے بھی
ہیں۔ مثلاً کوئی زبان کے بل لٹکا ہوا ہے۔ کوئی لکڑی کی طرح چیرا جارہا ہے۔ کسی کو سانپ ڈس رہے
ہیں۔ کسی کے سر پر ہتھوڑوں کی مار پڑ رہی ہے۔ کسی کا جسم اُبال کر کپڑے میں نچوڑا جارہا ہے
وقس علیٰ ہذا۔ گنہگاروں کو پل صراط پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور آتش جہنم کو آتش دنیوی سے
وہی نسبت ہوتی ہے جو اصل جسم کو سایہ سے ہوتی ہے۔ گویا یہ اُس کے سامنے اتنی ہی حقیقت ہے

پھر اُس میں گندھک کی بھی آمیزش ہوتی ہے اور کسی قسم کی روشنی نہیں ہوتی تاکہ دوزخیوں کو منجملہ اور تکالیف کے ایک تاریکی کی تکلیف بھی برداشت کرنا پڑے۔[1]

ہمارے موجودہ تعلیم یافتہ ناظرین ان نفرت انگیز تذکروں سے ممکن ہے کہ اکتا گئے ہوں لیکن آج سے چند صدی پیشتر جو زمانہ تھا اُس کی یہ حالت نہ تھی۔ اُس وقت لوگ انھیں بکمال خوش عقیدگی سُنتے تھے اور ان سے بدرجۂ غایت متاثر ہوتے تھے۔ بجز ایک پیلیجیس کی استثنائی مثال کے جو جدید سائنس والوں کا ہم مذاق تھا اور سب کا یہ متفق علیہ اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ اوّلین کی پاداش میں دنیا پر موت، بیماری وغیرہ جملہ عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر شخص قربِ قیامت کا معتقد تھا اور شیاطین کی قوت و کارفرمائی کا ہول ہر دل میں سمایا ہوا تھا۔ ان معتقدات کو موثر بنانے کا سب سے چلتا ہوا گر مقتدایانِ فرقہ کیتھولک کے ہاتھ میں یہ تھا کہ انھیں بچّوں کے ذہن میں ایامِ طفولیت ہی سے بٹھانا شروع کر دیتے تھے تاکہ آیندہ کبھی یہ نقوش محو نہ ہوسکیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بیماری یا مصیبت کے وقت لوگوں کو وہی تصویریں اپنے گرد چلتی پھرتی نظر آنے لگتی تھیں جو اُن کے واہمہ میں عرصہ سے جاگزیں تھے سینٹ گری گوری کی روایت ہے کہ ایک صاحب جو بڑے عابد و زاہد سمجھے جاتے تھے مگر جو خفیہ طور پر اپنی غذا میں گوشت کا استعمال رکھتے تھے جب دنیا سے کوچ کرنے لگے تو حالتِ نزع میں انھوں نے دیکھا کہ ایک مہیب اژدہا ان کے جسم کے گرد چکر مارے بیٹھا ہے اور ان کی روح قبض کر رہا ہے۔ یا اسی طرح ایک پنجسالہ معصوم بچہ نے جس نے اپنے باپ کی زبان سے کلماتِ کفر سُن کر انھیں سیکھ لیا تھا، مرتے وقت یہ دیکھا کہ فرشتگانِ عذاب ارد گرد کھڑے ہوئے اُسے دوزخ میں لے جانے کی عجلت کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ معتقدِ کلیسا کی یرقانی آنکھ کو دنیا میں ہر چہار طرف عذاب و عقوبت ہی کی زردی دکھائی دیتی تھی۔ وہ لطف و

[1] اس طرح کے دہشت انگیز قصص کے بیان کرنے میں آئرلینڈ کے راہبوں کا نمبر اوّل ہے۔

تفریح کی سب بے ضرر چیزوں کو مُہیب ہی سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ شفق کی زردی آمیز سرخی کی وہ یہ تعبیر کرتا تھا کہ آفتاب اس وقت دوزخ کے قریب ہو رہا ہے اور اس کی وحشت سے اس کا یہ رنگ ہو رہا ہے۔

شقاوت و قساوت کے یہ کارنامے نیرو و فیلیریس کے شایان شان ہوں تو ہوں (بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کے سامنے نیرو کی شقاوتیں عشر عشیر کا بھی درجہ نہیں رکھتیں) لیکن ایک ایسی ذات کی طرف جسے رحمٰن و رحیم، غفّار و ستّار کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا اور جو ہمہ تن مرحمت و مغفرت سمجھا جاتا تھا۔ ان کا انتساب کسی طرح دُرست نہیں ہو سکتا۔ مگر نفس انسانی کی اس بوالعجبی کو کیا کہیے کہ جو لوگ مشرکوں پر یہی سب سے بڑا اعتراض کرتے تھے کہ وہ اپنے معبودوں کی جانب ذمایم اخلاق کا انتساب کرتے ہیں۔ وہی صدیوں تک بکمال خوش عقیدگی اس خرافات کو جزو ایمان کیا، اصل ایمان سمجھتے رہے۔ ہم لوگ آج کسی بڑے سے بڑے ظالم و جبار کے انتہائے ظلم کے لئے اس کے سوا اور کیا پیرایۂ بیان اختیار کر سکتے ہیں کہ وہ اسلاف کے جرایم کی پاداش میں اخلاف کو پشتہا پشت تک مُبتلائے عذاب رکھتا تھا مگر یہ کیا قیامت تھی کہ بعینہ اس خصوصیت کو بے تکلف بلکہ بفخر معتقدایان فرقہ کیتھولک اپنے معبود حقیقی کی طرف منسوب کرتے رہے۔ ان بزرگواروں میں ایک نہایت مشہور بزرگ پیٹر لومبرڈ ہوئے ہیں جو اس پایہ کے شخص تھے کہ ان کی تصنیف کی چار ہزار جلیل القدر فقہا نے شروح و تفاسیر لکھیں۔ ان حضرت کی تصنیف کا ایک فقرہ سننے کے قابل ہے۔ اس مسئلہ پر داد تحقیق دیتے ہوئے کہ اہل بہشت و اہل دوزخ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے، ارشاد ہوتا ہے کہ

"اب خاتمۂ سخن پر ہمیں یہ منقح کرنا ہے کہ دوزخیوں کو مبتلائے عذاب دیکھکر بہشتیوں کو درد معلوم ہوگا یا اس سے ان کی مسرت میں اضافہ ہوگا؟ گری گوری کا مقولہ ہے کہ اس منظر عذاب سے ہرگز ان کی مسرت میں خفت نہ ہوگی کیونکہ جب اُن کے دل میں رحم اور ترس کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوگا

پھر کیا شے اُن کی مسرت کو کم کرنے والی ہوگی۔ اور اگرچہ بہشتیوں کو مسرت بجائے خود بہت کافی ہوگی تاہم جب وہ گنہگاروں کی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کریں گے تو انھیں اور زیادہ فخر و سرور حاصل ہوگا کہ وہ فضلِ خدا سے ان تکالیف سے محفوظ رہ گئے۔ پس نیکوکاروں کو بشارت ہو کہ وہ دوسروں کو مبتلائے آلام دیکھکر اپنی مسرت و راحت میں اور اضافہ حاصل کریں گے اپنی نجات پر خدا کا شکر بجا لائیں گے۔ اور جو لوگ کفر و معصیت میں پڑے رہے تھے۔ انھیں کیفرِ کردار کو پہنچتے دیکھکر لطف حاصل کریں گے۔"

اُس زمانہ میں ہر شے کی لفظی تحقیق و موشگافی کا جو خبط پیدا ہو گیا تھا اُس سے اس خرافات کی اشاعت کو اور تقویت پہنچی۔ ان لوگوں کے لئے یہ نا ممکن تھا کہ جب تک بال کی کھال نہ نکالیں جب تک جزئی تفصیلات پر اطلاع نہ حاصل کرلیں محض "عذاب اخروی" پر قانع رہ جائیں۔ ہاں تو ایک سبب اس کا یہ تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ راہبانہ طرزِ زندگی و خلوت نشینی بجائے خود التباس حواس پیدا کرکے متخیلہ کے سامنے ایسی صورتیں پیش کردیتی ہے۔ اور پھر تیسرا سبب سب سے بڑھکر لوگوں کی ارادی بد دیانتی و کذب شعاری تھی۔ لیکن یہ نفس بشری کا خاصۂ فطری ہے کہ وہ مدت دراز تک خوف و دہشت کی حالت میں نہیں رہ سکتا ہے بلکہ جہاں اپنے دل سے اسباب دہشت پیدا کرتا ہے وہاں اُن کا توڑ بھی اپنے دل سے پیدا کرلیتا ہے چنانچہ جہاں خوش عقیدگی کی آنکھ کو ہر طرف شیاطین کا مجمع نظر آتا تھا۔ وہاں ملائکہ کی بھی کمی نہ تھی اور رفع دہشت کا سب سے زیادہ موثر و مجرب نسخہ یہ ثابت ہوا کہ کسی پیر فقیر کو گرانبہا نذر دیدی جائے۔ یا خانقاہوں پر جائداد وقف کردی جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک مُردہ کے اعمال کا وزن ہو رہا تھا تو بدکاریوں کا پلہ بہت جھکا ہوا نظر آیا اور قریب تھا کہ فرشتگان عذاب اپنا کام شروع کردیں کہ دفعۃً سینٹ لارنس کی درگاہ کے ایک مجاور نے قدم رکھا اور سونے کا ایک ٹکڑا جو اُس مُردہ نے درگاہ پر چڑھایا تھا دوسرے پلّہ میں ڈال دیا جس سے معاً اُس کا وزن بہت بڑھ گیا اور مُردہ کی نجات ہوگئی۔ بالکل اسی طرح

ڈیگوبرٹ، شارلمین وغیرہ کو نجات حاصل ہوئی۔ بلکہ بعض اشخاص جو گناہوں کی گٹھری لادے ہوئے مر گئے کبھی کبھی اپنے پیروں کی دعا سے دوبارہ زندہ کیے گئے ہیں تاکہ اُن کے داغ معاصی کفارہ مالی کے پانی سے دھو دیئے جائیں۔ اور اس طرح جوں جوں تخویف مذہبی کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ جوں جوں لوگ عذاب اُخروی کی وحشت کا زیادہ شکار ہوتے گئے اُسی نسبت سے راہبوں اور خانقاہ نشینوں کے کیسے زیادہ پُر ہونے لگے۔

اُس زمانہ میں شریعت نے جس سختی کے ساتھ معاشری زندگی کو اپنے شکنجہ میں کس رکھا تھا۔ درحقیقت اس کا اندازہ وہ لوگ کر ہی نہیں سکتے جنھوں نے اُس زمانہ کی تصنیفات و لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہزاروں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز معجزات کی داستانیں اُس وقت موجود تھیں بلکہ نہایت کثرت سے تھیں اور بالقصد وضع کی گئی تھیں اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب مسیحیت برائے نام مسیحیت رہ گئی تھی ورنہ تعدد آلہہ و شرک کے لحاظ سے اُس میں اور بُت پرستی میں کوئی فرق نہیں باقی رہا تھا۔ ملک کی عام جہالت دماغی سطح کی پستی۔ نیم مسیحی بربریوں کی وحشیانہ مذہبیت خانقاہوں کا اقتدار و اثر مقتدایانِ کلیسا کی خود غرضیاں، معاصی کے مالی کفارہ دینے کا رواج عام جہنم کی وحشت و ہیبت ان سب چیزوں نے مل ملا کر کلیسا کی قوت کو فوق الحد بنا دیا تھا۔ ایسی کہ کسی کو مخالفت کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی تھی۔ رد و انکار کا پہلا زینہ ہے شک و بے اطمینانی اور یہاں سرے سے شک وسوسہ شیطانی کے مُرادف قرار دے کر قطعاً ممنوع و حرام کر دیا گیا تھا جس کی سزا ایسی شدید رکھی گئی تھی کہ لوگوں کا کلیجہ اس کے تصور ہی سے دہل جاتا تھا اور مقتدایانِ کلیسا نے بکمال دانشمندی ایسا نظام اقتدار تیار کر رکھا تھا کہ انسان اپنی ہر تکلیف و مصیبت کے وقت اُنھیں کی طرف رجوع کرنے میں اپنے تئیں مجبور پاتا تھا جس سے ان کی گرفت اہل دنیا پر اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علم و تعلیم، دولت و ثروت، امارت و حکومت، غرض ہر قسم کی قوتیں آ کر انھیں کی ذات میں جمع ہو گئیں۔

ان حالات کے ساتھ اندازہ کرو کہ اُس زمانہ میں جن روشن خیالوں نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا ہوگا۔ اُنھیں کیسی شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا! تقلید کی بندشوں سے آزادی ہمیشہ اور ہر جگہ مشکل رہی ہے۔ لیکن جب بندشیں اس قدر سخت و سنگین ہوں تو ان پر غالب آنے میں دشواریاں بھی کس بلا کی پیش آئی ہوں گی! لوگ کسی بڑے بلوہ یا بغاوت کے مصائب کا آسانی سے تصور کر سکتے ہیں اور قتل و خون دار و زندان کے شدائد بلا دقت ہمارے متخیلہ میں آجاتے ہیں۔ لیکن سارے ملک میں مطعون و انگشت نما ہونے اور اپنے محبوب ترین اعزہ و احباب کے چھوٹ جانے سے جو سوہان روح رہتا ہوگا اُس کا اندازہ دشوار ہے اور اس سے بھی دشوار تر اُس تکلیف جاں گزا کا احساس ہے جو ان مصلحوں کو گوشۂ خلوت میں یہ سوچ سوچ کر ہوتی ہوگی کہ اگر کہیں ان کی رائے حق پر نہ ہوئی بلکہ جیسا وہ بچپن سے سُنتے چلے آئے ہیں محض شیطان کی وسوسہ اندازی ہوئی اور اسی حالت تشکیک و ارتیاب میں ان کی وفات ہوگئی تو آخرت میں ان کے لئے کیسا عذاب الیم ہوگا! یہ تصور کس قدر ہولناک ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ ان غریبوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اور پھر یہ غریب تنہا رہتے تھے۔ کوئی ان کی منتظم جماعت نہ تھی جو تبادلۂ خیالات و ہمدردی سے اپنے غم کو بھلاتے۔ ان کے تو کلیجہ میں ناسور پڑ پڑ جاتے ہوں گے۔ علوم طبیعی یعنی سائنس اور فلسفۂ تاریخ ہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کے دامن میں انھیں پناہ مل سکتی تھی مگر اس وقت ان دونوں کا سرے سے وجود ہی نہ تھا آج یہ ایں تمدن و اشاعت علم جب بڑے سے بڑے فلسفی پر بارہا یہ کیفیت گزرتی ہے کہ بیماری یا اور کسی ناگہانی مصیبت کے وقت اُس کے ذہن میں بے اختیار وہ مزخرفات عقاید از سر نو عود کر آتے ہیں جنھیں اُس نے بچپن میں سنا تھا گو یا جنھیں دماغ و عقل مدت ہوئی مردود کر چکے ہیں مگر دل و جذبات سے وہ باوجود مدت العمر کی کوشش کے نہیں نکل سکے ہیں تو پھر اُس زمانہ کے روشن خیال مصلحوں کے تصور میں جنھیں آغوش مادر سے اس تعلیم کا خوگر کر دیا گیا تھا کہ تقلید اس الفضایل اور شک و ارتیاب کفر

مطلق ہی بعض وقت جس قوت و اشتداد کے ساتھ بچپن کے راسخ شدہ اعتقادات عود کر آتے ہوں اُس کا اندازہ کون کرسکتا ہی؟ درحقیقت ٹرو یا ڈورس کا منجملہ ان کے اور احسانات کے دنیا پر ایک یہ بھی بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے دوزخ کے خوابوں کے ساتھ مضحکہ کر کے جو راہبانہ اقتدار کے لئے ایک بڑے زبردست سہارے کا کام دے رہے تھے ان کی وقعت کو دلوں سے مٹا دیا اور لوگوں کو کم از کم اس قید دہشت سے خلاصی دی مجھے بہت شبہ ہی کہ کیتھولک دماغ بغیر مستشرقانہ لٹریچر اور علمائے اسلام کی اعانت کے کبھی بھی از خود مجوف و تاریک خیالی کا جوا اپنے کندھے سے ہٹا سکتا۔ شہری زندگی کی توسیع دنیوی دلچسپیوں اور کاروبار میں اضافہ، علم و مطالعہ کی تجدید، تجاربات صلیبی کے سبب پاپایانہ اقتدار کا ضعف یہ سب چیزیں مل کر کلیسا کی قوت کو توڑنے میں موثر ہوئیں۔ مگر ایک عقیدہ ایسا تھا جو اب بھی مقتدایان کلیسا کے ہاتھ میں جلب زر کا ایک اچھا آلہ بنا رہا اور جس سے ان کی جیبیں عرصہ تک بھرتی رہیں۔ میری مراد عقیدۂ عالم برزخ سے ہی۔

ہمارے زمانہ کے فلاسفہ اجل میں آگسٹ کومٹ قرون وسطیٰ کے بڑے حامی و ہمدرد ہوئے ہیں۔ وہ جہاں اس عہد کی اور بیسیوں خوبیاں شمار کراتے ہیں وہاں اس عقیدۂ برزخ کی مدح میں خصوصیت کے ساتھ رطب اللسان ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسے درمیانی طبقہ کا وجود مسلّم ہوگیا جو اخلاقی حیثیت سے خیر محض و شر محض کے بین بین تھا اور اس طرح تخویف مذہبی کے اشتداد میں خفت ہوگئی۔ لیکن میرے نزدیک عقیدۂ برزخ کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ جو لوگ کافر مرتے تھے اُن کے لئے تو برزخ کا وجود بیکار ہی تھا کہ ان کی جگہ صرف جہنم تھی۔ البتہ جو لوگ پورے صحیح العقیدہ مگر بداعمال ہوتے تھے۔ ان کا گزر برزخ میں اس غرض سے ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ کی برداشت صعوبات کے بعد یہ قید جھیل کر جب گناہوں کی آلائش سے پاک صاف ہوجائیں تب جنت میں داخل ہوں۔ لیکن اس سے اشتداد تخویف مذہبی میں ذرا بھی تخفیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ برزخ کے جو آلام و شدائد بیان کئے گئے ہیں وہ آلام

جہنم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ وہی آگ، وہی جلن، وہی عذاب دردناک۔ البتہ فرق اتنا تھا کہ عذاب جہنم سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اور وہ جگہ کفار کے لئے مخصوص تھی۔ البتہ برزخ میں مسیحی گنہگار مقید رہتے تھے اور انھیں قید سے نجات مل سکتی تھی، اس صورت سے کہ مُردہ کے ورثا، خیر و خیرات، یا نذر و نیاز کے نام سے کوئی رقم لاکر کلید برداران کلیسا کے حضور میں پیش کریں۔ یہ تھا ہمارے نزدیک اصل مدعا عقیدۂ برزخ کا! اخلاقی نقطۂ نظر سے جو چاہیئے کہئے۔ مگر اس ہوشیاری و دانشمندی کی داد تو بہرحال دیجئے کہ اس میں بھی کس حکمت سے اپنی تر دامنی کا راستہ نکال لیا۔ ایک نوجوان و شوہر پرست خاتون سے جس کے سر پر ابھی بیوگی کی مصیبت نازل ہوئی ہو۔ یہ جاکر کہنا کہ اُسے جو ذات دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی اس وقت برزخ کے شدائد عظمیٰ میں گرفتار ہے جن سے نجات صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اُس کے کفارہ معاصی کے لئے کوئی رقم نذر دے۔ تحصیل زر کا اس سے زیادہ موثر و کامیاب طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

فصل (۱۴)

مغربی یورپ کی اخلاقی حالت

رومی شہنشاہی کے فنا ہونے سے لے کر شارلمین کے وقت تک بازنطینی یا مشرقی حکومت میں جو عہد بہ عہد مذہبی تغیرات ہوتے رہے اُن کا ذکر گزشتہ فصلوں میں ہو چکا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانہ میں مغربی یورپ کی اخلاقی حالت کیا رہی؟ لیکن اس سوال کے صحیح جواب حاصل کرنے میں متعدد دشواریاں ہیں جن میں سب سے بڑی دقت تاریخی مواد کا فقدان ہے۔ سنہ ۴۷۶ء سے ایک صدی بعد تک کی تاریخ گویا مطلق ہی موجود نہیں جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکتا ہے وہ خانقاہوں کے تذکروں اور شہداء کی سوانح عمریوں میں ضمنی اشارات سے پتہ چلتا ہے

البتہ ۶۴۲ء سے اُدھر ڈھائی صدیوں قبل کی تاریخ گری گوری آف ٹورس اور فریڈیگیریس کے صفحات میں یہ پوری صراحت کے ساتھ محفوظ ہے۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اٹلی کی سرزمین میں شہنشاہی کے حالات وخصائص پھر ایک حد تک عود کر آئے تھے۔ لیکن گال کے علاقہ میں کلیسا کی اشاعت بربریوں کے درمیان ہو رہی تھی جنھیں علم و تمدن سے کوئی مس نہ تھا۔ معاشری زندگی میں ایک عجیب بدنظمی و طوایف الملوکی بھی جاری تھی۔ ظلم و جبر، مکر و فریب آوارگی داو باشی کی وہ گرم بازاری تھی کہ آدمی ان کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ ملکہ فریڈیگونڈ و ملکہ برونہاٹ کا نمبر اپنی خون آشامیوں اور ہوسناکیوں کے لحاظ سے ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا اور خیر یہ دونوں تو ملکہ تھیں۔ ہر طبقہ نے فسق و فجور و سیہ کاری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ ایک پادری صاحب کا ذکر ہے کہ وہ اکثر اس قدر مخمور ہو جاتے تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک دوسرے پادری کاٹینس کی بابت روایت ہے کہ وہ شراب پی کر اس قدر بدمست ہو جاتا تھا کہ چار آدمی اُسے پکڑ کر میز پر سے اُٹھا لے جاتے تھے۔ اسی پادری نے ایک بار اپنے کسی ماتحت کی جائداد پر دست برد کرنا چاہی اور جب اُس کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو اسے زندہ دفن کرا دیا۔ مگر وہ اتفاق سے زندہ بچ آیا۔ اور جب اُس نے اس جرم کو طشت از بام کیا تو پادری کو صرف تنبیہ کر دینا کافی خیال کیا گیا۔ بڑے سے بڑے ظالم و سیہ کار تاجداروں کے مصاحبین و خوائین خاص یہی پادری ہوتے تھے۔ ملکہ فریڈی گونڈ کے خاص راز دار یہی پادری تھے جن کے ذریعہ سے وہ ہر طرح کی سفاکیوں کا ارتکاب کرتی تھی۔ خود مشہور پاپائے اعظم سینٹ گری گوری ہر وقت ملکہ برونہاٹ کی خوشامدیں لگے رہتے تھے۔ شاہ گونڈی بالڈ نے جب اپنے تینوں بھائیوں کو قتل کر ڈالا تو پادری سینٹ آونیس نے اس پر ملامت کرنا کیسا نہایت تحسین کی کہ اپنے حریفوں کا خطرہ مٹا کر اس نے اپنی رعایا کی آسایش کی جڑ مضبوط کر دی۔ پادریوں کا عہدہ اکثر انھیں لوگوں کو ملتا تھا جو حرص و ہوا و عیش پرستی میں خاص شہرت رکھتے

ہوتے تھے اور مذہبی مجالس عموماً مینوشی کے مناظر ہوتے تھے۔ یہ لوگ ایک عرصہ سے مُسلح رہنے لگے تھے بلکہ سینٹ گری گوری چھٹی صدی کے دو پادریوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے اپنے بہت سے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا تھا۔ غرض اس زمانہ کی تاریخ کے جس کسی صفحہ کو ہم کھولتے ہیں ہر جگہ ظلم و شقاوت، سفاکی و توحش، بدچلنی و شہوت پرستی کے مناظر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مخالفوں کے ہاتھ پیر یا ناک کان کاٹ ڈالنا ایک معمولی بات تھی اور ہر بادشاہ کے لئے اپنے اعزہ کو قتل کرنا تو گویا لازمی تھا۔ ایک بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے، اپنی بہو، اور اپنی پوتیوں کو اپنے سامنے زندہ جلوا دیا۔ ایک ملکہ نے اپنی بیٹی کو دریا میں غرق کر دیا اس ڈر سے کہ کہیں اُس کے سوتیلے باپ کی طبیعت نہ اس پر آجائے۔ ایک اُسقف صاحب ایک مرتبہ کسی معمولی آدمی کے گھر میں گھس آئے اور اس کو اس کے مکان سے باہر نکال دیا تاکہ اُس کی حسین بیوی کے ساتھ زنا کرسکیں وہ اس میں مشغول تھے کہ شوہر واپس آیا اور عین حالت اختلاط میں زانی و زانیہ دونوں کو قتل کر ڈالا۔ ایک شہزادہ صاحب کا یہ مشغلہ تفریح تھا کہ اپنے غلاموں کو آگ سے جلواتے رہتے تھے اور دو غلاموں کو اس جرم میں زندہ دفن کر دیا کہ انھوں نے بغیر اجازت اپنی شادیاں کرلی تھیں۔ اس طرح کے واقعات اس زمانہ کی تاریخ کے ہر صفحہ میں نظر آتے ہیں ملکہ برونہاٹ جب اپنے طویل عہد حکومت کے بعد اپنے حریف کلوٹیر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئی تو اُسے یہ سزا ملی کہ متواتر تین دن تک انواع و اقسام کے شدائد و آلام میں مبتلا کر کے اونٹ کے اوپر بٹھا کر سارے شہر میں پھرائی گئی اور اس کے بعد ایک شریر گھوڑے کے دُم میں باندھ کر اُسے تیز دوڑا دیا گیا جس سے ضعیف العمر ملکہ کی لاش کے پرخچے اُڑ گئے۔

ایک طرف تو بداخلاقیوں کے اس مرقع کو پیش نظر رکھو اور دوسری طرف اس حقیقت کو ملحوظ رکھو کہ یہ زمانہ خالص دینداری کا تھا۔ لٹریچر تمام تر مذہبی رنگ میں رنگا ہوتا تھا الحاد و بیدینی کا نام و نشان بھی نہیں رہا تھا۔ راہبوں اور پادریوں کو ہر طرح کا جاہ و ثروت

واقتدار حاصل تھا۔ متعدد سلاطین نے ترک تاجداری کر کے فقیری اختیار کر لی تھی اور ساتویں اور آٹھویں صدی میں نہایت کثرت سے بزرگان دین پیدا ہوتے رہے۔

پھر اس زمانہ کے مؤرخین جس خاص طور پر اندراج واقعات کرتے ہیں وہ بھی ہم لوگوں کے لئے عجیب وغریب ہے۔ گری گوری آف ٹورس جس کی تاریخ ہمارا اصل ماخذ ہے۔ بہت مشہور اور بڑا محتاط ومتقی پادری تھا۔ جو ہر واقعہ کو مذہبیت کی عینک سے دیکھتا ہی تاہم جب اپنے مخالف عقیدہ والوں کا ذکر کرنے لگتا ہے۔ تو اس کا حس اخلاق حیرت انگیز طور پر مُردہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً کلودس ایک مشرک رئیس تھا جو مسیحی ہو گیا۔ اصطباغ کے بعد ہی اسے یہ دیکھکر تاسف ہوا کہ گال کے ایک بڑے علاقہ کا تاجدار ایک بدعقیدہ شخص ہے۔ چنانچہ اس نے اس کے ملک پر حملہ کا قصد کیا اور اس حملہ کے دوران میں معجزات اس کی تائید کرتے گئے۔ مسیحی ہوکر سب سے پہلے جنگ آزمائی کی ابتدا اسی نے کی۔ بالآخر فتح اسی کو نصیب ہوئی اور اب اس کی نظریں اور بلند ہوئیں۔ اس جنگ میں اس کو بڑی مدد اپنے ایک عزیز سگبرٹ سے ملی تھی جو ایک اور صوبہ کا فرماں روا تھا۔ کلودس نے اس کے لڑکے کو ترغیب دی کہ اپنے باپ کو قتل کر ڈالے۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کیا گیا۔ اب یہ پدر کُش فرزند تخت نشین ہوا۔ اور کلودس نے اس کے پاس اظہار محبت واخوت کے لئے اپنے سفیر بھیجے لیکن درپردہ انھیں یہ حکم دیا کہ اسے قتل کر ڈالنا اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی اور ملک بے والی ووارث رہ گیا اب کلودس وہاں پہنچا اور ایک تقریر میں رعایا کے سامنے بکمال حکمت عملی ان کی طوائف الملوکی وخانہ جنگیوں پر اظہار تاسف وقلق کر کے یہ کہا کہ "میں خود تمہاری حفاظت کے لئے تیار رہوں"۔ لوگوں نے اس تجویز کا خوشی سے خیر مقدم کیا اور یوں بے لڑے بھڑے کلودس ایک اور تخت پر قابض ہو گیا۔ اب طمع اور بڑھی۔ یہاں تک کہ پورے ملک گال پر قابض ہو کر اور وہاں کے جائز حکمرانوں کو جو زیادہ تر اس کے عزیز ہوتے تھے قتل ومعزول کر کے اُس نے بجز

اپنے بیوی بچوں کے اور تمام اعزہ کو خفیہ طور پر قتل کرا ڈالا تاکہ کوئی دعویدار سلطنت باقی نہ رہے
اس کے بعد اپنے ارکان دربار کے سامنے اس نے اپنی تنہائی پر زار و قطار رونا شروع کیا
کہ دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار باقی نہیں رہا۔ یہ تقریر بھی مکر سے خالی نہ تھی کہ اس کا اصل منشا
یہ پتہ لگانا تھا کہ اب بھی کوئی ممکن رقیب باقی ہے یا نہیں۔ چند سال کے بعد اس نے
وفات پائی اور اس سیرت و طبیعت کا تاجدار بجمال اعزاز و احتشام اپنے تعمیر کرائے
ہوئے قبرستان میں دفن ہوا۔ اور سینٹ گری گوری جوان واقعات کے راوی ہیں انھیں بے
تکلف لکھتے ہیں اور ناپسند کرنا کیسا اس پر فخر و مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کفار اہل ضلالت
کو شکست ہوئی اور نصرت غیبی سے دین حق کا ہر جگہ بول بالا رہا۔ اُسی طرح کہ جیسے اس سے
قبل ابراہیم، یعقوب، موسیٰ، ہارون و داؤد کا رہا تھا۔ خاتمہ کے یہ فقرے سننے کے قابل ہیں:

"ایریس جس نے بدعت و ضلالت کی بنا ڈالی، لقمۂ اجل ہوتے ہی واصل جہنم ہوا۔ لیکن حامیِ
دین حق پلیسری کو اگرچہ حمایت تثلیث میں جلاوطن ہونا پڑا۔ لیکن وفات کے بعد اُسو جنت میں
گھر ملا۔ شاہ کلووس تثلیث پر دل سے ایمان رکھتا تھا۔ اسی قوت ایمانی کے اعانت سے
اُس نے کفار پر فتح پائی اور تمام ملک گال پر قبضہ حاصل کیا۔ الارک کو حق سے ارتداد کا
کا یہ ثمرہ ملا کہ سارا ملک چھن گیا اور آخرت میں عذاب الیم نصیب ہوا۔"

یہ ایک نمونہ ہے اُس زمانہ کے بہترین مؤرخ کے طرز خیال و تاریخ نگاری کا جس کے صدہا
نظایر اور پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن دنیا میں کوئی شے شر مطلق نہیں ہوتی۔ ہر شر میں
خیر کے پہلو ضرور شامل رہتے ہیں۔ اس بنا پر باوجود اس کے کہ اُس وقت کا اخلاقی مطلع
نہایت غبار آلود تھا۔ تاہم فضائل اخلاق کی جگمگاہٹ سرے سے فنا نہیں ہو گئی تھی
یہ ضرور ہے کہ اُس وقت کے حکما و علما بجائے اخلاق کے اصولی و اساسی مباحث کے اپنی
ساری قوت فقہ کے کسی جزئی مسئلہ کی تحقیق میں صرف کرتے رہتے تھے اور لوگ فرائض
ملکی و خانگی سے غافل ہو ہو کر راہبانہ ریاضتوں میں تضیع وقت کرتے تھے۔ تاہم اس سے

انکار نہیں ہو سکتا کہ پھر بھی مذہب کے اثر سے بہت سے فوائد مترتب ہو رہے تھے۔ ایک یہی فائدہ کیا کم تھا کہ ہزار ہا آدمیوں کو جو دشمنوں کے ستائے ہوتے تھے۔ خانقاہوں میں ایک امن و سکون کی جگہ مل جاتی تھی اور جنگ و جدل کی ہنگامہ آرائیوں میں کم از کم کچھ لوگ تو یکسوئی و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ یا پھر دنیا پرستی کے غوغائے عام میں جب وہ کسی مشہور بزرگ کی زیارت کے مشتاق ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو قناعت و استغنا کی ایک صورت تو انھیں بہر حال نظر آتی تھی۔ اس وقت دنیا کی بہبود و فلاح اسی میں تھی کہ کلیسا کی عمارات و جائدادیں احترام و شرف کے پردہ میں ہمیشہ محفوظ رہیں چنانچہ ان سے بے ادبی کرنے والوں کی غیبی سزاؤں کے جو افسانہ مشہور تھے۔ وہ کوئی خالی از مصلحت نہ تھے۔ اسی طرح مذہبی جشن اور تہواروں کے جو دن مقرر تھے۔ ان کا ہونا بھی بہت اچھا تھا کہ ان دنوں اسی بہانہ سے غلاموں اور خادموں کو چھٹی مل جاتی تھی۔ اتوار کے روز تعطیل منانے کا دستور اگرچہ شروع سے چلا آتا تھا۔ لیکن اب اس پر اور زیادہ زور دیدیا گیا کہ یہ روز صرف عبادات کے لئے مخصوص ہے قسطنطین نے یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ اتوار کو بجز زراعت کے اور کسی قسم کا کام غلاموں اور خادموں سے نہ لینا چاہیئے۔ تھیوڈوسیس نے ملاعب عامہ کی بھی ممانعت کر دی تھی۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا نے اسے اور زیادہ اہمیت دیدی اور بیسیوں افسانہ اس مضمون کے شائع ہو گئے کہ جن لوگوں نے یکشنبہ کا روز دنیوی مشاغل میں صرف کیا اُن پر عجیب عجیب مصیبتیں اور بلائیں نازل ہوئیں خیر و خیرات کا رواج حد سے زیادہ تھا۔ بلکہ بعض فرماں رواؤں کے سوانح زندگی تو بجز اس کے اور کچھ معلوم ہی نہیں کہ انھوں نے فلاں فلاں فیاضیاں کی ہیں۔ خود پادریوں کی جماعت میں اگرچہ بڑی تعداد اوباشوں کی ہوتی تھی۔ تاہم اسی زمرہ میں بعض بعض حقیقی متقی بھی گزرے ہیں۔ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا یہ ان کا خاص شیوہ تھا۔ چھٹی صدی میں پیرس کا ایک پادری سینٹ جرمینس اس باب میں خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتا تھا چنانچہ

جب اُس کا انتقال ہوگیا تو بہت سے امیروں نے اُس وقت اُس کی نعش سے دعا کی کہ ہمیں بھی رہا کر دیئے۔" اس پر نعش اس قدر بھاری ہو گئی کہ کسی طرح اُٹھائے نہیں اُٹھتی تھی آخر کار جب اُن قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ تب کہیں جنازہ اُٹھ سکا۔ اس طرح کے افسانہ گو ایک طرف طفلانہ و مضحک ہیں تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ مذہبی سادگی کے لحاظ سے بیحد موثر بھی ہیں۔

مگر اس دَور کا سب سے زیادہ زریں کارنامہ مشنریوں کی سعی تبلیغ و دعوت ہے پہلے مشنریوں کا سیلاب فلسطین و اٹلی سے رواں ہوا تھا مگر اب اس کا دھارا مغرب سے چل رہا تھا۔ اس میں حق تقدم آئرلینڈ کے مشنریوں کو حاصل ہے۔ جنھوں نے پہلے اپنے وطن پھر انگلستان اور پھر وہاں سے باہر نکل کر گال، سوئزرلینڈ، اٹلی و برمن کے دَور دراز اقطاع تک اپنی سرگرمی دکھانی شروع کی۔ اس تحریک کا چھٹی صدی کی ابتدا میں آغاز ہوا تھا اور ایک صدی بعد دوسرے ممالک کے لوگوں نے اس کی تقلید شروع کر دی، بالخصوص اہل انگلستان و گال نے۔ چنانچہ مشہور پُرجوش اینگلوسیکسن مشنری سینٹ بونیفیس کا دائرہ دعوت و تبلیغ جرمنی تک پہنچ گیا۔ یہ سرگرمی تین صدیوں بعد تک پورے جوش و خروش سے قایم رہی اور اس تحریک کے سہارے پر باوجود ہر طرح کے علمی سیاسی و اخلاقی انحطاط کے لومبرڈی سے لے کر سویڈن تک جو تخم ریزی ہوتی رہی، اُسی نے آگے چل کر تمدن کے برگ و بار پیدا کئے۔

الغرض اگرچہ بحیثیت مجموعی، قرون وسطیٰ یعنی زوال شہنشاہی رومہ سے لے کر شارلمین تک کا زمانہ انتہائی جہالت و ظلمت کا دَور رہا ہے۔ تاہم اسی کے پہلو بہ پہلو جدید تمدن کے قصر و ایوان کی داغ بیل بھی پڑ رہی تھی۔ اس تحریک کے اخلاقی نقطۂ خیال سے دو عنصر تھے۔ ایک مسیحیت میں عسکریت کی روح کا پیدا ہو جانا۔ دوسرے دنیوی مناصب میں تقدس و احترام کی آمیزش آیندہ دو فصلوں میں ہم انھیں دونوں چیزوں کو کسی قدر کھول کر بیان کرتے ہیں۔

فصل (۱۵)

کلیسا میں عسکریت کا آغاز اور نشوونما

یونانیوں کا قول تھا کہ دیوتاؤں کو اپنی نذرونیاز کے لئے جس قدر مال غنیمت پسند ہے اتنی اور کوئی شے مرغوب نہیں۔ شروع شروع مسیحیت کا اصول و دستور العمل اس کے بالکل مخالف بلکہ متضاد تھا۔ چنانچہ ابتداءمیں مسیحیت کا یہ قانون تھا (جیسا کہ پیشتر گزر چکا ہے) کہ کسی مسیحی کو مسلح نہ رہنا چاہیئے اور سپاہی جنگ سے معاودت کے بعد حصول تبرکات میں کبھی شرکت نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ ایک مدت تک توبہ و استغفار نہ کر چکیں۔ مفتیان شرع کی ایک زبردست جماعت نے جس کے ارکان کلیمنٹ آف الگزنڈریا، ٹرٹولین اُریجن، لیکٹینٹیس، و بیسل ہوئے ہیں یہ حکم لگا دیا تھا کہ مسیحی کے لئے ہر قسم کی جنگ میں شرکت ناجائز ہے۔ چنانچہ اسی فتوے پر عمل کر کے میکز یمیلینیس نے ڈیوکلیٹین کے زمانہ میں بحیثیت سپاہی کے شرکت جنگ سے انکار کر دیا اور بالآخر اسی جرم میں اسے مرتبۂ شہادت نصیب ہوا۔ بلکہ بعضوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ یہی مسئلہ ایک بڑا سبب تھا ڈیوکلیٹین کی تعدیوں کا۔ بُت پرستوں کی طرف سے مسیحیت پر یہ ایک الزام تھا (جسے مسیحی متکلمین صاف تسلیم کرتے تھے اور علانیہ اس کا اعتراف کرتے تھے) کہ مسیحیت سپاہیانہ زندگی کے بالکل منافی ہے۔ گو اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مسیحیوں کی دُعا، سپاہیوں کے آلات حرب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ تھا لیکن بااینہمہ شروع ہی سے کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو باوجود مسیحی ہونے کے فوج میں بھرتی ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ ڈیوکلیٹین کی تعدیوں کا اصل ہدف مسیحی سپاہی ہی بنے تھے اور قسطنطین کے زمانہ میں تو سپاہ کا بڑا حصہ مسیحیوں پر مشتمل ہو گیا تھا۔ اسی

عہد میں ایک انجمن کلیسا نے یہ فتویٰ شائع کیا کہ جو مسیحی سپاہی شرکت جنگ سے انکار کرتے ہیں وہ نمک حرامی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور سینٹ آگسٹاین جیسے ذی اثر شخص نے اس کی تائید کی۔ مگر باوجود اس کے کہ فوج میں داخلہ اب حرام نہیں رہا تھا تاہم مذہبی حلقوں میں اسے پسندیدگی سے اب بھی نہیں دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ مسیحی و مشرکانہ تخیل اخلاق ہی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مشرکوں کا مطمح نظر وطن تھا اور ان کے نزدیک وطن پرستی و سپہگری زبدۃ الفضائل تھے۔ بخلاف اس کے مسیحی نصب العین، ثواب آخرت تھا اور اس نقطۂ خیال سے ترک دنیا اور رہبانیت کو اس الحسنات کا مرتبہ حاصل تھا۔ چنانچہ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں جوانان صالح کی تعداد کثیر برابر فوج سے منتقل ہو ہو کر زاہدوں و راہبوں کی صف میں شامل ہوتی جاتی تھی۔

پہلی شے جو مذہب و عسکریت کے درمیان مصالحت کا باعث ہوئی وہ یہ عقیدہ تھا کہ ہر دنیوی معاملہ براہ راست کسی مداخلت غیبی کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی تمام قومی مصیبتیں کفر یا فسق و فجور کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کے مقابلہ میں جاہ و ثروت امارت و حکومت غرض ہر دنیوی خوشحالی خوش اعتقادی و نیک عملی کا انعام ہوتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر جنگ میں فتح و کامیابی بھی انھیں لوگوں کے حصہ میں آسکتی تھی جو با ایمان و خوش اعمال ہوں۔ چنانچہ ہزار ہا اشخاص نے اسی لالچ میں اصطباغ لے لیا۔ خود قسطنطین کے لئے تو قطعاً اور کلوویس کے لئے غالباً یہی محرک قبول مسیحیت کا تھا اور بربریوں پر تو یہ محرک جس بڑی حد تک موثر ہوتا تھا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ پھر جب کچھ روز میں قسطنطین کو خواب میں فتح کی بشارت ملنے لگی جب صلیب فوج کے علم پر آویزاں کی جانے لگی اور صلیب کی کیلیں اکھاڑ اکھاڑ کر تبرک کی طور پر زرہ و خود میں لگائی جانے لگیں تو مذہب و عسکریت کا اتحاد ایک بالکل غیر مخفی حقیقت بن گیا۔

اس تحریک عسکریت کی رفتار کو بعض خارجی واقعات نے اور تیز کر دیا مثلاً ایک

بڑا سبب یہ ہوا کہ شمال کے جنگجو قبایل تعداد کثیر میں مسیحیت قبول کرنے لگے۔ تبدیل مذہب سے ان کی سرشت کیونکر بدل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی جنگجوئی کو اس نئے مذہب میں بھی داخل کر دیا۔ ایک طرف یہ ہوا اور دوسری طرف بہت سے راہبوں اور پادریوں نے زمانہ کی نزاکت کو دیکھکر مجبوراً فوج کشی میں اپنے متبعین کی قیادت و سرداری شروع کر دی۔ مگر ان سب اسباب سے بڑھ چڑھ کر جو سبب مسیحیوں میں عسکریت کی رُوح پھونکنے کا ہوا وہ اسلام کی تقلید تھی کہ اسی نے درحقیقت مسیحیوں کی سی نرم و آشتی سرشت جماعت کو محاربات صلیبی کا پُرجوش مجاہد بنا دیا۔

اس عظیم الشان مذہب نے جو اتنے عرصہ تک مسیحیت کا مدّمقابل رہا ایک زمانہ میں دنیائے مسیحیت کے دلوں پر اپنی شدید ترین ہیبت بالکل بجا طور پر بٹھا دی تھی۔ اس نے بغیر اصنام و تماثیل کی مدد کے اور بغیر عبد و معبود کے درمیان اشخاص متوسط کا سلسلہ قایم کیے جاہلوں اور بربریوں کے سامنے خالص ترین توحید اور بحیثیت مجموعی اعلیٰ ترین نظام اخلاق کی تعلیم پیش کی اور اپنے متبعین کے قلوب میں وہ جوش خلوص و انہماک پیدا کر دیا جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ اس نے اس حقیقت اہم سے واقف ہو کر کہ نجات کو محض ایمان پر منحصر کر دینا نفس بشری پر خصوصیت کے ساتھ موثر ہوتا ہے اس عقیدہ کو مسیحیت سے اخذ کیا اور جنّت کے جسمانی لذاید و نعایم اور جہنّم کے مادّی آلام و شداید اس جزئی تفصیل سے بیان کیے کہ ناتربیت نفوس کا متخیلہ ان سے بالکل مسحور ہو کر رہ گیا۔ اس مذہب نے جو صحیفہ ربّانی پیش کیا وہ گو انجیل کے مقابلہ میں کتنے ہی کمتر درجہ کا ہو تاہم صدیوں تک لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے اس سے تسکین و تسلّی حاصل کی ہے۔ اس کی ایک خالص تعلیم مسلہ تقدیر ہے۔ جس نے گو آج پیروان اسلام کے قوائے عمل کو شل کر رکھا ہے۔ تاہم اوّل اوّل اس کا یہ اثر نہ تھا۔ بلکہ قرون اولیٰ میں اسی عقیدہ نے مسلمانوں کو جرأت و شجاعت کا مجسّمہ بنا دیا تھا۔ اور خیر یہ چیزیں تو تھیں ہی

سب سے بڑھ چڑھ کر اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جہاد (یعنی مقاتلہ کفار) کو راس الفضائل
کے درجہ پر رکھدیا۔ اسے اولین فریضۂ مذہبی قرار دیا اور مجاہد کو قطعاً جنتی ہونے کی
دستاویز دیدی۔ یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں برگزیدگی و سپہگری کے ڈانڈے
مل گئے اور پیروان محمد میں وہ عدیم النظیر جوش پیدا ہو گیا کہ اپنے نبی کی وفات کی ایک
صدی کے اندر ہی انھوں نے مشرقی حکومتوں کو مسخر کر لیا مسیحیت کو اس کے وطن
اصلی سے تقریباً خارج البلد کر دیا۔ ان کا پرچم ایشیا و افریقہ سے لے کر اسپین
تک لہرانے لگا۔ بلکہ اگر چارلس مارٹل نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو قریب تھا کہ وسطی یورپ
کی حکومتیں بھی اُن کے زیر نگیں آجائیں۔ یہاں اس امر پر قیاس دوڑانا تحصیل حاصل
ہی کہ یہ ٹیوٹن نسل کی قومیں جن کے اوپر موجودہ تمدن کی ترقی کا اس قدر دارومدار رہا
ہی۔ اگر اسلام کے زیر نگیں آ گئی ہوتیں تو آج تمدنی زندگی میں کیا کیا انقلابات
ہو گئے ہوتے۔ ہم صرف واقعات کو دیکھتے ہیں اور واقعۃً اسلامی فتوحات کے
اثر سے عملاً ابنائے مسیحیت میں ایک انقلاب تو ہو ہی گیا اور وہ یہ ہوا کہ اسلام کی
جنگی و عسکری روح رفتہ رفتہ مسیحیت میں سرایت کر گئی۔ یہ معلوم ہے کہ بہت سی مسیحی الدین
قومیں بالطبع جنگجو و محاربہ پسند تھیں اب جبکہ انھوں نے اپنی حریف جماعت کی جنگجوئی
کے مناظر دیکھے تو اس مثال سے غیر متاثر نہ رہ سکے۔ کچھ یہ اور کچھ اس جوش انتقام سے
کہ جس نے ہم کو بے خانماں اور ہمارے دین کو بے حرمت کیا ہی ہم بھی اُسے بےخانماں
اور اُس کے دین کو بے حرمت کریں گے۔ ہزارہا پادریوں نے کلیسا کی بلندیوں سے
وعظ کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں سے لڑنا فرض عین ہے اور جنت کا راستہ میدانِ
جنگ میں ہو کر ہے۔ یہ وعظ دو صدیوں تک قایم رہا اور اس کا یہ اثر ہوا کہ مسیحیوں میں
بھی مسلمانوں کے مساوی جنگی جوشش پیدا ہو گیا۔ اور اب جب شام کے وقت ایک
مسیحی صلیب کے سامنے عبادت کے لئے سر جھکاتا تھا تو جانتے ہو کہ وہ صلیب کیا ہوتی

تھی؛ وہ صلیب تلوار کا قبضہ ہوتی تھی۔

مسیحیت کے اس دَورِ عسکریت کا اُس کے اُس ابتدائی دَور سے مقابلہ کرو جب امن و آشتی، صلح و سکون سے اُس کا خمیر سمجھا جاتا تھا تو انسں کی اس انقلاب حالت پر تاسف ہوتا ہے۔ کہاں ایک وہ زمانہ تھا جب مسیحیت سے غایت فقدان عسکریت کی بنا پر جنگجو مشرک اقوام اپنے مُردوں کو بجائے لِٹانے کے ہمیشہ کھڑا کھڑا دفن کرتی تھیں تاکہ مسیحیوں سے التباس نہ ہونے پائے اور کہاں اب یہ وقت آگیا کہ جنگ وجدل کشت و خون جزوِ مسیحیت بن گئے۔

مسیحیت کا اثر جنگ پر کیا پڑا؟ یہ ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ مگر مختصراً ہم اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ

(۱) مسیحیت کے اثر سے مسیحیان قرونِ اولیٰ کی پیشین گوئیوں کے علی الرغم جنگ کا انسداد یا وقوعاتِ جنگ میں تخفیف بالکل نہ ہو سکی۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قسطنطین کے بعد سے کوئی زمانہ ایسا نہیں ملتا ہے جس میں مقتدایانِ کلیسا نے جنگ کے انسداد کی کوشش کی ہو۔ بلکہ بخلاف اس کے وہ اپنے متبعین کو ہمیشہ محاربات صلیبی پر اُکساتے ہی رہے۔ لے دیکے انھوں نے اُن خانگی لڑائیوں کو جنھیں انگریزی میں "ڈویل" کہتے ہیں بند کرنا چاہا۔ لیکن یہ بھی اُن کا کوئی خاص احسان نہیں یہ طریقہ مشرکین کے زمانہ میں سرے سے مفقود تھا پادریوں کے سامنے جاری ہوا اور وہ اسے نہ روک سکے، اب اس کا انسداد ترقی تمدن سے خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی حیثیت سے تو آئمہ مسیحیت نے انسدادِ جنگ میں حصّہ لیا نہیں بلکہ یہ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بجز اسلام کے اور کسی مذہب کے

نام سے دنیا میں اتنا کشت و خون نہیں ہوا جتنا مسیحیت سے ہوا۔ امن و آشتی کی تعلیمات قدیم تقویم پارینہ ہوگئیں تھیں اور صدیوں تک قتل و خونریزی کے وعظ ہوتے رہے۔ اب آخری زمانہ میں البتہ صلح و آشتی کی تحریک کی پھر تجدید ہو رہی ہے مگر اس تحریک کے بانی محض دنیادار لوگ ہیں جنھیں مسیحیت سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۲) مگر مسیحیت کے اثر سے جنگ کی وحشت و بربریت میں ضرورت حیرت انگیز کمی ہوگئی۔ اگلے زمانہ میں جنگ مرادف تھی ہر قسم کی اخلاق شکنی و قانون شکنی کے مگر مسیحیت نے اسے بالکل بدل دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں قدماء کے ہاں بھی اسیران جنگ و مفتوحوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایات ملتی ہیں۔ مثلاً فلاطون نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ یونانی اسیران جنگ کو ایک رقم متعین بہ طور فدیہ لینے کے بعد چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر اس پر عمل ایک آدھ بار سے زائد نہیں ہوا۔ یا مثلاً رومہ میں سسرو، و سالسٹ نے یہ کہا تھا کہ جنگ کا مقصد ہمیشہ قیام امن ہونا چاہیئے اور اس کے سوا فوج کشی ہر حالت میں ناجائز ہے۔ بلکہ پلینی محض اس بنا پر سیزر کے ساتھ "اعظم" کا لقب نہیں استعمال کرتا تھا کہ اُس نے اس قدر خونریزی کی تھی، اور مارکس آریلیس تو فاتحین اور رہزنوں کو ایک درجہ میں رکھتا تھا ہمیں سپاہیوں کے ہاتھوں عورتوں کی آبروریزی بھی ایک سخت جرم سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ مثالیں شاذ و نادر ملتی ہیں۔ ورنہ دنیا کی عام حالت اُس وقت یہ تھی کہ فاتحین کے اوپر کوئی ذمہ داریاں و فرایض عاید نہ تھے وہ ایک غیر مسؤلانہ اقتدار کے ساتھ جو چاہتے مفتوحوں کے ساتھ سلوک کرتے اور یہ سلوک کیا ہوتا تھا؟ قتل غلامی یا سسیا فی[۵]

[۱] ضمیریت پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ وہاں ایک استشہاد اس واقعہ سے

مسیحیت نے آکر یہ ورق الٹ دیا۔ اُس نے مفتوحوں کے حقوق قایم کیے۔ اس باب خاص میں مسیحیت کے کارناموں کو ہم عنوانات ذیل کے تحت میں رکھ سکتے ہیں:

(الف) اس نے سپاہی کا بالکل سدّ باب کر دیا۔ اور یوں ہزار ہا جانیں بچالیں۔

(ب) کچھ روز کے بعد رفتہ رفتہ اس نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ مسیحی اسیران جنگ تو کسی حالت میں بھی غلام نہیں رہ سکتے ہیں اور غیر مسیحی اسیران جنگ فدیہ دے کر رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔

(ج) قدما کے ہاں سپاہیانہ زندگی کا جو تخیل تھا وہ بالکل درشتی اور کھرے پن کا تھا مسیحیت نے اس تخیل میں نرمی لینت وخلق وآدمیت کی آمیزش کر دی۔ اور مسیحی سپاہی کے لئے یہ وصف امتیازی قرار پا گیا کہ وہ نہ صرف شجاع و دلیر ہوتا ہے بلکہ کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم کرتا ہے۔ اور مفتوحوں سے بہ حسن سلوک پیش آتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) یہی کیا جاتا ہے کہ اگر حسن اخلاق فطری ہوتا تو مختلف قوموں میں اسیران جنگ کے ساتھ مختلف برتاؤ نہ ہوتے۔ لیکن ہم اس قسم کے تمام اعتراضات کی جڑ پہلی جلد کی فصل اوّل میں کاٹ چکے ہیں۔ جہاں ہم نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ انسان ہر نفس ضمیر تو فطرةً اور خود غرضی ونفع اندوزی کے حس سے متمایز وممتاز موجود ہوتا ہے۔ لیکن یہ مادّہ فطرةً ودیعت نہیں ہوتا کہ اس کا رُخ کس سمت کو رکھنا چاہیئے۔ اس کا تعین تمام تر گرد وپیش کے حالات اور ماحول کے اثرات پر ہے۔ چنانچہ عالم توحّش وبربریت میں انسان یہ سمجھتا کہ اُس پر صرف اُس کے خاندان وقبیلہ کے حقوق ہیں اور بس۔ اسی بنا پر وہ غیر قبیلے کے لوگوں کے قتل کو اُسی قدر غیر معیوب وبے ضرر سمجھتا ہے جتنا جانوروں کے شکار کو البتہ جب تمدن و روشن خیالی کے اقتضا سے اُس کے خیالات میں وسعت آتی ہے تب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ نوع انسان کے بھی کچھ حقوق اس کے اوپر ہیں۔

فصل (۱۶)

دنیوی مراتب کا مذہبی احترام

عسکریت کے علاوہ دوسرا نیا عنصر جو مسیحیت میں یہ بڑھا کہ دنیوی مراتب کا مذہبی اکرام و احترام ہونے لگا۔ یہی وہ شے ہے جس نے آگے چلکر کبھی رعایا سے امراء کی غلامی کرائی اور کبھی بادشاہ کو ظل اللہ کا لقب دلوایا۔ گزشتہ صفحات سے معلوم ہی ہو چکا ہے کہ رومی شہنشاہی کی طبعی رفتار شہنشاہی اقتدار کی جانب تھی، آگسٹس کے عہد استبداد کی جگہ ڈیوکلیشن کے استبداد مطلق نے لے لی تھی سینٹ کی حیثیت مجلس ملازمان سرکار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی اور ریپبلک کے ساتھ ساتھ رومی حریت کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا۔ یہ انقلاب حالات کیوں ہوا؟ یہ کوئی ایسا غامض مسئلہ نہیں۔ یہ فطرت بشری کا اقتضائے طبعی ہے کہ استبداد جہاں ناتربیت یافتہ و پست دماغ قوموں کے حق میں بہترین نظام حکومت ہے، وہاں متمدن و تعلیم یافتہ جماعات کی زندگی کے لیے یہ ایک مرض ہے، اور مرض بھی کیسا؟ سخت اور متعدی۔ جب متمدن و مہذب جماعتیں ایک مرتبہ سیاسی غلامی کے پھندے میں آجاتی ہیں، تو ان کی رگ رگ میں استعباد کی روح حلول کر جاتی ہے، بلند حوصلگی و خواہش حریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور انحطاط و اختلال لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ اقوام مثل افراد کے ذی حیات ہوتی ہیں۔ حرکت اُن کا لازمی خاصہ ہے۔ اگر یہ حرکت ترقی کی طرف نہ ہوگی تو لامحالہ تنزل کی طرف ہوگی۔

اس خاص انقلاب کی تشکیل میں مسیحیت کا کچھ ایسا اثر نہیں ابتدا میں اس کی سیدھی سادی تعلیم یہ تھی کہ امور دنیوی میں حاکم وقت کی بے چون و چرا تابعداری کرو، اور امور مذہبی میں اُس کی دست اندازی کو بالکل گوارا نہ کرو۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ نقطۂ خیال بدل گیا۔ قسطنطین کے

بعد ان کی خالص و بے آمیز مذہبیت مدہم پڑ گئی۔ البتہ اُس کی جگہ پاپایانہ و اجارانہ خود غرضیوں نے لے لی۔ اب ان کا اُصول یہ قرار پایا کہ اگر کوئی تاجدار کلیسا کا ہمدرد ہی، تو فرشتہ ہی، اور اگر مخالف ہی تو شیطان ہی، اس سے بالکل قطع نظر کر کے کہ فی نفسہ اس کی سیرت و اخلاق کیا ہی؟ مثلاً ایک شاہ قسطنطین ہی کو لیجیے جس کے اصل اخلاق کا اندازہ ایک اسی واقعہ سے ہوسکتا ہی کہ قبول مسیحیت کے بعد اس نے بہ کمال و شقاوت و شقا کی اپنی بیوی لڑکے اور بھتیجے کو قتل کر ڈالا۔ مگر پادری یوسیں اُس کی مدح و ثنا میں اسقدر رطب اللسان نظر آتا ہی کہ گویا وہ ظل اللہ تھا۔

اِس نقطۂ خیال کے سب سے بہتر نظایر دو بالکل مختلف سیرتوں کے تاجدار جولین و فوکس کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ جولین کی خانگی زندگی بیداغ تھی، رواداری اُسکے خمیر میں تھی، اور اُس کی طرز حکمرانی بالکل حکیمانہ انداز کی تھی، تاہم چونکہ کلیسا کے ساتھ اُس کا سلوک اچھا نہ تھا، اس لیے وہ ہر طرح کے سب و شتم کا ہدف بنا رہا۔ یہاں تک کہ جب اپنے ملک کی حمایت میں وہ میدانِ جنگ میں کام آیا تو اُس کے مرنے کے بعد بھی بدگویوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُس کی موت پر تاسف کیا معنی، اس پر اظہار مسرت و شادمانی کیا۔ اس کی شجاعت، جانبازی و وطن پرستی میں سے کوئی شے اِس کی شفیع نہو سکی، متعدد مقامات پر مسیحیوں نے تھیٹروں اور گرجاؤں میں جمع ہو کر، اُس کی موت پر خوب جشن کیے۔ اور سینٹ گرگوری اعظم نے اپنی بہم تقریروں میں جی کھول کر اُسے کوسا، اور اس پر اظہار افسوس کیا کہ اس کی نعش دفن کیوں ہو گئی، وہ تو اس قابل تھی کہ مزبلہ میں پھینک دیجاتی، بلکہ اُس زمانہ کے بعض مشرکوں کا تو یہ بیان تھا کہ جولین ہمارے ہاتھ سے قتل نہیں ہوا، بلکہ اُسی کے فوج کے کسی شخص نے اُسے مار ڈالا۔ یہ الزام اگرچہ کوئی بنیاد نہیں رکھتا، تاہم مسیحیوں کو اس کے تسلیم کرنے میں کچھ عار نہ تھا۔ وہ غداری اور کجروی کی اس روشن تصویر کو معیوب ہی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کی واقعیت کو تسلیم کر کے اس کے جواز بلکہ استحسان کو ثابت کرتے تھے

ایک مسیحی مورخ کہتا ہی کہ

"لیبانیس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بادشاہ کسی عیسائی کے ہاتھ سے قتل ہوا،
اور یہ دعویٰ غالباً صحیح ہے۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ خود رومی فوج کے کسی
شخص نے اُن قدما، کی تقلید کی ہو جو ملک و قوم کی حرّیت کے خاطر اپنے
مُستبد فرماں رواؤں کو ہلاک کر ڈالتے تھے۔ تو جب ملک و قوم کی حمایت میں
بادشاہ کشی قابلِ ملامت نہیں تو حمایت دینِ حق میں اسے کون معیوب
کہہ سکتا ہے؟"

ایک طرف تو جولین کے ساتھ یہ سلوک تھا۔ دوسری طرف فوکس کی وہ آؤ بھگت اتنا
وصفت تھی کہ گویا وہ خدائی کے درجہ پر تھا، حالانکہ قسطنطنیہ کے تخت پر شاید اس سے زیادہ
ذلیل اخلاق کا کوئی شخص نہیں بیٹھا ہے۔ مگر بات کیا تھی کہ یہ ہر وقت گرجا والوں کی پشت پناہی پر
مستعد رہتا تھا، اور اسی کے صلہ میں اس کی یہ ساری قصیدہ خوانی تھی۔ یہ ابتدائی پست حالت
سے ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن بیٹھا۔ اور سلطان جائز شاہ مارس کو معزول کر دیا۔ اس کے
بعد اس نے شاہ معزول کو مع اُس کے پانچوں بیٹوں کے اپنے سامنے پا بزنجیر بُلایا، اور جلّاد
کو حکم دیا کہ ان سب لڑکوں کی ان کے باپ کے آنکھوں کے سامنے گردن مارے شاہ مارس
کے صبر و ضبط کی یہ حالت تھی کہ یکے بعد دیگرے اپنے سب بیٹوں کو قتل ہوتے دیکھتا تھا اور
زبان سے یہ کہتا جاتا تھا کہ "الٰہی تیرا نام عادل ہے۔ تو عدل و انصاف ہی سے فیصلہ کرتا ہے"
چار لڑکے اسی طرح قتل ہو چکے تھے کہ جب پانچویں لڑکے کی جو بالکل خورد سال تھا، باری آئی
تو اُس کی دایہ نے بکمال شفقت اُسے چھپا کر اپنے لڑکے کو آگے کر دیا۔ مگر مارس بے اختیار
پکار اُٹھا کہ اس معصوم کو کیوں مارتے ہو، یہ میرا لڑکا نہیں۔ چنانچہ بالآخر وہ پانچواں لڑکا بھی تہ تیغ
کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر چونکہ مارس نے پاپایانہ اقتدار کو توڑا تھا، اس لیے اس کی یہ تمام
مظلومیت و بیکسی غیر موثر رہی، اور ہر طرف سے حیوان سیرت و سفّاک فوکس کی واہ واہ ہوتی
رہی۔ بلکہ سینٹ گریگوری نے شاہ فوکس اور اس کی ملکہ کو نہایت مُبالغہ آمیز تہنیت نامہ لکھے

جن میں یہ تک تحریر کردیا کہ آپ کے کارناموں پر آسمان و زمین فخر و مسرت کرتی ہیں۔ اور ان دونوں کے بُت پرستش کے لیے رکھوانے کا حکم دیدیا۔

مگر واقعات کی یہ رفتار مشرق و مغرب دونوں جگہ بالکل یکساں نہ تھی، بلکہ ایک زمانہ تک ان میں کافی اختلاف رہا۔ مشرق میں قسطنطین نے بالکل مشرقی تزک و احتشام اختیار کیا، اور اپنی ایسی دھاک بٹھائی کہ سارے اہل کلیسا اس سے مرعوب ہوگئے اور اُس وقت سے مشرقی کلیساؤں کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا، لیکن مغربی کلیسانے اپنی آزادی کو برقرار رکھا، اور رومی پادریوں نے یہی نہیں کہ شاہی اشاروں پر چلنے سے انکار کردیا بلکہ متعدد مواقع پر علانیہ شاہی احکام کی مخالفت کرتے رہے۔ رومہ سے شہنشاہانہ دار الحکومت کے قسطنطنیہ منتقل ہوجانے سے رومی پادریوں کے اقتدار و مطلق العنانی میں اور اضافہ ہوگیا، کہ اب اس مشہور و قدیم تاریخی شہر میں بجز اِن کے اور کوئی صاحب اقتدار رہ ہی نہیں گیا تھا۔ اب رومہ میں حکمراں طبقہ جو تھا وہ بربریوں کا تھا، جو فوجی طبیعت کے آدمی تھے، انھوں نے بارہا شاہانہ تکلّفات و تزک و احتشام کی نقل کرنا چاہی مگر اسے نباہ نہ سکے، اور اپنا کوئی خاص اثر و اقتدار نہ پیدا کرسکے۔ بلکہ گال میں مرو دنجین خاندان کے سلاطین کا یہ حشر ہوا کہ چند روز کے بعد سارا اقتدار شاہی محل کے دار وغہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ سلاطین برائے نام حکمراں رہ گئے، ورنہ دراصل سیاہ و سفید کے مالک یہی دار وغہ ہوگئے۔

اِس صورتِ حال سے بادشاہ پرستی یا بادشاہ کی نیابت الٰہی کا مسئلہ کیونکر پیدا ہوا؟ اسکی سرگزشت گو عام طور پر معلوم ہے، تاہم مختصراً ہم بھی بیان کیے دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی میں شاہ لیو نے چاہا کہ گرجاؤں سے بُت بالکل اُٹھا دیئے جائیں تاکہ شرک کا احتمال باقی نہ رہے۔ قسطنطنیہ کے پادریوں نے اس کی کچھ مخالفت کی، مگر بالآخر شاہی اقتدار کے مقابلہ میں ہتیار ڈال دیئے۔ لیکن پاپائے رُوم نے اس کی پُر زور مخالفت کی، اور جب دیکھا کہ بادشاہ اپنی ضد سے باز نہیں آتا، تو خود اُس کے ارتداد کا فتویٰ دیا، اور اس طرح اٹلی بالکل

خود مختار ہو گیا۔ اس کارنامۂ جرأت سے پاپا کے اقتدار و نفوذ کو چار چاند لگ گئے۔ اب وہ ساری دنیائے مسیحیت کا رہبر و محافظ تسلیم کیا جانے لگا۔ لوگ بحیثیت اٹلی کے نجات دہندہ کے اُس کی بیحد تعظیم کرنے لگے اور نظام خانقاہیت کا جس کی شاخیں گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھیں، صدر تو وہ پہلے ہی سے مسلّم تھا۔ پھر اُس نے اپنی اس فتح عظیم کے موقع پر جس متانت، وقار، و عالی ظرفی سے کام لیا، اُس نے اِس کی عظمت کا سکّہ اور بھی لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔

لیکن ایک بڑا خطرہ اب بھی باقی تھا، اور وہ لومبرڈی کے بربری حکمرانوں کی طرف سے تھا، اِن کے پہلے ایک آدھ فرمان روا تو پاپایانہ جبروت و طنطنہ سے ذرا دب گئے تھے، لیکن موجودہ تاجدار راسٹولفس کسی کو خاطر میں لانے والا نہ تھا، اس کی طرف سے پاپا کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا، ادھر خود پاپا کی جنگی قوت اُس کے مقابلہ میں شمّہ برابر بھی نہ تھی۔ اور اگر دم کی بقا مدِ نظر تھی تو خارجی استعانت ناگزیر تھی۔ ایسی حالت میں پاپا نے سب سے پہلے قدرتی طور پر چارلس مارٹل سے استدعاء امداد کی کہ اسی نے یورپ کو مسلمانوں کے قبضہ سے بچایا تھا، مگر اُس نے اِدھر ذرا توجّہ نہ کی، بلکہ خوش اعتقادوں کے نزدیک اسی جرم کی پاداش میں اسکی موت ہوئی۔ اور بعد موت۔ واصل جہنم ہوا، اس کی وفات پر پاپا نے اِس کے فرزند و جانشین پپین کی طرف رجوع کیا۔ اس نے کچھ تو ہوسِ ملک گیری اور کچھ اپنی بڑھی ہوئی خوش اعتقادی کی بنا پر اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اس میں اور پاپا میں ایک مُعاہدہ ہوا جو آیندہ تاریخ پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے یہ عہد کیا کہ پاپا کو دشمنوں کے گزند سے محفوظ رکھیگا۔ اور پاپا نے یہ عہد کیا کہ اُسے وہ مذہبی حیثیت سے تخت نشین کریگا موجودہ خاندان کو معزول کر کے سارے ملک کی حکومت مذہبی حیثیت سے اُس کے ہاتھ میں آجائیگی۔

فریقین میں سے دونوں نے اپنے اپنے شرائط کو پوری طرح پورا کیا۔ ادھر پپین نے دو مرتبہ فوج کشی کر کے پاپا کو اُس کے دشمنوں سے مستقل طور پر نجات دلادی، اور خود اس کے تفویض ایک ریاست کر کے اُسے پہلی مرتبہ ملکی حیثیت سے بالکل خود مختار کر دیا۔ اُدھر پاپا نے

خاندان مرووننجین کی معزولی کے بعد پپین کو سارے گال کا فرماں روائے غیر مسئول بنا دیا تخت نشینی
کے بعد خود اپنے ہاتھ سے اُس کے سر پر تاج رکھا اور یہ فتویٰ دیدیا کہ یہ نائب خدا ہی، جو شخص اس کے
یا اس کے ورثا کے احکام سے سرتابی کریگا وہ خلیفۃ اللہ سے بغاوت کریگا۔ اس واقعہ کا ظاہری پہلو
تو یہی تھا کہ ہر دو فریق اپنی اپنی جگہ پر شاد کام رہے۔ لیکن درحقیقت تاریخ پر اس کا وسیع و مستقل اثر
یہ پڑا کہ ایک طرف پاپا کو سلاطین کے عزل و نصب کا اختیار حاصل ہو گیا، جس نے آگے چل کر بڑے
بڑے اثرات پیدا کیے، دوسری طرف سلاطین کی نیابت و خلافت الٰہی مسلّم ہو گئی یہ حیثیت مشرک
سلاطین نے بھی اپنی رعایا کی زبان سے کہلا کر پیدا کرنی چاہی تھی۔ مگر ظاہر ہی کہ اس کو اتنا استحکام
نصیب نہیں ہو سکتا تھا، جتنا پاپا کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے سے ہوا۔

مگر یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اسقدر مہتم بالشان مسئلہ محض ایک اتفاقی واقعہ کا معلول نہیں
ہو سکتا۔ پاپا کا فتویٰ اگرچہ بجائے خود نہایت قوی اور موثر تھا، تاہم اس کی تائید میں کچھ اور موثرات
بھی تھے، جب جا کر نیابت و خلافت الٰہی کا مسئلہ دلوں میں راسخ ہو سکا۔ یہ خاص تائیدی موثرات
ہمارے نزدیک یہ دو تھے:۔

(۱) اوّل تو نظام خانقاہیت۔ خانقاہیت و رہبانیت کی بنیاد ہی نفس کشی، خود فراموشی، تذلل،
انکسار، فروتنی پر تھی، اور چونکہ تعلیم و تربیت و لٹریچر کی کنجی انہیں خانقاہ نشینوں و راہبوں کے
ہاتھ میں مدّت سے چلی آتی تھی، اور انہیں کے تربیت دادہ آگے چل کر مدبّرین مملکت و واضعین
قانون ہوتے تھے، اس لیے جذباتِ مذکور کی بنا پر ملک کی خودداری و حرّیت پہلے ہی
رخصت ہو چلی تھی، اور اس عقیدہ کو قبول کر لینے کے لیے وہ تیار ہو چکا تھا۔

(۲) دوسرے نظام جاگیرداری۔ پہلے صرف رعایا و سلطان، یہی حاکم و محکوم کے دو طبقے تھے
لیکن اب کچھ عرصہ سے جاگیروں و معافیوں کا دستور نکلا تھا، یعنی بادشاہ، کچھ حصہ ملک کا اُمرائے
سلطنت کو بطور جاگیر و معافی کے دیدیتا، یہ لوگ اپنے متوسلین کو جاگیریں دیتے، اور وہ
پھر اپنے متوسلین کو۔ اس نظام کا یہ اثر ہوا تھا کہ ہر شخص اپنے آقا کو براہ راست اپنے سے

قریب پاتا تھا، اور اس طرح بھی خودداری و مطلق العنانی کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ کاشتکار اپنا آقا پٹی دار کو سمجھتا تھا، پٹی دار زمیندار کو، اور زمیندار خود بادشاہ کو۔ غرض اس طرح کوئی شخص آزاد و خود مختار نہیں رہ گیا تھا۔

لیکن یہ سب چیزیں مل کر بھی اس عقیدہ کی عام اشاعت کے لیے کافی نہ تھیں۔ عوام پر جتنا اثر حال کا ہوتا ہے، قال کا نہیں ہوسکتا۔ اُن کے لیے زبانی تعلیم و ہدایت بالکل ناکافی ہے، تاوقتیکہ عملی نمونہ موجود نہ ہو۔ خود رہبانیت کی اشاعت محض دعوت و ارشاد سے اُس وقت تک ہرگز نہ ہوسکی، جب تک اس کی تائید میں بعض راہبین عظام کے نمونہ اور زندگیاں دُنیا کے سامنے نہ پیش کی جاچکیں۔ یہ ضرور ہے کہ شروع میں زبانی تعلیم و ہدایت لازمی ہوتی ہے تاکہ لوگوں کو توجہ ہو، اور بغیر یوں تیاری کیے ہوئے کوئی بڑا شخص پیدا نہیں ہوسکتا، لیکن پھر اشاعت عام بھی نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ کوئی بڑا عملی نمونہ پیش نظر نہ ہو، کہ عوام کا متخیلہ صرف عملی نمونہ ہی سے متاثر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ عقیدۂ زیر نظر کا ایک عملی مجسمہ بھی بالآخر پیدا ہوگیا، اور وہ شارلمین تھا۔

شارلمین حقیقۃً رجال عظام میں سے گزرا ہے۔ تاریخی حیثیت سے بھی، اور اساطیر مذہبی کے نقطۂ خیال سے بھی، گو ان دونوں کے حدود بالکل علیحدہ اور باہم مختلف ہیں۔ تاریخی حیثیت سے دیکھیے تو یہ شخص عجیب جامع و ہمہ گیر دماغ کا تھا۔ مذہب، علم، معاشرت، سیاسیات، ہر صیغہ میں اس نے کافی اصلاح کی، باوجود متعدد اسباب مخالف، و ناساعدت زمانہ کے اِس نے گرد و پیش کے بربری قبائل پر بارہا بذاتِ خود فوج کشی کی، انہیں شکست پر شکست دی، سلطنت کی رونق و شان میں اضافہ کیا، بہت سے مفید قوانین وضع کیے، اہل کلیسا کے ساتھ احسانات بھی کیے، مگر ہمیشہ اُنہیں اپنے اشارہ پر چلایا، تعلیم کی اشاعت و تحفظ میں سرگرمی دکھائی، درسگاہیں و کتبخانہ قایم کیے۔ اپنے گرد و پیش بہترے علما و فضلا کا مجمع رکھا، ملک کی تجارت کو فروغ دیا، ٹکسال کی اصلاح کی، غرض کوئی صیغہ ایسا نہ تھا جس میں اُس نے مفید خدمات انجام نہ دی ہوں، اور بحیثیت مجموعی اُس کے کارناموں نے خلقت کے متخیلہ کو اسقدر متاثر کیا کہ ہر زبان پر اُس کی عظمت کے صدہا افسانے جاری ہوگئے۔

اور جن ملکوں میں پہلے راہبوں و زاہدوں کی پرستش جاگزیں رہتی ہے، اُن میں اب وہ جگہ ایک تاجدار عظیم کے تخیل نے لے لی۔ رہبانیت و خانقاہ نشینی کا اثر اسی وقت سے ماند پڑنے لگا، اور اسکے بجائے جہاد و غزا کو اہمیت و تقویت حاصل ہوتی گئی۔

یہ کارنامہ اگرچہ اس کی تاریخی عظمت کے لیے بالکل کافی تھے، لیکن عوام کا متخیلہ اُس کی جس شہرت سے متاثر تھا، وہ اس حیثیت سے نہ تھی۔ اس کی بنا ایسی روایات پر تھی جنھیں تاریخ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مثلاً یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شارلمین کی ساری عمر قوم سکسن سے لڑتے بھڑتے گزری، جن کے اوپر اُس نے ۳۲ حملے کیے، مسلمانوں سے اُس نے بہت ہی کم تعرض کیا۔ مدۃ العمر میں صرف ایک بار اس سے اور مسلمانوں سے مقابلہ ہوا، وہ بھی بہت چھوٹے پیمانہ پر، اور پھر اُس میں بھی اُسے ناکامیابی ہوئی۔ مسلمانوں کا زور توڑنے والا اصل میں چارلس مارٹل تھا۔ یہ سب تاریخی حقایق ہیں۔ لیکن شہرت عام کی باطل پرستی دیکھو، کہ چارلس مارٹل کے سارے کارنامہ شارلمین کے نامہ اعمال میں لکھدیے گئے۔ دنیائے مسیحیت کو مسلمانوں کے پنجہ سے آزادی دلانے والا شارلمین قرار پایا۔ اور چونکہ چارلس مارٹل، اہل کلیسا کا دوست نہ تھا، اس لیے اس غریب کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا، بلکہ یہ عام اعتقاد شایع تھا کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر جہاد و غزا میں گزاری وہ شارلمین تھا۔

شارلمین کا عہد قرون وسطےٰ کے دورِ اوّل کا خاتم، اور مسیحی عسکریت کا بانی تھا۔ اور اسی عہد پر ہم تاریخ ہذا کو ختم کرتے ہیں۔ صفحات گزشتہ میں ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ آغسٹس سے لیکر شارلمین تک عہد بہ عہد اخلاقی تخیل میں کیا کیا تغیرات ہوتے رہے۔ ہر زمانہ میں لوگ کن کن چیزوں کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتے رہے۔ یورپین طبایع پر رومی سلطنت کے کیسے وسیع اور یونانی تمدن کے کیسے دقیق اثرات ہوتے رہے؛ اور یہ کہ رواقی، فلاطونی، و مصری، فلسفہ اور اخلاق میں کیا تعلقات رہا کیے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ یورپین مسیحیت کا کیونکر نشو و نما ہوا؛ معاشری، سیاسی، قانونی تغیرات اس کی بنا پر کیا کیا ہوئے؛ اخلاق کے شعبہ میں اس نے

کیا کیا اصلاحیں کیں، اور پھر اُس میں انحطاط کیونکر پیدا ہوا، رہبانیت و عدم رواداری کیونکر پیدا ہوئی، اور بالآخر بربری قبائل کی آمیزش نے اس کی اصلی صفائی و پاکیزگی میں کتنی گندگی پیدا کردی۔ لیکن خاتمے سے قبل ایک ضروری باب کا اضافہ لازمی ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر جابجا ضمنی اشارات کیئے ہیں، لیکن اُس کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ ایک مستقل باب اس کی نذر کیا جائے۔ یہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا ہر زمانہ میں کیا مرتبہ (پوزیشن) رہا ہے، اور اس کا اثر مرد و عورت کے اخلاقی تعلقات پر کیا پڑتا رہا ہے۔

باب پنجم

عورت کا مرتبہ

فصل (۱)

انسان کی طرزِ معاشرت، جبتک بربریانہ وخانہ بدوشانہ رہی اُس وقت تک حالات کے لحاظ سے یہ ناگزیر تھا کہ عورت کا مرتبہ پست رہے۔ اُس وقت کے انسانی مشاغل کی کوئی فہرست تیار کرنا چاہے، تو صرف دو عنوانات کافی ہونگے:۔ جنگ وصید افگنی۔ لڑنا بھڑنا، ایک قبیلہ کا دوسرے پر دھاوا کرنا، حیوانات کا قدم قدم پر مقابلہ کرنا، بس یہی وہ چیزیں تھیں جن میں وہ لوگ تمامتر مشغول رہتے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس میدان میں عورت مردوں سے بازی نہیں لے جاسکتی تھی۔ عورت کا سب سے زیادہ قوی حربہ اُس کا حُسن ہے، لیکن حیوان خصلت وحشی انسانوں کو حُسن وجمال، رعنائی ونزاکت کے معنی ہی سے کوئی واسطہ نہ تھا، عورت کی زندگی کا اصلی دائرۂ عمل، فوجی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی وخانگی زندگی ہے۔ لیکن خانہ بدوش صحرائیوں کے ہاں اہلی وخانگی زندگی کا سرے سے کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ اُس وقت عورت کے وجود کے صرف دو مقاصد سمجھے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ مرد کی خدمت گزاری کرے، دوسرے یہ کہ اُس کے قوائے شہوانی کو تسکین دے۔ اوّل الذکر حیثیت میں اس کی زندگی غلامی کی انتہائی سختیوں اور ذلتوں کا نمونہ تھی، اور دوسری حیثیت سے بھی اُسی ان ناقابل بیان مصائب وآلام کا متحمل ہونا پڑتا تھا جن کا نمونہ آج بھی مادہ جانوروں میں نظر آتا ہے۔

غرض بہ حیثیتِ مجموعی عورت کی پستی، عالمِ وحشت وبربریت کا عین اقتضا تھا۔ تاہم اُس وقت بھی وہ جذبات جو آگے چل کر عورت کی عظمت کے عناصر قرار پائے۔ سرے سے معدوم نہ تھے۔ وہ

موجود تھے، گو ناقص و نامکمل صورت میں۔ نکاح کی رسم، عفت و عصمت کی خوبی، زناکاری پر تعزیر، اِن میں سے کوئی شے غیر موجود نہ تھی۔ اور عورت کے لیے اپنے جذبات شہوانی پر قابو رکھنا سب سے بڑا وصفِ امتیازی سمجھا جاتا ہے۔ گو اس کے مقابلہ میں مرد کو بدچلنی سے روکنے کے لیئے براہِ راست کوئی قانون نہ تھا۔ عام ارتقاءِ تمدن کے ساتھ، عورت کے مرتبہ میں جو ارتقاء ہوا اُس کی ابتدائی کڑیاں یہ دو تھیں:-

(۱) رسمِ خرید ازدواج کا انسداد؛

(۲) وحدتِ ازدواج، اور اس کی بنا پر خاندان کی تاسیس۔

قدیم ترین زمانہ میں شادی کا طریقہ یہ تھا کہ لڑکی کے والد اور اُس کے آیندہ شوہر کے درمیان ایک قرارداد ہو جاتی جس کی رُو سے آخر الذکر اپنے خسر کو ایک رقم معین دیتا، اس کے بعد وہ لڑکی اسکی کنیز زرخرید ہو جاتی۔ اور وہ رقم اُس کی قیمت سمجھی جاتی، ہندو قانون کو چھوڑکر، جس نے اِس بنا پر اس کی ممانعت کی کہ اس سے لڑکی فروخت ہو جاتی ہے، باقی تمام زمانہ میں ایک وقت یہ دستور عام تھا، چنانچہ اسرائیلیوں اور یونانیوں میں تو رواج کے عام ہونے کی تحریری شہادت موجود ہے۔ رفتہ رفتہ یونان میں، اِس دستور میں، یہ ترمیم ہوئی کہ یہ رقم بجائے لڑکی کی قیمت کے اُس کے جہیز کے نام سے موسوم کی جانے لگی، یعنی اب اس سے والد اپنی لڑکی کو فروخت نہیں کرتا تھا بلکہ سسرال میں اس کے مصارف کے لیے اپنے پاس سے کچھ رقم دیتا تھا۔ اس ترمیم و رواج سے عزت نسواں کی تاریخ پر جو اہم اثرات پڑے وہ دو تھے:- ایک یہ کہ عورت کی حیثیت غلامانہ نہیں رہی، بلکہ معاہدہ ازدواجی میں اس کی حیثیت بھی ایک فریق کی ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ افتراق کے وقت، رومہ و یونان کے قانون کے بموجب اُسے یہ رقم واپس پانے کا استحقاق ہوگیا۔ جرمنی میں اس سے کسی قدر مختلف دستور رائج تھا۔ وہ یہ تھا کہ شادی کے وقت نہ لڑکی اپنے ساتھ جہیز لاتی تھی نہ داماد اپنے خسر کو کچھ قیمت دیتا تھا، بلکہ شب نکاح کی صبح کو شوہر خود بیوی کے ہاتھ میں کچھ رقم دیتا۔ اور یہی رقم آگے چلکر مہر کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس سے بھی اہم تر نتائج، وحدت ازدواج کی رسم سے پیدا ہوئے، جس کی بنا پر یونان کو اپنے پیشرو مشرقی تمدن پر ہمیشہ سے تفوق حاصل رہا ہے۔ اس رسم کو خواہ ضمیریت کے نقطۂ نظر سے دیکھئے، خواہ افادیت کی عینک سے، اس کی برتری ہر صورت نظر آئیگی۔ کثیر الازدواج قوموں میں نکاح کا مدعا ہمیشہ شہوت رانی سمجھا گیا ہے، بہ خلاف اس کے مغربی قوموں میں محرک عقد مناکحت فریقین کی اُلفت و محبت اور حیات منزلی کی تکمیل رہی ہے، جس سے صاف عیاں ہے کہ وحدت ازدواج فی نفسہ کثرت ازدواج سے اعلیٰ، اشرف، و افضل ہے، پھر اگر حیثیت افادی کو پیش نظر رکھیئے۔ تو بھی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کائنات میں ذکور و اناث کی مساوات تعداد، مرد و عورت کی مساوات حقوق اور امن و خوش نظمی خاندان کو ملحوظ رکھنے کے لیے اس سے بہتر شادی کی کوئی صورت خیال میں ہی نہیں آتی کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تزویج ہو۔

یونان کے عہد اولیٰ میں وحدت ازدواج کا دستور عام تھا، جس میں شاذ و نادر مستثنیات واقع ہوتے تھے، وہ بھی کسی اہم ضرورت کے وقت جب ملک کی آبادی میں اضافہ ناگزیر ہو جاتا تھا، لیکن اس موقع پر ناظرین کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یونان قبل التاریخ میں جس کی تصویر ہومر کے صفحات میں ملتی ہے، اور تاریخی یونان میں اس خاص حیثیت سے بہت بڑا فرق ہے، درحقیقت یونانِ قدیم میں عورت کی جو عظمت مسلّم تھی وہ اپنی نظیر آپ ہی کہی جا سکتی ہے۔ اور گو تمدن جدید آج عظمتِ نسوانی کے صدہا مختلف اسالیب بیان اختیار کرے، اور اُن میں ہر طرح کا تنوع و تجدد پیدا ہو تاہم اسکے جو اُصولِ اساسی یونان قبل التاریخ نے مقرر کر دیئے تھے ان میں سرمو اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ہکٹر و انڈروماکی کی ازدواجی اُلفت، پینیلوپ کی وفا شعاری، الیٹس کا جانبازانہ عشق، انٹی گان کی پدر پرستی، پالیکسنا کی جانبازی، ایفیجینیا کا ملکوتی صبر و استقلال، ناسیکا کی عصمت مآبی، یہ تمام قدیم یونانی خواتین ایسی گزری ہیں کہ اُن پر تفوق کیا معنی، ان کی ہمسری تک دمۂ یورپ کی بہتر سے بہتر مثالیں بھی نہیں کر سکتیں۔ کنواریوں کی عصمت شعاری اور بیاہیوں کی شوہر پرستی تو یونان قدیم کی سی کہیں دنیا میں کبھی پائی ہی نہیں گئی۔ مشاہیر کی فہرست میں جسقدر ممتاز نام رجال کے نظر آتے ہیں، اُسی قدر

خواتین کے ہی ہیں۔ خود جنگ ٹرائے، جس نے مدّتوں یونان کی سرزمین کو انسانی خون سے لالہ زار بنائے رکھا، کیا تھی؟ صرف ایک رشتۂ ازدواجی کی بے حرمتی کا نتیجہ تھی۔ لیکن یہاں ان تمام حیثیات سے عورت کی عظمت مسلّم تھی، وہاں عورت کی زندگی میں ذلت آمیز عناصر بھی موجود تھے۔ شوہر جتنی خانگیاں چاہتا، بے روک ٹوک رکھ سکتا تھا، جنگ میں گرفتار شدہ عورتیں کتنے ہی معزز طبقہ کی ہوں، سخت سے سخت برتاؤ کی مستحق سمجھی جاتی تھیں۔ ایک عورت نیڈورا کی بابت عام اعتقاد تھا، کہ وہی تمام دنیوی آفات و مصائب کی جڑ ہے۔ عورت کی پستی، مرد کے مقابلہ میں علانیہ تسلیم کی جاتی تھی اور اس پر یہ عجیب و غریب طبّی استدلال پیش کیا جاتا تھا، کہ قوتِ تناسل صرف مرد میں ہے، اور عورت عملِ تولید میں ایک بہت ہی ادنیٰ حصّہ رکھتی ہے۔

یہ یونان قبل التاریخ کا حال تھا۔ تاریخی یونان میں عورت کا قانونی مرتبہ گو کسی قدر بلند ہو گیا تھا، تاہم ساتھ ہی اس کی اخلاقی زندگی میں نمایاں انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ اب باعصمت عورتوں نے بالکل پردہ نشینی اختیار کر لی، اور اس زمانہ سے خواتین یونانی کے مرقع میں جو سب سے ممتاز و نظر فریب تصویر ہے۔ وہ وہاں کے طوائف کی ہے۔ مردوں کے لیے بھی، اسی زمانہ سے بدچلنی معیوب نہیں رہی۔

کسی ملک کی تاریخ اخلاق میں جن حقایق پر روشنی ڈالنا سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے، وہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق احساسات سے ہوتا ہے، یہ بتا دینا نسبتہً نہایت آسان ہے کہ کسی ملک کے باشندے فلاں فلاں اعمال و اشغال میں مصروف رہتے تھے، یا ان کی فلاں فلاں تعلیمات تھیں، لیکن اُن احساسات و جذبات کا پتہ لگانا جو ان اعمال و اشغال کے محرک تھے، سخت دشوار ہے اور پھر خصوصاً ایسے ملک کے باشندوں کی کیفیاتِ نفسی کی تشخیص کرنا جن کی طرزِ معاشرت اور موجودہ طرزِ معاشرت میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ اقوام میں شہوت پرستی و ذہانت کے اجتماع کی مثالیں تو متعدد ملتی ہیں، اور خود فرانس و اٹلی نے اس کے متعدد شواہد ہمارے پیشِ نظر کر دیے ہیں کہ نہایت پست اخلاق جماعات میں علم و تخئیل بدرجہ کمال موجود رہا ہے۔ لیکن یونانی زندگی کی بوالعجبی یہ ہے کہ یہاں شہوت پرستی نے شباب پر مشاہیر حکمائے اخلاق کی نظروں کے سامنے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ انھیں کے ظلِ عاطفت میں پہنچی

اگر آج ہم سے کوئی یہ بیان کرے کہ فرانس کی مشہور طوائف نینا ڈی انکلو کے کمرہ میں پیرس کے دیندار اساطین مسیحیت بیٹھے ہوئے اُسے اُس کی دکان عصمت فروشی کی رونق و ترقی سے متعلق مشورہ دے رہے ہیں، تو ہم میں سے ایک شخص کو بھی اس روایت پر یقین نہ آئیگا۔ لیکن واقعہ یہ ہی کہ بعینہٖ یہی تعلق سقراط اعظم اور طوائف تھیوڈوٹا کے درمیان تھا!

لیکن اگر ہمیں اخلاقیاتِ یونان کی حیاتِ نفسی کو صحیح طور پر سمجھنا مقصود ہی، تو چاہیئے کہ سب سے پہلے کچھ اُس موضوع اہم پر گفتگو ہولے جس کا اخلاق و قانون سے یکساں تعلق ہی، یعنی یہ کہ خود طوائفوں کے پیشۂ عصمت فروشی کا اخلاقی نقطۂ خیال سے کیا مرتبہ ہونا چاہیئے؟

قدیم علماءِ مسیحیت کا یہ ایک مشہور مقولہ ہی کہ جذبۂ شہوت انسان کی معصیت اولین ہی، اور اس میں شبہ نہیں کہ علم و سائنس کی موجودہ ترقیوں نے بھی اس راہبانہ خیال کی عملاً تصدیق کردی ہی کہ انسان میں یہ جذبہ فطرتاً اس سے زیادہ رکھ دیا گیا ہی، جتنا کہ نظام عالم کے بہبودی کے لیے لازمی تھا۔ مالتھس کی تحریروں نے ثابت کردیا ہی کہ اگر انسان اپنے فرایضِ ازدواجی کو پابندی و اعتدال کے ساتھ ادا کرتا رہے، تو کچھ عرصہ میں دُنیا کی مردم شماری میں اسقدر غیر محدود اضافہ ہوجائیگا کہ آدمی کو سانس لینا دشوار ہوجائیگا، اور دنیا انواع و اقسام کے فتنہ و فساد، مصائب و آلام کی آماجگاہ بن جائیگی۔ نیز یہ کہ گو انسان میں بہت ہی نوعمری سے توالد و تناسل کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہی تاہم ترقیِ تمدن کا تقاضا یہ ہی کہ وسیع و گنجان آبادیوں میں نکاح بہت سن پر پہنچ کر ہوا کریں۔ چنانچہ یہ دستور کسی بھی متمدن جماعت میں نہیں پایا جاتا کہ ابتدائی علاماتِ بلوغ کے ظہور پر نکاح ہوجایا کرے، اور سائنس کی روز افزوں ترقی صغر سنی کی شادیوں کو شاذ سے شاذ تر کرتی جاتی ہے۔ پھر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حکماءِ اخلاق عصمت و عفت کے مناقب پر کتنا ہی زور دیں، عملاً اُن کے معیار پر پورا اُترنا کیسا، دنیا کبھی اُسکے لگ بھگ بھی نہیں پہنچ سکی ہی، بلکہ ہر قوم، ہر ملک، اور ہر زمانہ میں ایک عظیم الشان تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہی، جو قوانین عصمت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں اور دنیا کی موجودہ

خرابیوں اور ابتریوں کے اسباب کی اگر تحصیل کی جائے، تو ہر دوسرے سبب کے مقابلہ میں یہ سبب نہایت قوی ثابت ہوگا۔ اِن حقایق کو لیکی نے بہ تصریح ثابت کیا ہی، لیکن کیا عجب ہی کہ اخلاقیین یونان کی نظر سے بھی یہ مخفی نہوں۔

حکمائے اخلاق اس مسئلہ کو حل کرتے وقت دو چیزوں کا خصوصیت سے لحاظ رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ پرورشِ اولاد کا بار والد کے سر رہے جو دنیا میں اس کے وجود کا باعث ہوا، دوسرے یہ کہ خاندان کا امن و نظام قایم و برقرار رہے۔ کہ حقیقتہً ملک کی خوش نظمی و امن منحصر ہی خاندان کی خوش نظمی و امن پر، اور اجتماعی مسرت کا راز خانگی خلوص و وفا کے اندر مضمر ہی۔ اس کے ساتھ محبتِ ازدواجی کا یہ خاصہ ہی اور انسان اس پر مجبول ہی کہ جس بچہ کی پرورش و تربیت اُس کے سر پر پڑی ہی، اُس کی بابت اُسے اطمینانِ کامل ہو کہ وہ اسی کی اولاد ہی، اور یہ اِسی خواہش کا نتیجہ ہی کہ جہاں شوہر کو اپنی بیوی کی عصمت پر کچھ بھی شبہ ہو جاتا ہی حیاتِ منزلی میں امن و سکون کی جگہ ایک سخت تلاطم برپا ہو جاتا ہی۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ جذبۂ جنسی کی قوت اسقدر شدید ہی، کہ جماعت کی طرف سے یہ تمام بندشیں یہ ساری روک تھام بے اثر ہو جایا کرتی ہی، اور ایسے واقعات ہر جگہ بکثرت پیش آتے رہتے ہیں جن سے امن و نظمِ خانگی مختل ہو جاتا ہی۔

اِن تمام حالات کی کشمکش کے درمیان وہ ہستی معرضِ وجود میں آگئی، جو اخلاقی نقطۂ نظر سے یقیناً سب سے زیادہ مذموم اور بعض حیثیات سے سب سے زیادہ خطرناک ہی۔ وہ بدنصیب ہستی جو بجائے خود فحش کے مرادف ہی، وہ ناپاک ہستی جو عشق و محبت کے پاک و لطیف جذبات کو جلبِ منفعت کا آلہ بناتی ہی وہ ہستی جو اپنے تئیں تمامتر دوسروں کی شہوت رانی کے لیے وقف رکھتی ہی، وہ ہستی جس کا وجود صنفِ نازک کے لیے باعث توہین کہا جاتا ہی: اور وہ ہستی جسکی زندگی ذلت و امراضِ خبیثہ سے لبریز ہوتی ہی، ہمیشہ سے ہر ملک میں موجود رہی ہی، اور اس کا وجود دہر زمانہ میں جبینِ انسانیت پر معصیت کا ایک مستقل و نمایاں داغ رہا ہی۔ یہ گو اپنی ذات سے

ایک مجموعۂ معاصی ہی، تاہم اس کا وجود ہیئتِ اجتماعیہ کے قیام کا ضامن، اور سب سے بڑا محافظ عصمت ہی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آج جو شوہر اپنی بیویوں کی عفت شعاری پر نازاں ہیں، ان کی زبانوں پر کلمات محبت و فخر کی جگہ اِن کی گردنیں شرم و پشیمانی سے خم ہوتیں، اور ان کے دل رشک و انتقام کے جذبات سے جوشن زن ہوتے۔ ہیجانِ شہوت کا وہ طوفان جو ایک خاص پیشہ کی عورتوں کے حلقہ کے اندر محدود ہو کر رہ گیا ہی، کسی عورت کا پردۂ عصمت باقی نہ رہنے دیتا، یہ پیشہ وہ ہی جس کی عُمر انسانیت کے دامن سے بندھی ہی۔ مختلف تمدّن، مختلف مذاہب، و مختلف اُصولِ اخلاق پیدا ہوئے اور فنا ہو گئے، لیکن یہ پیشہ جوں کا توں قایم و زندہ ہی۔

عیسائی قوموں نے اس طبقہ کی (اور اس طبقہ پر کیا موقوف ہی ہر ایسی عورت کی جس نے قانونِ عفت کو ملحوظ نہیں رکھا) قسمت کا فیصلہ کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا ہی۔ اور اینگلو سیکسن اقوام تو اِس باب میں اتنی متشدد ہیں کہ ان کے نزدیک اگر کسی عورت سے ایک مرتبہ بھی یہ جُرم سرزد ہو جائے تو اسے ایسا داغ لگ جاتا ہی کہ کوئی توبہ و استغفار، کوئی امتدادِ زمانہ، اور کوئی کفارہ اُسے نہیں مٹا سکتا۔ اور اس تعزیرِ شدید کی بنا محض نقل پر نہیں، بلکہ عقل پر بھی سمجھی جاتی ہی۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہی کہ جماعت کے نظام کا دارومدار تمام تر حیاتِ منزلی کی خوش نظمی پر ہی، اور اسے برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہی، کہ جو چیزیں اس میں خلل انداز ہوتی ہیں، اُنھیں پوری قوت و شدت سے روکا جائے، اور جماعت کے ہاتھ میں ذلت و تحقیر کی جو آخری حد ہی، یہ مُجرم اس کے مستوجب قرار دیے جائیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے اوصاف مخالف یعنی عصمت و عفت کی خوبیاں از خود عورتوں کے ذہن نشین ہو جائینگی اور اُنھیں با عصمت و عفیفہ رکھنے کے لیے شوہروں کی نگرانی بالکل غیر ضروری ہو جائیگی اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ اُن کی اخلاقی زندگی کے دوسرے شعبے بھی ایک بڑی حد تک اصلاح پذیر ہو جائینگے۔

(براہین بالا کے جواب میں فریق ثانی جو دلائل پیش کرتا ہی وہ خالی از وزن نہیں۔ یہ فریق دلائل ذیل پیش کرتا ہی:- (۱) اوّل یہ کہ یہ دستور مٹنے والا نہیں۔ پھر اسقدر سختی سے کیا فائدہ؟ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہی کہ پہلے جو چیز کُھلے خزانہ ہوتی وہ اب منافقانہ انداز سے چُرا چھپا کر کی جاتی ہی، اور یہ اخفاء درحقیقت گناہ کی وجہ اور جرم

کی وزن کو اور زیادہ بھاری کئے دیتا ہے۔ طوائفوں کا شمار روز افزوں ہے ۱۸۶۴ء کی
مردم شماری کے لحاظ سے انگلستان میں صرف اُن طوائفوں کی جن کا نام درج رجسٹر تھا
تعداد ...... ۵ تھی اور جو چوری چھپے یہ پیشہ کرتی تھیں اُن کا تو کوئی حساب ہی نہیں اور اب
تو یہ تعداد بدرجہا بڑھ گئی ہے۔

(۲) غیر معتدل شرم و حجاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خبیث و موذی مرض جو زانی شوہر
سے معصوم بیوی بلکہ اُس کے بچوں تک منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یعنی آتشک، اس کی رفتار
سُرعت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور قانون اس کے اسباب کی باضابطہ تحقیقات اور اس کے
انسداد کی تدابیر اختیار کرنے سے جھجکتا ہے۔

(۳) وہ خفیف اخلاقی لغزشیں جو دیگر ممالک یورپ میں قابل اعتنا بھی نہیں سمجھی جاتیں
بلکہ جو اکثر دو زندگیوں کی باہمی محبت، مسرت و پاک بازی کا مقدمہ ثابت ہوتی ہیں
اُن کا ارتکاب انگلستان میں دائمی بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

(۴) ایک نتیجہ اس طرز عمل کا یہ بھی ہے کہ اطفال کُشی کا شمار روز افزوں ہے۔

(۵) اس حقیقت کی بیشمار نظیریں ملتی ہیں کہ پاکباز و عصمت [illegible]ت لڑکیاں جن سے محض ایک بار
اتفاقاً لغزش ہو گئی۔ انھیں سوسائٹی کی اس شدید رائے کے خوف سے اپنی زندگی دائمی
عصمت فروشی کی نذر کر دینا پڑی ہے۔

(۶) پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں کہ اس متروک و مردود طبقہ میں
اکثر لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فطرتاً نہایت سلیم الطبع، وفا سرشت و نیک خصال ہیں
اور جنھوں نے محض کسی مجبوری سے اس پیشہ کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنے
فاقہ کش والدین کے لئے ذریعہ معاش اس صورت سے بنتی ہیں یا بعض خود فاقہ کشی کی
حالت میں اس پر مجبور ہوتی ہیں وقس علیٰ ہذا۔

ان مختلف خیالات سے جنھیں میں نے بغیر جرح و تنقید محض نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو اس کا

اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مسئلہ زیر بحث کس قدر اہم و مختلف فیہ ہی۔ یونانی مقنّنین و اخلاقیین نے اس کے حل کی یہ صورت نکالی۔ کہ جنس نسواں کو دو بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گھروالیاں جو شوہروں کی حد درجہ وفادار بیویاں ہوتی تھیں۔ دوسرے باہر والیاں جو آشنائی کرتی پھرتی تھیں۔ گھر والیاں سخت پردہ کے اندر رہتی تھیں اور عموماً بہت کم سنی میں بیاہ دی جاتی تھیں۔ ان کے رہنے کے لئے مکان کا ایک پردہ دار حصہ مخصوص ہوتا تھا اور ان کے مشاغل یہ ہوتے تھے۔ چرخہ کاتنا۔ سینا پروتا۔ خانہ داری کا انتظام۔ اور بیمار غلاموں کی تیمارداری۔ ان میں سے جو خوشحال ہوتی تھیں وہ بہ استثناء شاذ کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں اور جب کبھی نکلتیں تو خادمہ کو ساتھ لے کر۔ عام مجالس و ملاعب میں کبھی شرکت نہیں کرتی تھیں، اور تاوقتیکہ ان کے شوہر موجود نہ ہوں کسی مرد سے نہیں ملتی تھیں۔ اجنبی مرد کے سامنے کھانا تک نہیں کھاتی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا جوہر عصمت تھا جسے انھوں نے غالباً ہمیشہ قایم رکھا۔ اور اس حفظ ناموس کے بعض خارجی موئیدات بھی تھے۔ مثلاً یہ کہ انھیں جادۂ عفت سے ہٹنے کے موقع بھی بہت کم حاصل ہوتے تھے یا یہ کہ جو مرد انھیں خراب کرنے کی کوشش کرتے تھے سوسائٹی اُن کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آتی تھی، نیز یہ کہ مردوں کو جب حفظِ نفس کے اور وسائل حاصل تھے تو ادہر متوجہ ہونے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کی یہ طرز زندگی گو ایک طرف ان کی عصمت و ناموس کی سب سے بڑی محافظ رہی لیکن دوسری طرف اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ ان کے قوائے ذہنی کی تربیت نہ ہو سکی اور ہر وقت لونڈیوں باندیوں کے درمیان گھرے رہنے سے ان کی نظریں لازمی طور پر پست و تنگ ہو گئیں۔ گھر والیوں کی خوبی کا بڑا معیار یہ تھا کہ ان کی بابت نیک یا بد کسی حیثیت سے بھی سوسائٹی میں کہیں ذکر نہ آنے پائے۔

اپنے اس محدود دائرہ زندگی کے اندر بیویاں غالباً بہت خوش رہتی تھیں۔ عادت اور رسم و رواج نے اس مقید خانگی زندگی کو ان کی فطرت ثانیہ بنا دیا تھا۔ اپنے شوہروں کی

غیر معتدل بدچلنیوں پر یہ عموماً صابر رہتی تھیں۔ گھر کے اندر جو اخلاق و آداب رائج تھے وہ بہت ہی شریفانہ تھے۔ بیویوں پر کسی طرح کے مظالم کا پتہ نہ تھا۔ شوہر زیادہ تر باہر رہا کرتے تھے۔ جس سے ان کی بیویوں کو رشک و رقابت کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ اور وہ ان کے ساتھ دلی اُلفت و محبّت رکھتی تھیں۔ زنافن کے ذریعہ سے ہمیں ایک شوہر کی طرز زندگی کی یہ تصویر نظر آتی ہے کہ اس نے ایک پانزدہ سالہ لڑکی سے شادی کی ہے جو بالکل اُلھڑ اور دنیا کے حالات سے ناواقف ہے۔ شوہر اُس کی طرف انتہائی لطف و شفقت سے مخاطب ہوتا ہے۔ لیکن انداز خطاب یہ ہے کہ گویا کسی بچّہ سے گفتگو کر رہا ہے وہ اسے سمجھاتا ہے کہ شہد کی مکھیوں کی ملکہ کی طرح اُسے بھی ہر وقت گھر کے اندر اور انتظام خانہ داری میں مصروف رہنا چاہیئے۔ لونڈی غلاموں کو اُن کے کام پر مقرر کرنا، خانگی مصارف میں کفایت مدّنظر رکھنا، اسباب خانہ داری، کپڑے، جوتے، ظروف وغیرہ کو قرینہ سے رکھنا، یہ سب اُس کے فرائض ہیں۔ ان کے علاوہ اسے اپنے بیمار غلاموں کی تیمارداری بھی کرنا چاہیئے۔ جب شوہر اپنی تقریر کے اس حصّہ پر پہنچتا ہے تو بیوی ایک طفلانہ بے اختیاری کے ساتھ بول اُٹھتی ہے کہ "ہاں مجھے یہ کام سب سے زیادہ پسند ہے۔ اگر وہ غلام مجھے زیادہ چاہنے لگیں"۔ پھر شوہر نہایت ملایم لہجہ میں اُسے سمجھاتا ہے کہ اونچی ایڑی کے جوتے پہننے اور چہرہ پر سُرخ غازہ لگانے کی عادت کو ترک کر دینا چاہیئے۔ خاتمۂ تقریر پر وہ اس سے کہتا ہے کہ اگر وہ اپنے ان فرائض میں پوری طرح مشغول رہی تو وہ خود اُس کا سب سے زیادہ اطاعت کیش و وفاشعار غلام بن جائے گا۔

حیات ازدواجی کی ایک تصویر پلوٹارک کے صفحات میں بھی ملتی ہے۔ مگر وہ بہت آخر زمانہ کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بیوی کی حیثیت محض مکان دار یا داروغہ کی نہیں رہ گئی تھی بلکہ وہ شوہر کی زندگی میں اس کی شریک و سہیم ہو گئی ہے۔ اب شوہر یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہو اور وہ خود اُسے اس کے حقوق کی پُرزور طریقہ پر

تعلیم دیتا ہی۔ نکاح کا طریق و اسلوب جو وہ بیان کرتا ہے اُس کا بھی معیار اسی قدر بلند ہی جتنا موجودہ زمانہ کا ہے۔ بچہ کی وفات پر شوہر بیوی کے نام تعزیت نامہ لکھتا ہی جس کے حرف حرف سے محبت و الفت ٹپکتی ہے۔ اسی شوہر سے اور اس کے سُسرالی اعزہ سے کچھ بے لطفی ہوگئی تھی۔ بیوی کو خیال گزرا کہ کہیں اس کا اثر خود ان دونوں کے باہمی تعلقات پر نہ پڑے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے شوہر کو اپنے ہمراہ سفر پر آمادہ کیا۔ اسے لے کر مقدس پہاڑی کوہ ہیلیکون پر گئی۔ جہاں عشق کی دیوی کا مندر تھا۔ اس کے آگے قربانی چڑھائی اور دونوں نے مل کر یہ دعا کی کہ ان کی باہمی اُلفت و محبت تا زیست کبھی نہ کم ہو۔

بایں ہمہ بہ حیثیت مجموعی، باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا۔ اس کی زندگی مدۃ العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی جوانی میں اپنے شوہر کی اور بیوگی میں اپنے فرزندوں کی وراثت میں اس کے مقابلہ میں اس کے مرد اعزہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا حق اُسے قانوناً ضرور حاصل تھا۔ تاہم عملاً وہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھی کہ عدالت میں اس کا اظہار دینا یونانی ناموس حیا کے منافی تھا۔ البتہ وہ اپنے ساتھ جہیز ضرور لاتی تھی اور اپنی لڑکیوں کو بھی شادی کے وقت جہیز دینا اُس کے فرائض میں داخل تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ اثینیا کا قانون یتیم لڑکیوں پر خاص طور سے مہربان تھا۔ لیکن بس ان دو باتوں کے سوا اور کوئی شے حقوق نسواں کی تائید میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ فلاطون نے بے شبہ مرد و عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی۔ عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ ازدواج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ اس سے طاقتور اولاد پیدا ہو جو حفاظت ملک کے کام آئے۔ اور اسپارٹا کے قانون میں تو یہ تصریح موجود تھی کہ مُسن وضعیف القویٰ شوہروں کو اپنی کمسن بیویاں کسی نوجوان کے حبالۂ نکاح میں دیدینا چاہیئے۔ تاکہ فوج

یں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ یہ نقطۂ خیال گو جذبات محبت والفت کا قاطع تھا، تاہم اس سے اہل اسپارٹا میں ایک مردانہ حُبِّ وطن ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ ایسی اسپارٹن عورتوں کی بہ کثرت مثالیں موجود ہیں جنھوں نے وطن پرستی کے مذبح پر اپنی اولاد کو قربان کر دیا۔ اور جنھوں نے راہِ وطن میں اُن کی شہادت پر علانیہ اظہار فخر و مسرت کیا۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن یونانی تاریخ کے صفحات میں باعصمت گھر والیوں کے نام شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ ایک ایتھنیا کے سردار فوکیون کی بیوی اور گنتی کی چند اور بیویوں اور بیٹیوں کے ایثار کے واقعات بس یہی ساری یونانی تاریخ میں شریف گھر والیوں کے کارناموں کی کائنات ہیں۔ البتہ صنف نازک کے جس طبقہ کی تعداد کثیر نے اس وقت شہرت و امتیاز حاصل کیا وہ تمامتر دوسرے طبقہ کی عورتیں تھیں جن کا نام اوپر گزر چکا۔ یعنی باہر والیاں یا بازاریاں۔

اس طبقہ کو یونانی حیات اجتماعی میں جو مرتبہ حاصل تھا۔ اُسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تئیں ایک ایسی فضائے اخلاق میں موجود فرض کرنا چاہیئے جو موجودہ اخلاقی فضا سے بالکل متباین و متغایر تھی۔ تکملۂ اخلاق بشری کا تخیل یونانیوں کے ذہن میں یہ تھا کہ انسان بلا کسی زہد و رہبانیت کی آمیزش کے اپنے تمام قوائے فطری و عضا کے مقتضیات و مطالبات کو پورا کرتا رہے۔ اس قدر اُنھیں بلاشبہ مُسلّم تھا کہ انسانی قویٰ میں فرق مراتب ہے۔ اور یہ کہ ادنیٰ خواہشات کا دل و دماغ پر غالب آجانا دُونِ نفس کی علامت تھی۔ لیکن یونانی دماغ کے لئے یہ عقیدہ بالکل غیر مفہوم تھا کہ کسی فطری خواہش کو سرے سے دبائے رکھنا چاہیئے۔ مُقنّنین، حکما، اخلاق، اور عام افراد اس تخیل کے نہ صرف دل سے قایل تھے، بلکہ جہاں تک حیات جنسی کا تعلق ہے اس پر بے تکلف عامل بھی تھے چنانچہ اُن کے مقدس ترین اشخاص عادۃً بالاعلان ایسے افعال کے مرتکب ہوتے تھے جو ہمارے نقطۂ خیال سے بیحد معیوب و شرمناک خیال کئے جائیں گے۔

قطع نظر اس عام سبب کے کہ ایک جنس کی غیر محدود آزادی عموماً جنس مقابل کی سلب حُرّیت کا باعث ہوتی ہی۔ یونان میں اور بھی متعدد اسباب ایسے جمع ہوگئے جھنوں نے وہاں زنانِ بازاری کے مرتبہ کو اس قدر ممتاز کو بلند کردیا کہ دنیا کی کسی جماعت میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ عشق کی دیوی الفرد ڈایٹ کی پرستش نے گویا ان کے پیشہ پر مذہبی استناد کی مُہر لگادی تھی۔ اس کے مندر کی پجاریاں، زنانِ بازاریاں تھیں۔ اور کارنتھ کی درگاہ کے مُجاور بھی اسی طبقہ کی عورتیں تھیں، جن کی بابت روایت ہی کہ انھیں کی دُعاؤں سے شہر مصائب شدیدہ سے محفوظ و مصئون رہا۔ بلکہ منقول تو یہ ہے کہ بابل، بابیلس، سائپرس و کارنتھ میں عصمت فروشی، جزو مذہب بن گئی تھی۔ اور ان مقامات کے علاوہ، میطس، تیندوس، لیسبوس، و ابیڈوس عصمت فروشی کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے۔ جو معابد کے ظلِ عاطفت میں پروان چڑھ رہی تھی۔

مذہبی عنصر کے شمول کے علاوہ ایک اور بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ یونان میں حُسن پرستی کا جو مذاق رائج تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ اس خیال کی صورت میں ظاہر ہوا کہ جو سب سے زیادہ حسین ہی۔ وہ سب سے زیادہ معزز ہی مناظر طبیعی قدرتاً خوشنما، اہل صنائع حُسن کی مُرقع نگاری پر تُلے ہوئے غرض ہر شے حُسن و جمال کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتی تھی۔ دنیائے ادب کی جان حُسن ادا تھی۔ اہل صنعت کا کمال فن یہ تھا کہ نقاش یا سنگتراش حُسن صورت کی نقل کو اصل سے ملادے۔ مائیں اپنی دُعاؤں میں سب سے مقدم دعا یہ رکھتی تھیں کہ اولاد حسین پیدا ہو۔ خود اہل حکمت و مُعلمین اخلاق، فضیلت اخلاقی کی تعریف کے لئے پیرایۂ بیان یہ اختیار کرتے تھے کہ وہ نام ہے ایک غیر مادی و اکمل ترین حُسن و جمال کا۔ غرض ہر شعبۂ حیات میں حُسن و جمال کو انتہائی عظمت و احترام کا مُرادف سمجھا جاتا تھا، اور جو طوائفین ہوتی تھیں وہ گویا حُسن کی پُتلیاں ہوتی تھیں یہ اسی کا اثر تھا کہ عشق کی دیوی کا بُت، جو سارے ملک کا مرجع عظمت و عقیدت تھا، ایک طوائف کی شکل میں تھا۔ مشہور نقاش پریکزتیلس اپنی آشنا فرایني کے مجسمہ تیار کرتا تھا جس کا ایک

طلائی مجسمہ اپالو کے مندر میں بھی رکھا گیا۔ اس پر لوگوں نے غل مچایا کہ اس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑے جاتے ہیں اور بالآخر عدالت سے چارہ جوئی کی۔ فرائینی مدعا علیہا قرار پائی۔ لیکن عین دوران مقدمہ میں وکیل ہایپریڈیس نے دفعتہً اپنی پری جمال موکلہ کو حاکمان عدالت کے سامنے لاکر بے نقاب کر دیا۔ حکام اس کے فرط حسن سے مبہوت ہو گئے، اور ملزمہ کو فوراً بری کر دیا۔ اپیلیس اس زمانہ میں بہت مشہور نقاش تھا۔ سکندر اعظم نے اُسے اپنی خاص محبوبہ لائیس کا مجسمہ تیار کرنے کو بلایا۔ اپیلیس نے مجسمہ تیار کر دیا۔ لیکن اس اثنا میں خود بھی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کی محنت کا سب سے بڑا صلہ جو سکندر نے دیا وہ یہ تھا کہ خود لائیس کو اُس کے حوالہ کر دیا۔ اسی طرح اس وقت جو شخص پھولوں کی تصویر کشی کا سب سے بڑا اُستاد گنا جاتا تھا، اُسے اپنی صنعت میں کمال یوں حاصل ہوا تھا کہ وہ ایک پھول بیچنے والی لڑکی پر مفتوں تھا، اور پھولوں سمیت اُس کی تصویر کھینچا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس طرح اُس کو خاص پھولوں کی مصوری میں ماہر فن کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ پنڈار و سمونیڈس جیسے مشاہیر شعرا علانیہ طوائفوں کی مدح و ثنا میں قصائد کہتے تھے اور بڑے بڑے حکما و فلاسفہ زنان بازاری سے بالکل غیر مخفی راہ و رسم رکھتے تھے۔

ایسی حالت میں اگر اُس وقت کی اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ و بلند نظر خواتین زنان بازاری کی صف میں شامل ہو جاتی تھیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ پردہ میں مقید رہ کر سوسائٹی میں نام و نمود حاصل کرنا ناممکن تھا۔ درحقیقت سارے ایتھنیا میں جو عورتیں آزاد کہی جاتی تھیں، وہ صرف اسی طبقہ کی ہوتی تھیں اور وہ خود اس آزادی سے یہ فائدہ اُٹھاتی تھیں کہ اعلیٰ تعلیم و تربیت سے اپنی دلفریبیوں کی فہرست میں ایک اور عنوان کا اضافہ کر لیں۔ ان کے گرد ہر وقت مشاہیر شعرا، ماہرین فنون لطیفہ مورخین و فلاسفہ کا مجمع لگا رہتا تھا۔ یہ اُن کے علمی و ادبی مشاغل میں حصہ لیتی تھیں اور اکثر ان کا مکان ایک بہترین علمی صحبت کا مرکز ہوتا تھا۔ مشہور مدبر و خطیب پیریکلیس کی معشوقہ حسن و جمال کے ساتھ علم و فضل میں بھی یگانۂ روزگار تھی۔ بلکہ روایت تو یہاں تک ہے کہ پیریکلیس کو فن خطابت کی تعلیم اسی اسپیسیا نے دی تھی

اور اُس کے بہترین خطبات اسی کے املا کئے ہوئے ہوتے تھے۔ اہم ملکی معاملات میں یہ مشیر کا کام دیتی تھی، اور دیگر حکما سے قطع نظر کر کے خود سقراط اس کی مجلس میں شریک ہوتا تھا، اس سے بھی بڑھکر یہ کہ سقراط خود اپنی تعلیم کے لئے جس کا بہت زیادہ ممنون تھا وہ بھی ایک طوائف دیوٹیما تھی۔ اور اپیکورس (بانیٔ فرقۂ لذتیہ) کے ممتاز ترین تلامذہ بھی ایک طوائف لیونٹیم کا نام نظر آتا ہے۔

اسباب بالا کے علاوہ ایک اور سبب قوی بھی اُس وقت موجود تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہم ہچکچاتے ہیں۔ لیکن تاریخ نگاری کے فرایض پر رسمی شرم وحیا کا جذبہ غالب نہیں آسکتا اور اس لئے ہمیں بادل ناخواستہ ذکر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے ہماری مُراد محبت خلاف وضع فطری سے ہے۔ جو مرد و مرد کے درمیان پائی جاتی تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں زنا کاری یقیناً بسا غنیمت تھی اس بیہودگی کا پتہ ہومر وہیسیڈ کے صفحات میں نہیں چلتا، لیکن عام مردانہ ورزشوں کی کثرت نے جن میں مرد بالکل برہنہ ہوجاتے تھے۔ لوگوں کی طبیعت کو اس جانب مایل کردیا، تاآنکہ کچھ روز میں یہ عادت خبیث یونانی تمدن کے رگ و ریشہ میں سرایت کرگئی اور اس سے محترز رہنا ایک غیر معمولی زہد و اتقا کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی عنصر کی اس میں بھی آمیزش ہوگئی یعنی دیوتاؤں کے خُدّام۔ مردوں کی شکل میں دکھائے جانے لگے۔ اور بڑے بڑے صنّاع اپنی صنّاعیوں کا نمونہ انھیں کے مجسموں کی تعمیر میں ظاہر کرنے لگے۔ اصولاً اسے جواز کا مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ یہ ناجائز ہی قرار دیا گیا۔ لیکن عملاً یہ عادت اس قدر عام تھی کہ ہمارا وہم وگمان بھی وہاں تک مشکل سے پہنچ سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ سب سے پہلے یونانیوں نے اپنے جن ہموطنوں کے مجسمہ بطور یادگار نصب کرائے وہ ہارموڈیس واسوٹجیٹن وہ دو مرد تھے۔ جن کے درمیان یہی غیر فطری تعلق تھا[1]!

ہر بڑی بُرائی کے مقابلہ میں چھوٹی بُرائی قابل ترجیح ہوتی ہے۔ اغلام کے مقابلہ

---

[1] زینو، بانیٔ فرقۂ رواقیہ زہد و اتقا، خشک مزاجی و تعبس کی تصویر تھا۔ اُس کی بابت دیوجانس لیرٹیس نہایت مسرت سے لکھتا ہے کہ "وہ اغلام سے برائے نام شوق رکھتا تھا"، مشہور شاعر سوفکلس کو اس کا خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔

میں زنا کاری بدرجہا بہتر تھی، اسی سبب سے طوائفوں کا مرتبہ اتنا پست نہیں ہوتے پایا
جس کی وہ مستحق تھیں تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اخلاقی نظر سے وہ انتہائی پستی و تذلل کے غار
میں دھنسی ہوئی تھیں اور اُن میں شاذ و نادر ایسی نکلتی تھیں جنھیں ہم خانگیوں کے درجہ میں بھی
رکھ سکیں بیوفائی، حرص زر، شہوت پرستی وغیرہ جو اوصاف اس طبقہ کی عورتوں میں
عموماً ہوتے ہیں وہی اُن میں بھی تھے۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس کلیہ میں متعدد مستثنیات بھی
تھے۔ مثلاً ہارموڈیس کی آشنا لینا اس قدر با وفا تھی کہ پولیس کی سختیوں سے مرگئی۔ مگر
اپنے آشنا کے جرائم کا کسی طرح افشا نہ کیا۔ اس کی یادگار میں یونانیوں نے ایک شیر نی
کا مجسمہ نصب کرایا جس کے زبان نہ تھی۔ اسی طرح ایک اور طوائف بیک کس کی خوش اخلاقی
و ہر دلعزیزی بھی مشہور ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوسائٹی نے گھروالیوں اور بازاریوں کے چونکہ
فرایض و حدود عمل بالکل علیحدہ قرار دیدیئے تھے۔ اس لیئے بازاریوں سے اُن اوصاف
کی توقعات ہی نہیں رکھی جاتی تھیں جو گھروالیوں کے ساتھ مخصوص تھے اور نہ اُن سے
اُن کے پیشہ سے متعلق گفتگو کرنا کچھ معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ زنافن روایت
کرتا ہے کہ سقراط کے کان تک جب مشہور طوائف تھیوڈیٹا کے حُسن وجمال کا شہرہ پہنچا تو وہ
اس کی تصدیق کے لیے خود اُس کے مکان پر مع اپنے تلامذہ کے پہنچا۔ یہاں پہنچکر اُس نے
تھیوڈیٹا سے اُس کے نفیس مکان و سامان آرایش وغیرہ سے متعلق استفسارات کیئے۔ اور
جب ان کے جواب میں معلوم ہوا کہ یہ سب اسی پیشہ کی آمدنی سے ہوا ہے۔ تو سقراط نے طوائف
کو بجائے کسی قسم کی اخلاقی پند و موعظت کے اُس کے پیشہ کے فروغ کی تدابیر بکمال فصاحت
بیان کرنا شروع کیں۔ مثلاً یہ کہ اُسے چاہیئے کہ بدتمیزوں کو اپنے یہاں نہ آنے دے اپنے
عاشقوں کی بیماری میں عیادت کرے۔ اپنے چاہنے والوں کو خود بھی چاہا کرے۔ وقس علیٰ ہذا
اس لکچر کے خاتمہ پر یہ حکیم اعظم، طوایف کے حُسن وجمال کا اعتراف کرتا ہے اور بکمال سنجیدگی و متانت
واپس چلا آتا ہے!

ان ناخوشگوار واقعات کا ذکر مجھے اپنے فرائض کے خیال سے مجبوراً کرنا پڑا کہ بغیر ان کے تاریخ اخلاق اجمالاً بھی نامکمل رہ جاتی۔ اب ناظرین کے سمجھ میں یہ مسئلہ آگیا ہوگا کہ جس سرزمین سے اس قدر مشاہیر رجال پیدا ہوئے وہاں باکمال خواتین کیوں اس قدر کمیاب ہیں؟ اس دور کی یونانی اخلاقی زندگی کی اہم دفعات کو ہم بطور خلاصہ یوں رکھ سکتے ہیں:-

(۱) یونانی اخلاقیین کو بھی گو ہماری طرح جذبات بشری میں اصولاً فرق مراتب تسلیم تھا تاہم اس کی تعین میں ہمارے مطمح نظر سے انکا معیار اخلاق بالکل جداگانہ تھا۔

(۲) یہ مسیحی تعلیم کہ بجز نکاح کے اور ہر صورت سے مرد و عورت کا تعلق ناجائز ہے، یونانی دماغ کے لئے بالکل غیر معلوم تھی۔

(۳) بیویوں پر سخت فرائض و ذمہ داریاں عاید تھیں۔ شوہروں پر بھی یہ ذمہ داریاں عاید کی گئیں، مگر بہت ہلکی اور بہت آخر زمانہ میں۔

(۴) جرائم خلاف وضع فطری کی وہ گرم بازاری تھی، کہ ہم اُس کے سُننے کی بھی تاب نہیں لاسکتے۔

(۵) شادیوں کا رواج کم ہوتا گیا اور لوگ ناجائز تعلقات کھلے خزانہ رکھنے لگے۔

(۶) خانگیاں و بازاریاں، اگرچہ گھر والیوں کے مقابلہ میں عزت و عظمت کچھ بھی نہیں رکھتی تھیں تاہم جو کشش اُن میں تھی اور جو مقبولیت اُنھیں حاصل تھی اُس سے بیویاں بالکل محروم تھیں۔

فصل (۲)

رومہ کی اخلاقی زندگی کی فضلیت

رومی تمدن کی تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہاں کی اخلاقی زندگی یونان سے بدرجہا برتر تھی۔ یہ ہم کہیں پہلے کہہ آئے ہیں کہ عفت وعصمت کی خوبی پر دو مختلف پہلوؤں سے نظر کی جا سکتی ہے۔ ایک مادیت کے نقطہ خیال سے دوسرے روحانیت کے پہلو سے مادی پہلو جو اُن ممالک میں غالب ہی جہاں مذہبیت کم اور سیاست زیادہ ہی یہ ہی کہ نکاح اشرف الاعمال ہے کہ حکومت کا قیام نظام وفلاح اسی کے دم سے وابستہ ہی۔ روحانی عقیدہ جو ان ممالک میں شایع ہے جہاں سیاست کا زور کم اور مذہب کا غلو زیادہ ہی یہ ہی کہ شرم وحجاب اُم الفضائل ہے عورت کا مطمح نظر مدت العمر کی دوشیزگی ہونا چاہیئے اور نکاح دیگر بکارت شکن صورتوں کے مقابلہ میں غنیمت ہی۔ بس ٹھیک انہیں دونوں خیالات کی مطابقت میں رومہ میں دو مختلف مذہبی سلسلہ قایم تھے۔ ایک مردانہ سلسلہ تھا جس کے ارکان فلمین کہلاتے تھے دوسرا زنانہ سلسلہ تھا جو کنواریوں پر مشتمل تھا۔ دونوں کا انتہائی احترام وتقدس ملحوظ رکھا اور دونوں گویا مذہب کے کلید بردار سمجھے جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اول الذکر حرمت ازدواجی کا مظہر تھا اور آخر الذکر دوشیزگی وکنوارپن۔ پاک کنواریوں کے چھیڑنے والے کو سخت سے سخت ممکن سزائیں دی جاتی تھیں اور ہر فلمین کے لئے متاہل ہونا لازمی تھا بیوی کو وہ کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اور اگر بیوی فوت ہو جائے تو وہ اپنے عہدہ سے ہٹا دیا جاتا تھا۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں سلسلوں میں سے سلسلہ فلمین، رومی جذبات کا بہتر وصحیح تر ترجمان تھا۔ کیونکہ رومی مذہب تمامتر ایک خانگی مذہب تھا۔ اور قانون کا مدعائے خاص یہ تھا کہ رسم ازدواج کو ہر قسم کے شرف واحترام کا مرکز رکھا جائے۔

وحدت ازدواج کا دستور قدیم سے چلا آتا تھا اور پوری پابندی کے ساتھ، بلکہ یہ رومی ہی تمدن کا ایک احسان ہے کہ یورپ میں بھی یہی دستور رواج پا گیا۔ رومہ کے جو قدیم ترین افسانہ ہیں، اُن میں بھی عورت کے مرتبۂ عالی اور رومی زندگی میں اُس کے نمایاں حصہ لینے کی صاف تعلیم نکلتی ہے۔ لکریشیا و ورجینیا سے زیادہ کس نے دنیا میں ناموس شوہری کی حفاظت میں جانباری سے کام لیا ہے؟ یا سابی عورتوں اور کوریولینس سے بڑھ کر کون حب وطن کا ثبوت دے سکتا ہے؟ ایک مندر رومہ میں اُن خواتین کی یادگار میں تعمیر تھا جنھوں نے اپنی زلفیں کاٹ کاٹ کر سپاہیوں کو دیدیں تاکہ کمانوں کی ڈوریوں کا کام دے سکیں۔ ایک اور مندر ایک ایسی خاتون کے نام کو قایم کئے ہوئے ہے جس کی ماں قید خانہ میں گرسنگی سے ہلاک ہونے کے واسطے رکھی گئی تھی، مگر جس نے تن تنہا اندر جا جا کر اُسے اپنا دودھ پلا کر زندہ رکھا۔

عورت کا مرتبہ رومی قانون نے البتہ ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔ افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اُسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ جہیز یا دُلھن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اسقدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا۔ زمانہ مابعد یعنی دَور تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہو گیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل تک کر سکتا تھا۔ ۵۲۰ سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہیں سنا۔ آداب معاشرت اس قدر سخت تھے کہ ایک ممبر سینٹ کو محض اس جرم میں سزا ملی کہ وہ اپنی لڑکی کے سامنے اُس کی ماں یعنی اپنی بیوی کا بوسہ لے کر فحش کا مرتکب ہوا اور کسی ماں کے لئے اپنے بچہ کی رضاعت دایہ سے کرانا سخت توہین کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ خانگی زندگی کے جزئیات تک قانونی شکنجہ میں کسے ہوئے تھے۔ کسبیوں کا طبقہ گو بہ لحاظ تعداد بہت بڑا تھا لیکن نہایت ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے لئے جونو کے مندر کی قربان گاہ کو چھونا ممنوع تھا۔

اور اُن کے لئے سب سے بڑی لعنت یہی سمجھی جاتی تھی، کہ انہیں اپنی زبان سے اپنے شرمناک پیشہ کا اعتراف کرنا پڑے۔ ایک سرکاری افسر کی بابت یہ واقعہ منقول ہے کہ اُس پر حملہ ہوا مگر اس کا استغاثہ محض اس لئے غیر مسموع رہا کہ محل واردات ایک کسبی کا مکان تھا عورت کے ناموس وحیا پر تمام کارخانۂ فطرت گواہ سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے وحشی و خونخوار جانور باکرہ عورت کے سامنے سرنگوں ہو جاتے تھے۔ برہنہ عورت اگر کھیت کے گرد پھرتی توحشرات الارض مرجاتے۔ غرق شدہ مردوں کی لاش سیدھی تیرتی، لیکن غرق شدہ عورتوں کی لاش اوندھی تیرتی، جو بقول رومی سائنس دانوں کے عورت کی افضلیت کی دلیل تھی

ارسطو کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وحشیوں پر یونانیوں کی افضلیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اُن کی طرح یونانی اپنی بیویوں کو غلام نہیں سمجھتے بلکہ بہ طور اپنے رفیق و شریک زندگی کے رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دعویٰ بجائے یونانیوں کے رومیوں کے منہ پر زیادہ کھلتا ہے اور جیسا کہ ایک رومی مصنف نے لکھا ہے یہی ایک امر یونانی تمدن کے مقابلہ میں رومی تمدن کے شرف وفضل کے لئے بس کرتا ہے۔ بہ قول اس کے یونانیوں کا طرز عمل اپنی بیویوں کے ساتھ یہ تھا کہ انہیں اپنی محلسراؤں کے اندر مقید رکھتے تھے اور بجز اس کے اور کسی مرد کے ساتھ کھانے نہیں دیتے تھے۔ بہ خلاف اس کے رومی شوہر نے اپنی بیوی کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔ ہمیں اس امر کا صحیح علم نہیں کہ جس زمانہ میں رومی بیویاں تمامتر اپنے شوہروں کی مملوک ہوتی تھیں، اُس وقت خانگی زندگی میں مسرت کہاں تک رہتی تھی، لیکن یہ تقریباً یقینی ہے کہ ازدواجی خلوص و وفا شروع سے رومی زندگی کا جزو رہی ہے اور جس رومی مقنن نے نکاح کی یہ تعریف کی کہ وہ دینی و دنیوی حقوق کے دائمی اتحاد و اشتراک کا نام ہے اس نے اپنے ہموطنوں کے ہر دَور کے تخیل و طرز عمل کی صحیح ترجمانی کر دی۔

جمہوریت کے خاتمہ پر اور قیاصرہ کے عہد میں رومی اخلاق میں جو انحطاط عظیم پیدا ہو گیا اس کے اسباب اہم کا ذکر ہم کہیں پیشتر کر چکے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا جامع و ہمہ گیر تھا جو مذہب

معاشرت، سیاست، غرض ہر شعبۂ حیات میں سرایت کر گیا تھا۔ فلاسفہ کی تشکیک نے قدیم مذاہب کی جڑ کاٹ دی تھی مشرقی تعیش و مشرقی بداخلاقیوں کا ایک سیلاب آگیا تھا اور ایسی حالت میں زناکاری کے واقعات خاص طور پر نمایاں و کثیر التعداد ہو گئے تھے۔ غلاموں کی گھر گھر کثرت اور غلام بھی ایسے جو دنیا بھر کے آوارہ خاندانوں کے چھٹے ہوئے، یونانی و ایشیائی خانگیوں کا داخلہ، ہر گھر میں فحش تصاویر لگانے کا دستور، تھیٹروں میں ایکٹروں کی نہایت حیا سوز حرکات و اعمال، دولت و ثروت میں دفعۃً افزایش، استبداد حکومت کے باعث سیاسی مشاغل کا سدباب، ان تمام چیزوں نے مل ملا کر سیہ کاری کی وہ گرم بازاری کر دی، جس کی کوئی انتہا نہیں بے شبہ ایسے دور تاریخ میں بہت سے ملیں گے جنہیں فضائل اخلاق کا اس زمانہ سے بہت زیادہ قحط تھا لیکن ایسا کوئی زمانہ تاریخ پر ہرگز نہیں گذرا، جس میں رذایل اخلاق کی یہ کثرت و فراوانی رہی ہو، جو قیاصرہ کے عہد میں تھی یونانیوں کی شہوت پرستی پھر بھی غنیمت تھی، کہ کم از کم اس میں لطافت و نفاست تو تھی، لیکن یہاں تو یہ قیامت تھی کہ اس کا بھی پتہ نہ تھا بلکہ خاص قسم کی شقاوت و قساوت بھی شہوت پرستی و سیہ کاری کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ نوجوان سلاطین امرا و خوشامدی ارکان دربار سب کے سب اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور بڑے بڑے مصنفین و اہل ادب مثلاً مارٹیل، اپولس، ونیس و لوسین تک کے صفحات فحش سے لبریز ہیں!

اس زمانہ سے کچھ تو مذکورۂ بالا مخرب اخلاق موثرات کے اثر سے اور نیز اس سبب سے کہ معاصرانہ پبلک نظامات کا رجحان بھی اس جانب تھا ایک عام ہوا یہ چل گئی تھی کہ نکاح کی طرف سے لوگوں کو بے رغبتی و بے التفاتی ہونے لگی آگسٹس نے اسکے روک تھام کی بڑی کوشش کی، تجرد کے خلاف تعزیری قوانین نافذ کئے جو شخص تین بچوں کا باپ ہو ان کے لئے خاص انعامات تجویز کئے لیکن یہ ساری کوشش ناکام رہی اس زمانہ کی ایک تحریر دستیاب ہوئی ہے جو رسم نکاح کی حمایت میں کی گئی تھی اس کا ایک دلچسپ فقرہ یہ ہے:

"اے برادران وطن، اگر ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا کہ بغیر بیویوں کے رہ سکیں، تو ہم ہرگز اس تکلیف دہ شئے کو گوارا نہ کرتے لیکن چونکہ فطرت نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ نہ بغیر بیویوں کے گزر ہو سکتی ہے اور نہ اُن کے ساتھ کافی لطف حاصل ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں ہمیں اپنی تھوڑی سی بے لطفی گوارا کر کے آیندہ نسل کے بقاء و قیام کے خیال سے اس دستور کو جاری رکھنا چاہئے"

ایک طرف تو یہ اخلاقی انحطاط تھا لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو دوسری طرف قانون کی نظروں میں عورت کے مرتبہ کو ترقی ہو رہی تھی۔ پیشتر عورت کی زندگی یکسر غلامانہ تھی، لیکن اب اُسے اتنے حقوق حاصل ہو گئے جو پھر کبھی زمانۂ مابعد میں نہیں نصیب ہوئے۔ روم میں شروع سے ازدواج کے دو بالکل مختلف طریقے رایج تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ عورت کا ہاتھ شوہر کے ہاتھ میں دیدیا جاتا جو اس وقت سے ہر طرح پر اس کی جان و مال کا مالک ہو جاتا تھا۔ یہ طریقہ بہت مضبوط و مستحکم خیال کیا جاتا تھا اور جمہوریت کے زمانہ میں اسی کا عام رواج تھا۔ اس کی تین مختلف صورتیں تھیں ایک وہ جس میں کبھی علیحدگی ہو ہی نہیں سکتی تھی اور جو بالکل ایک مذہبی رسم تھی۔ دوسری ایک محض معاشرتی رسم تھی۔ اور تیسری کا مدعا یہ تھا کہ ایک عورت اور ایک مرد کو سال بھر کی مدت تک بغیر کسی دوسرے کے دخل و تصرف کے مباشرت کا حق حاصل رہتا تھا۔ جمہوریت کے خاتمہ کے ساتھ اس طریقۂ ازدواج کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اب ایک دوسرا طریقہ عام ہو گیا جس میں کوئی مذہبی یا معاشرتی رسم ادا نہیں کی جاتی تھی اور جس کے لئے صرف فریقین کی رضامندی کافی تھی۔ اس طریق ازدواج سے قانوناً عورت اپنے باپ ہی کے خاندان میں شامل رہتی تھی۔ شوہر کو اس پر کوئی حق نہیں حاصل ہوتا تھا۔ اور وہ قانونی حیثیت سے خودمختار رہتی تھی۔ ایک جہیز کو چھوڑ کر کہ وہ البتہ شوہر کے قبضہ میں چلا جاتا تھا اور باقی اپنی تمام جائداد کی مالک وہ خود رہتی تھی۔ اپنے باپ کی وراثت میں پورا حصہ پاتی تھی۔ غرض ہر حیثیت سے وہ آزاد و خودمختار رہتی تھی۔ اس دستور کا ایک خاص اثر یہ ہوا

کہ بڑی بڑی جایدادیں عورتوں کے قبضہ میں آگئیں، ملک کی ثروت کے بڑے حصہ کی وہ مالک ہوگئیں اپنے شوہروں پر حکومت کرنے لگیں۔ شوہروں کی حیثیت محض اُن کے کارکن یا کارندہ کی رہ گئی بلکہ مشہور تو یہاں تک ہے کہ اکثروں نے اپنے شوہروں کو گراں شرح سود پر قرض دینا شروع کیا۔

عورت کی اس قانونی آزادی اور جدید طریقۂ ازدواج کے دو خاص اثرات یہ ہوئے:

(۱) اوّل عورت کی عظمت میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ پہلے نظام خاندان کی بنیاد افسری و ماتحتی پر تھی، اب اشتراک معاونت پر قایم ہوگئی۔ قدامت پرست طبائع کو یہ قدرتاً ناگوار گزرا اور بعض قوانین ایسے منظور کرائے گئے جن کی بنا پر عورت کی آزادی کو محدود کرانے کی کوششیں کی گئیں لیکن ان قوانین کا بعض حالتوں میں نفاذ ہی نہیں ہوا اور جب کبھی ہوا بھی تو بعد چندے منسوخ بھی ہوگئے۔

(۲) دوسرا اور اہم تر اثر یہ پڑا کہ اب نکاح کا انحصار زن و شوہر کی موافقت پر رہ گیا جب اُن کی خوشی ہوتی شادی کرتے اور جب چاہتے افتراق کر لیتے اور اس طرح طلاق کی گرم بازاری ہوگئی۔ بات بات پر شوہروں نے اپنی بیویوں کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب جو اس معاملہ میں بہت ہی آزاد تھے اُن پر لوگوں نے اعتراض کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ "حضرت آپ تو چمڑے کی چمک دمک وخوش نمائی کو دیکھتے ہیں آپ کو یہ کیا خبر کہ جوتہ کے اندر کون سی کیل میرے پیر میں چبھ رہی ہے"! ایک عورت نے ۵ سال کے عرصہ میں ۸ شوہر کئے ایک اور عورت نے ۱۰ نکاح کئے۔ سب سے بڑھ کر سینٹ جروم کی یہ روایت ہے کہ ایک عورت نے جو ۲۲ شوہروں کے عقد میں رہ چکی تھی ایک تئیسواں نکاح کیا ایسے شخص کے ساتھ جو ۲۰ بیویاں چھوڑ چکا تھا اور یہ اُس کی اکیسویں بیوی ہوئی!! بڑے بڑے مشاہیر یہ کرتے تھے کہ جو عورت غیر کی منکوحہ پسند آگئی اُس کے شوہر پر دباؤ ڈالکر اُس سے طلاق دلا کر خود شادی کرلی۔ اکثر ایسے بھی تھے جو اپنے احباب و اعزہ کی خاطر سے خود اپنی بیویاں چھوڑ چھوڑ کر

اُنہیں بیاہ دیتے تھے طلاق کی اس غیر معمولی گرم بازاری کو تمامتر قانون مروجہ کا معلول نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں بہت بڑا دخل معاصرانہ بداخلاقیوں کو بھی ہوتا تھا جب طینت خراب ہوجاتی ہے اور طبیعت اخلاق شکنی پر مائل رہا کرتی ہے تو قانون ایک بہانہ بن جاتا ہے۔ اس بداخلاقی کے سیلاب کو اگر قانون دبانا چاہتا بھی تو نہیں دبا سکتا تھا۔ اگر اس وقت قانون نے طلاق کو جائز نہ کردیا ہوتا تو یہ لوگ یقیناً چوری چھپے آشنائیوں اور بدچلنیوں میں مصروف رہتے۔

میں جلد گزشتہ کی کسی فصل میں کہہ آیا ہوں کہ ماضی میں برخلاف زمانہ حال کے بہ مقابلہ رذایل کو مغلوب رکھنے کے فضائل کو اُبھارنے کی قوت زیادہ تھی اسی لئے اس وقت جہاں معاصی کی کثرت تھی وہاں اُن کے پہلو بہ پہلو محاسن کو بھی خوب فروغ رہتا تھا۔ اس کلیہ کی ایک اور شہادت اعمال متعلق بہ جذبہ جنسی میں ملتی ہے۔ آوارگی، بدچلنی، شہوت پرستی، شاہد بازی، و جرایم خلاف وضع فطری کی جس قدر گرم بازاری روما کے دربار میں تھی، آج یورپ میں کہیں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تاہم اس اخلاق شکنی کے سیلاب عظیم کے درمیان وفاداری، ناموس پرستی، عصمت طینتی کے بھی حیرت انگیز نمونہ بکثرت ملتے ہیں معاشرت کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آگسٹس کی لڑکیاں اور پوتیاں سینے پرونے کا کام کرتی تھیں اور اُس کی پوشاک کا اکثر حصہ اس کی بیوی اور بہن کے ہاتھ کا بنا ہوتا تھا۔ امور خانہ داری خصوصاً کپڑے بننے میں سلیقہ عورت کا خاص جوہر سمجھا جاتا تھا۔ علم و تعلیم کا چرچا خواتین میں بہ کثرت تھا اور ازدواجی الفت کا پیکر مجسم خواتین ذیل میں نظر آتا ہے۔ پامپی کی بیوی کارنیلیا، سنیکا کی دوست مارسیا، اور سنیکا کی والدہ ہلویا شمالی اٹلی کے متعدد شہر خصوصاً پیڈوا و بریسیا طبقہ نسواں کی عفت شعاری کے باب میں شہرت رکھتے تھے۔ اسی کے زمانہ میں ایک امیر لیڈی میلونیا پر جب ٹائبریس نے دراز دستی کرنا چاہی تو اُس نے اپنے شکم میں خنجر بھونک کر اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا۔

پورشیا[۵۱] (زوجہ بروٹس)، پالینا[۵۲] (زوجہ سینکا) اور آیریا[۵۳] (زوجہ پیٹس) سے بڑھ کر دنیا میں کس خاتون نے استقلال ناموس پرستی وجانبازی کی مثال پیش کی ہے؟ ناظرین ان کے مختصر حالات حاشیہ میں ملاحظہ کریں۔

شوہر کی وفات پر خودکشی کر لینا شوہر کی ساتھ از خود جلاوطنی میں چلے جانا اور نازک سے نازک موقع پر بھی شوہر کا ساتھ دیئے جانا یہ ایسے واقعات ہیں جن کے متعدد شواہد اسی زمانہ

۵۱ بروٹس جب انقلاب حکومت کے متعلق گہری سازشوں میں مصروف تھا تو اسے متفکر دیکھکر پورشیا کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ وہ بھی اس کی پریشانیوں میں شرکت کرے لیکن رازداری کی شرط بڑی سخت تھی۔ بروٹس کو اس کا کیونکر اطمینان ہو سکتا تھا کہ پورشیا کبھی اور کسی حالت میں اس کے راز کا افشا نہ کرے گی؟ اپنے استقلال وہمت کا ثبوت دینے کے لئے اس نے خود اپنی ران میں چھری ماری۔ اور اس امتحان ضبط میں جب پوری اُتر چکی جب جاکر اس نے اپنے شوہر سے محرم راز بننے کی خواہش کی۔

۵۲ سینکا جب ظالموں کے ہاتھ سے مارا گیا ہے تو پالینا نے معًا اپنی وریدوں کے منہ بھی کھولدیے تاکہ خون نکلتے نکلتے خود بھی وفات پا جائے۔ خون کی دہار جاری ہوگئی اور بہت سا خون نکل گیا اس وقت اس کے غلاموں کی نظر پڑی۔ انہوں نے جھپٹ کر وریدوں کے منہ بند کئے اور زخم کی مرہم پٹی کی۔ مگر پالینا کو اس سے جو لاغری و نقاہت ہوگئی تھی وہ مدت العمر قایم رہی۔

۵۳ پیٹس کو یہ حکم نادری ملا کہ اپنے ہاتھ سے اپنے تئیں ہلاک کرے اور خنجر ہاتھ میں دے دیا گیا۔ آیریا وہاں موجود نہ تھی جو نہی اُسے یہ خبر پہنچی اس ارادہ سے چلی کہ شوہر کے ساتھ ہی اُس کے پہلو بہ پہلو اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کرے گی اعزہ نے بہت روکنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ داماد نے آکر عرض کیا کہ "اگر مجھے سزاے موت کا حکم ملے تو کیا آپ اپنی لڑکی کی خودکشی جائز رکہیں گی"؟ اس جوانمرد خاتون نے جواب دیا کہ "بیشک اگر اُسے تمہارے ساتھ ایسا ہی چین اور سُکھ مل چکا ہو جیسا مجھے اپنے شوہر سے ملا ہے"۔ جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو اعزہ نے اُسے کمرہ میں بند کر دیا۔ یہاں اس نے اپنے سر کو دیوار پر اس زور سے دے مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑی اور ہوش میں آتے ہی کہا کہ مجھے عزت کی موت سے روکتے ہو تو ذلت کی موت سے تو نہیں روک سکتے"۔ بالآخر صفیں چیرتی ہوئی اُس مقام پر پہنچی جہاں پیٹس خنجر بکف کھڑا ہوا تھا اور حب حیات ہاتھ کو جنبش نہیں ہونے دیتا تھا آیریا نے اسکی کشمکش دیکھ کر معًا وہ خنجر اُس کے ہاتھ سے لے کر اپنے سینہ میں بہونک لیا اور وہی خوں افشاں خنجر اُسکے ہاتھ میں دے کر بولی کہ "دیکھا پیارے پیٹس اس میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی"۔

کی رومی بیویوں میں ملتے ہیں۔ رومی تاریخیں اس طرح کے متعدد تذکروں سے پُر ہیں اور اُن سے زیادہ بلیغ وہ یادگاری کتبات ہیں جن میں بیوی کی عاشقانہ ووالہانہ وفاداری کو ان کا سب سے بڑا جوہر دکھایا گیا ہے۔ رومی تابوت سنگین پر جو تصویر کھنچی رہتی تھی اس سے زیادہ پُراثر مرقع اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ یہ کہ میاں بیوی دونوں نہایت سکون کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ گویا جس طرح زندگی میں دونوں ایک جان دو قالب رہے اُسی طرح موت بھی آنہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔

شہنشاہیت کے آخری دَور میں حکومت نے سیہ کاریوں کا سدّباب کرنا چاہا۔ چنانچہ ڈومیٹین نے جرایم خلاف وضع فطری سے متعلق تعزیری قانون نافذ کیا، وسپیسین نے دربار کے تعیش کو گھٹایا، میکرینیس نے زانی وزانیہ کو ایک میں بندھوا کر زندہ جلائے جانے کا حکم دیا، مرد وعورت کے ساتھ نہانے کے دستور کو ہیڈرین والگزنڈر سیورس نے کم کیا اور قسطنطین نے بالکل بند کر دیا۔ اور دلالوں اور میر شکاروں کے قلع قمع میں الگزنڈر سیورس وفلپ نے پوری سرگرمی سے حصّہ لیا۔ یہ تمام بیہودگیاں انٹونانیس کے عہد کے بعد سے ازخود بہت گھٹ گیئں تاہم اُن کے استیصال میں بہت بڑا دخل اس امر کو ہے کہ پایۂ تخت رُوم سے قسطنطنیہ کو منتقل ہو گیا اور مسیحیت نے بڑا اصلاحی اثر ڈالا۔

خالص اخلاقی حیثیت سے اس دَور میں جو تغیرات ہوئے اُن میں سے ایک اہم تغیر یہ تھا کہ شروع میں جو وفا شعاری صرف بیوی کے لئے مخصوص تھی وہ اب شوہر پر بھی واجب سمجھی جانے لگی۔ یونانیوں میں یہ خیال بیشک ابتدا سے موجود تھا لیکن رومیوں کے ذہن میں اگر یہ تخیل تھا بھی تو کم ازکم اس پر عمل کبھی نہیں تھا۔ زناکاری کا مفہوم ان کے یہاں صرف اسقدر تھا کہ بیوی نے امانت میں خیانت کی لیکن اب یہ صورت حال تبدیل ہو گئی۔ ارسطو تو شروع ہی سے اس کا مؤید تھا لیکن اب پلوٹارک و سینکا بھی پوری قوت وزور کے ساتھ یہی تعلیم دینے

لگے کہ شوہر پر حقوق کے ساتھ فرائض بھی عاید ہیں اور جسقدر بیوی پر ازدواجی امانت داری فرض ہے اسی قدر شوہر پر بھی۔ انٹونینس پی اس نے ایک عورت کے مقدمہ کے فیصلہ میں اس کے شوہر کے استغاثہ پر یہ فقرہ کیا خوب لکھا کہ

"ہاں اس عورت پر زناکاری کی حد ضرور جاری کی جاسے بشرطیکہ یہ ثابت ہوجاسے کہ تم نے خود اپنی زندگی سے اُسے وفاداری وامانت کا سبق دیا ہے۔ بیوفا شوہر کو بیوی سے وفاداری کی توقع رکھنے کا کوئی حق نہیں۔"

اسی زمانہ کی ایک خاتون زوجہ سیپیو کا یہ ایک پُراثر واقعہ منقول ہے کہ اُس کا شوہر ایک لونڈی پر فریفتہ تھا جب شوہر کا انتقال ہوگیا تو اُس نے لونڈی کو بھی یہ کہکر فوراً آزاد کردیا کہ میں اپنے پیارے شوہر کی معشوقہ پر حکومت نہیں کرسکتی۔

دوسرا اہم تغیر فلسفۂ فیثاغورث وفلاطونیت جدید کے اثر سے یہ ہوا کہ عصمت وعفت قطع نظر اپنی مفید نتائج کے بجاسے خود مستحسن ومحمود سمجھی جانے لگی۔ ورنہ بیشتر بت پرستوں کا یہ عام اعتقاد تھا کہ بے عصمتی صرف ازدواج کے بعد معیوب ہے کہ اس سے نظام خاندان میں ابتری پھیلتی ہے کیٹو دسسرو وغیرہ کے نزدیک قبل ازدواج کے کسی بدچلنی میں عیب نہ تھا۔ خود سسرو کی تقریر کا یہ فقرہ موجود ہے۔

"اگر ہم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ نوجوانوں کو طوایفوں کی صحبت سے بالکل محترز رکھنا چاہیئے تو میں کہوں گا کہ اس کا خیال بہت ہی سخت ہے آج تک کس نے اس کی پابندی کی ہے؟ اور آج کل کیا قدما میں کب کوئی اس خیال کا گزرا ہے؟ کب اور کس زمانہ میں کسی نے اس کے جواز پر شبہ کیا ہے؟"

خود اپکٹیٹس جیسا خشک فلسفی بھی اسے کچھہ زیادہ معیوب نہیں قرار دیتا۔ اور الگزنڈر سیورس جو بدچلنیوں کے انسداد میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، جب کسی ناکتخدا شخص کو صوبہ کی گورنری تفویض کرتا تھا تو جہاں اُس کے خدام وغیرہ کا انتظام کرتا تھا وہاں اُس کے لئے ایک

کنیز کا بھی اہتمام کر دیتا تھا کیونکہ بہ قول مورخین کے بلا اس کے گزر ممکن ہی نہ تھا۔

اس عام حالت کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ بعض مثالیں اس کے مخالف بھی ملتی ہیں جو گو شمار میں قلیل ہیں تاہم وزن سے خالی نہیں۔ موسونیس روفس اس کی بالتصریح ڈیرزور تعلیم دیتا تھا کہ بجز نکاح کے تمام تعلقات مابین مرد و عورت ناجائز ہیں۔ ڈیوان کریز وسم چاہتا تھا کہ طوایفوں کا پیشہ قانوناً ممنوع قرار پا جاوے۔ اپولونیوس نے ساری عمر اس خیال سے تجرد میں گزاری کہ ازدواج بھی اخلاق کے اعلیٰ معیار سے پست ہے۔ بلکہ زنوبیہ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت پر راضی نہ ہوئی بجز اس صورت کے جب ایسا کرنا ولیعہد سلطنت کو وجود میں لانے کے ضروری ہو گیا۔ ہاپیشیا کی گو شادی ہو گئی تھی تاہم وہ عمر بھر باکرہ رہی یعنی شوہر کو کبھی اپنے ساتھ صحبت نہ کرنے دی۔ تیسری صدی میں یہ خیال ان لوگوں میں عام ہو گیا تھا کہ ازدواج بھی ایک دنیوی آلایش ہے اور آلایش دنیوی سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاہیئے۔ مارکس آریلیس و جولین دونوں کی بیویوں کا انتقال ہو گیا تھا اور دونوں بڑے پاکباز و متقی تھے تاہم اتقاء کے تخیل میں اس عرصہ میں اتنا فرق ہو گیا تھا کہ مارکس آریلیس نے ایک کنیز رکھ لی۔ بہ خلاف اس کے جولین نے بقیہ عمر بالکل تجرد میں گزار دی۔

فصل (۳)

مسیحیت کا اثر

واقعات بالا سے جنہیں یہاں بغیر کسی جرح و تنقید کے صرف نقل کر دیا گیا ہے ناظرین کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ ابتداء رومہ کے جذبات اس بارہ میں کیا تھے اور اب انہیں رفتہ رفتہ کیونکر ترمیم ہوتی جاتی تھی۔ اس تغیر و ترمیم میں مشرقی مذاہب فلسفہ کی کافی تائید شامل تھی تاہم اس میں سب سے زیادہ دخل جس شے کو تھا وہ مسیحیت تھی۔ مسیحیت نے عصمت

کو اُمّ الفضائل قرار دیا تھا اور عملاً اسے قایم رکھنے کے لئے ہر طرح کی تدابیر و وسائل سے کام لیا تھا۔ سلاطین نے اس باب میں سخت سے سخت قوانین نافذ کئے۔ میر شکاروں کے لئے یہ سزا قرار پائی کہ پگھلا ہوا سیسہ انھیں پلایا جانے لگا۔ زنا بالجبر کے جرم میں زانی اور اگر زانیہ کی کچھ بھی رضامندی پائی گئی تو اس کی بھی سزا موت قرار پائی۔ ایکٹرسوں کو اس کی اجازت مل گئی کہ بپتسمہ لینے کے بعد فوراً اپنا پیشہ چھوڑ سکتی ہیں۔ رقاصہ لڑکیوں کے پیشہ کو پہلے تو پادریوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پھر آخر میں اُسے بند ہی کرا دیا۔

مسیحی قانون کی تائید مسیحی شریعت نے کی۔ بے عصمتی سخت سے سخت عذاب کی مستحق قرار دی گئی۔ جرایم خلاف وضع فطری کرنیوالے اور وہ مائیں جو اپنی لڑکیوں کو طوایفوں کے پیشہ میں شامل کراتی تھیں حصول تبرکات سے محروم کر دی گئیں۔ مردوں کی تخیل پر کنواری شہیدان کلیسا کے تقدس واحترام کی تصویر کا بیحد اثر پڑا۔ غریب خادمہ بلینڈینا جو لیانس میں شہید ہوئی اُس سے روشن تر زندگی کس کی ہوگی؟ یا سینٹ پرپیٹوا کی عین شہادت کے وقت جو واقعہ پیش آیا وہ کس قدر موثر ہے! یہ پاک و معصوم کنواری جب ایک سانڈ کے آگے ہلاک ہونے کو ڈال دی گئی اور اُس نے اپنے سینگوں سے اُچھال کر اُسے اکھاڑہ کی زمین پر پھینک دیا تو اس حالت بیہوشی و نزع میں جو کام اس خاتون نے کیا وہ یہ تھا کہ جلدی سے اپنی پوشاک برابر کر لی کہ بے پردگی نہ ہونے پائے۔

یہ تو تاریخی واقعات تھے، لیکن ان کے پہلو بہ پہلو صدہا قصہ و افسانہ بھی ایسے مشہور ہو گئے، جو اگرچہ روایۃً بالکل ناقابل اعتبار ہیں تاہم اُن سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کی تخیئل اب کن روایات کو قبول کرنے کے لئے مستعد تھی ان میں سے ہم بعض یہاں نقل کرتے ہیں سینٹ جروم کی روایت ہے کہ ڈایوکلیٹین کی تعدیوں کے زمانہ میں ایک نوجوان مسیحی ریشمی ڈوریوں میں کسا ہوا ایک نہایت خوشنما باغ کے اندر تنہا بیٹھا ہوا تھا، جہاں ہر قسم کا سامان عیش و عشرت موجود تھا اتنے میں ایک حسین طوایف آئی اور لگاوٹ کی باتیں کرنے

لگی مگر مسیحی نے اُس کے سارے اظہار عشق کا جواب یہ دیا کہ اپنی زبان دانتوں سے کاٹ کر اُس کے اوپر تھوک دی۔ بعض مسیحی نوجوان عورتوں کا بھیس بدل کر اُن عورتوں کے ہاں جاتے تھے جنہیں مجبورًا طوایف کا پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا اور اپنا لباس انھیں پہنا کر انہیں آزادی دلا دیتے تھے۔ خاتون سینٹ اگنیس کی بابت یہ روایت تھی کہ جب اُسے برہنہ کر کے اُس پر تازیانوں کی مار پڑنے لگی تو ہر شخص نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر ایک نوجوان اسے دیکھتا رہا۔ اس بیحیائی کی سزا اُسے یہ ملی کہ بصارت جاتی رہی۔ ایک اور خاتون کے سینہ میں پھوڑا پیدا ہوا اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ کسی طبیب کو دکھائے آخر اسے خدا نے خود بخود اچھا کر دیا۔ بدچلن عورتوں اور شیاطین میں خاص تعلق سمجھا جاتا تھا۔ ایک عورت کے سر پر آسیب تھا اُسے ایک سینٹ کے پاس لائے۔ اُس نے فورًا بتا دیا کہ اُس کا کوئی آشنا موجود ہے۔ ایک طوائف نے ایک اور سینٹ پر اتہام لگایا کہ وہ اُس کے عاشق ہیں مگر خرچ نہیں دینے کو کبھی وہ نہیں دیتے۔ سینٹ موصوف نے جب یہ سنا تو رقم مطلوبہ تو فورًا ادا کر دی مگر ساتھ ہی طوائف کے سر پر آسیب بھی آگیا۔ متعدد خواتین جو آگے چلکر سینٹ ہوئیں ابتدا طوائفیں تھیں سینٹ ڈیٹلیس ہر شب کو اپنے ہمسایہ کے طوائفوں کے یہاں جاتے تھے انھیں روپیہ دیکر اس کا عہد لیتے تھے کہ وہ کم از کم اس رات کو حرام کاری سے محترز رہیں گی۔ اور خود اُن کے حق میں دعا کرتے تھے۔ سینٹ سراپن کی بابت یہ روایت منقول ہے کہ جب وہ مصر میں دَورہ کر رہے تھے تو ایک طوائف نے انھیں اپنے پاس بُلایا۔ یہ وقت مقررہ پر اُس کے پاس گئے۔ مگر یہ کہا کہ میں ایک شغل سے فارغ ہو لوں تو مخاطب ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے زانو کے بَل کھڑے ہو کر بآواز بلند اپنے اور اپنے میزبان کے حق میں بہ کمال تضرع و الحاح دعا مانگنا شروع کر دی۔ اس منظر سے طوایف بغایت متاثر ہوئی، یہاں تک کہ اُسکے آنسو نکلنے لگے اور وہ خود بھی سینٹ کے ہمراہ زانو ٹیک کر دعا مانگنے میں شریک ہو گئی۔ سینٹ کا خضوع و خشوع بڑھتا گیا اور لہجہ و آواز میں زیادہ رقت و درد پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ ساری شب اسی عالم

میں گزر گئی اور جب صبح طلوع ہونے لگی تو طوائف نیم مردہ ہو کر سینٹ کے قدموں پر یہ چلاتی ہوئی گر پڑی کہ "میں اپنے سارے گناہوں پر توبہ و استغفار کرتی ہوں مجھے ﷲ بچا لو"

لیکن رہبانیت کے یہ اثرات جہاں ایک طرف عصمت و عفت کی ترقی دینے کے حق میں نہایت مفید تھے، وہاں دوسری طرف نکاح کی وقعت کو بھی لوگوں کی نظر میں بہت گھٹانے والے ثابت ہوئے اس وقت کے سارے پادریانہ لٹریچر کے ضخیم دفتر میں صرف دو تین اقوال نکاح کی تائید میں ملتے ہیں ورنہ عموماً یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ازدواج ایک طرح کی معصیت ہے جو صرف اس لئے جائز ہے کہ اس کے وساطت سے آدمی بزرگ تر معاصی سے محفوظ رہے نیز اس لئے کہ بقائے نسل ہو ورنہ تقویٰ تو اسی میں ہے کہ انسان ہمیشہ مجرد رہے اس نقطۂ خیال سے اوّلاً تو نکاح فی نفسہ معیوب تھا اور پھر اگر کہیں ہو بھی جاتا تو اس کی کوشش ہوتی، کہ افتراق ہو جاسے اور یہ بھی نہ سہی تو میاں بیوی تو بہر حال اتنا تو ہو کہ میاں بیوی ہمبستری سے محترز رہیں بشہنشاہ روم ہنری ثانی، شاہ انگلستان ایڈورڈ کنفسر، و شاہ اسپین الفانسو ثانی ان سب کی شادیاں اس اُصول پر ہوئیں۔ اس سلسلہ میں گال کے ایک نوجوان امیر کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ شادی کی پہلی رات کو اُس کی محبوبہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے کہا کہ "میں نے ہمیشہ باکرہ رہنے کا عہد کیا ہے اور شادی صرف تمہاری محبت کی خاطر سے کی ہے" عاشق شوہر نے کہا کہ مجھے تیرے عہد کا پاس ہر طرح منظور ہے۔ چنانچہ سالہا سال گزر گئے اور عاشق و معشوق دونوں اپنے عہد پر قایم رہے۔ اس کے بعد جب بیوی کا انتقال ہو گیا اور شوہر اُسے قبر میں اُتارنے لگا تو بہ کمال متانت کہا کہ "پروردگار! میں نے اُسے جس طرح باکرہ پایا تھا اوسی طرح باکرہ تجھے واپس کرتا ہوں" اس پر عورت کی لاش متبسم ہوئی اور بولی کہ "جس شے کی بابت تم سے سوال نہیں کیا جاتا اُس کا کیوں اظہار کرتے ہو" کچھ روز کے بعد جب شوہر کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ علیحدہ مدفون ہوا، تو ملائکہ نے اس کا تابوت اُٹھا کر اُس کی بیوی کے پہلو میں رکھ دیا۔ بہت سی مثالیں ایسے لوگوں کی بھی ملتی ہیں جو اپنی بیویوں کو چھوڑ کر

صحرانشین ہوگئے۔ اور بہت سے ایسے افراد بھی گزرے ہیں جنھوں نے گو اپنی بیویوں کو باضابطہ طلاق نہیں دی لیکن اُن سے کسی قسم کا تعلّق بھی نہیں رکھا۔ بعض ایسے مصنّفین جن کی شادی ہو چکی تھی فضیلت تجرّد پر تصانیف لکھتے اور اپنی ذاتی بدقسمتی پر سخت ماتم کرتے۔

ان عقاید وتعلیمات سے خانگی زندگی میں سخت ابتری پھیل گئی اور اس خوف سے دانشمند مقتدایان کلیسا نے یہ فرمان جاری کر دیا کہ جب تک میاں بیوی دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتا ہے لیکن جو راہبانہ نصب العین چل پڑا تھا وہ اس فرمان سے نہ بدل سکا اور وہ مدّتوں کسی نہ کسی شکل میں گرجا پر محیط رہا۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں صدیوں تک یہی اعتقاد قایم رہا کہ کسی مذہبی رسم وجشن میں شریک ہونے کی رات سے پیشتر زن وشو کو ہمبستری سے محترز رکھنا چاہیے اور اگر کوئی اس کے خلاف کرے گا تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔ چنانچہ خوش اعتقادی نے ایسی عورتوں کی مثالیں بھی گنادیں، جنھوں نے اس شرط کو پورا نہیں کیا اور اس کی پاداشس میں دنیا ہی میں انھیں سزا مل گئی اور بارہویں صدی میں آلبیرک نے خواب میں جہنم کا وہ پرہیبت منظر دیکھ لیا جس میں طرح طرح کے دردناک و دہشتناک عذاب اُن لوگوں کے لئے تیار ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہونگے۔

ازدواج کو اس راہبانہ نظر سے دیکھنے کے دو اور خاص اثرات پیدا ہوے۔ ایک یہ کہ عقد ثانی بالکل ممنوع قرار پا گیا اور دوسرے مقتدایان کلیسا میں تجرّد کا شوق بہت پیدا ہو گیا۔ ان میں سے اوّل الذکر یعنی عقد ثانی کی کراہت کا پتہ قدیم رومیوں کے ہاں بھی چلتا ہے جن کا خیال یہ تھا کہ مرد کو بیوی کے ساتھ اس درجہ اُلفت وشیفتگی ہونا چاہیے کہ اس کی موت کے بعد دوسری شادی کا تصور بھی دل میں نہ لانا چاہیے۔ ورجل، ٹیکیٹس، وغیرہ کے صفحات میں جا بجا یہ خیال پایا جاتا ہے۔ ایک اور رومی شاعر کہتا ہے کہ ”بیوی کی زندگی میں اس سے محبت رکھنا ہماری راحت ہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد اس محبت کو قایم رکھنا ہمارا مذہبی فرض ہے۔“ اس رومی خیال کی پابندی عملی زندگی میں بیوی کے اوپر نہایت لازمی تھی لیکن

شوہر ہر چند ان ضروری نہ تھی اور جہاں کہیں تھی بھی تو صرف اس بنا پر کہ اگر اس کے اولاد موجود ہے تو سوتیلی ماں کے آنے سے اُسے تکلیف ہوگی۔

رومیوں کے اس خیال کو مسیحیت نے بیحد تقویت دیدی۔ گو اس نتیجہ کے مقدمات اُن کے پاس بالکل مختلف تھے، پہلے شوہر کی محبت کا اُن کے یہاں کہیں ذکر بھی نہ تھا۔ اُنھوں نے اس رسم کی جو مخالفت کی تو اس بنا پر کہ اُن کے نزدیک عقد ثانی و ثالث کے محرکات صرف جذبات شہوانی ہو سکتے تھے بعض گروہوں نے تو اُسے بالکل ممنوع ہی قرار دیدیا۔ لیکن گروہ کثیر جس نے اسے جائز رکھا اُس نے ہی بہ اکراہ اور بادل ناخواستہ، ایک پادری صاحب کا مقولہ تھا کہ عقد ثانی ایک دوسرا نام ہے زناکاری کا۔ ایک اور پادری صاحب فرماتے ہیں کہ "عقد ثانی کرنے والے کی نجات تو مسیح کی سفارش سے ہو جائے گی، لیکن اُسے مسیح کی خوشی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی"۔ اس طرح کے اور بہت سے اقوال موجود ہیں۔ مذہبی مراسم کے مقتدا، بعض مخصوص حالات میں وہ لوگ ہو سکتے تھے جو خود پادری نہ تھے، لیکن جو شخص عقد ثانی کا مرتکب ہو چکا ہوتا وہ کبھی اور کسی حالت میں یہ اعزاز نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ غرض اس طرح عقد ثانی مسیحیوں کے یہاں گویا بالکل ممنوع ہو گیا۔

اب دوسرے اثر یعنی ارباب کلیسا کے تجرد کو لیجئے، جس پر میری گفتگو لا محالہ بہت مختصر ہوگی کیونکہ یہ موضوع ایسا ہے جس پر بہت بڑی بحث بھی شاید کافی نہ ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قابل لحاظ یہ حقیقت ہے کہ گو ازدواج کا جواز شروع سے مقتدایان مسیحیت کے لئے موجود تھا تاہم ازدواج کی کراہت بھی شروع سے مسلم تھی اور کلیسا کی مقدس جماعت کا دامن خصوصًا اس کراہت سے پاک رہنا چاہئے تھا۔ یہ خیال ان دو تفریعات کی شکل میں ظاہر ہوا اوّل یہ عام اعتقاد کہ پادریوں کے لئے عقد ثانی یا عقد بیوگان قطعًا ناجائز ہے یہ اعتقاد اوائل مسیحیت سے موجود تھا اور متعدد صدیوں تک قایم رہا۔ ثانیًا یہ خیال کہ پادریوں کے لئے یہ شرط تقویٰ ہے، بلکہ آگے چلکر تو یہ اُن کے فرائض میں داخل ہو گیا کہ اپنی بیویوں کے ساتھ ہمبستری

سے محترز رہیں۔ شروع شروع میں یہ شرط لازمی نہیں قرار پائی لیکن چوتھی صدی میں پادریوں کے لئے تاہل ایک جرم قرار پا گیا۔ تاہم شادی کا دستور عملاً مسدود نہ ہو سکا، بلکہ بڑے زور شور سے جاری رہا۔ کلیسا نے اس بارہ میں جو عجیب و غریب مختلف طرز عمل اختیار کئے اُن کے مطالعہ سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ تجرد سے کیا کیا نقصانات پیدا ہوتے رہے ہیں بعض ناواقفوں کا خیال ہے کہ اصلاح کلیسا سے ذرا پیشتر جو بداخلاقی خانقاہوں میں شایع تھی وہ عدیم النظیر تھی، لیکن دراصل یہ خیال بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جن لوگوں نے چند صدیوں پیشتر کے کاغذات و مواد تاریخی کا براہ راست مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آٹھویں صدی سے لیکر بارہویں صدی تک جو بداخلاقی و بدچلنی رایج رہی اُس سے زاید ہرگز بعد کو نہیں ہوئی خصوصاً دسویں صدی میں تو خود پاپاؤں کی زندگی فسق و فجور کی زندگی ہوتی تھی بدچلنی و رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ وحشی سردار نو عمری میں متاہل ہو کر ضبط نفس بالکل کھو بیٹھتے تھے اور کلیسا کے مقتدی بن بن کر طرح طرح کی حرام کاریوں میں مصروف رہتے تھے بہ قول دسویں صدی کے ایک اطالوی پادری کے، اگر فطری اصول کے نظر سے دیکھا جاوے تو ایک پادری ہی اپنے عہدہ کا اہل نہیں ملتا۔ پادریوں پر ایک خاص ٹیکس اس معاوضہ میں لیا جاتا تھا کہ انہیں کنیزوں کے رکھنے کی اجازت رہے۔ شادی کی اب بھی بعض استثنائی صورتوں میں اجازت مل جاتی تھی لیکن متعدد مجلسان کلیسا اور بڑے بڑے مشاہیر پادریوں نے اسے اصولاً بالکل ناجائز ہی رکھا اور اس سے بداخلاقی کو جیسی تحریک ہوتی رہی وہ اظہر من الشمس ہے۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی طرز زندگی کو فاسقانہ سمجھ لیتا ہے تو پھر اُسے کسی گناہ میں باک نہیں رہ جاتا۔ پاپاؤں نے جب بار بار کہہ کے پادریوں کی نظر کے سامنے اُن کی زندگی کو فسق و فجور کا مجسمہ بنا دیا تو ان کی زندگی واقعۃً بھی ایسی ہی ہو گئی۔ خود پاپائے اعظم جان بست و سوم جو زناکاری اور خود اپنی ماں بہن کے ساتھ زنا کاری کے مرتکب ثابت ہوئے کینٹربری کے اُسقف جو ۱۱۷۱ء میں صرف ایک موضع میں ۷۰ ناجائز بچوں کے والد نکلے! اسپین کے

ایک اُسقف جو ۱۱۳۰ء میں ۲۔ کنیزیں رکھے ہوئے تھے ہنیری سوم سینٹر کے پادری جن کی ۶۵ ناجائز اولادیں ۱۲۷۴ء میں نکلیں! ان سب کو مستثنیات سمجھ کر تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع نظر بھی کر لیجئے۔ تاہم اسے کیا کیجئے گا کہ اس زمانہ کے پادریوں کی عام بدچلنی و شہوت پرستی کے ثبوت میں مستند شواہد کے دفتر کے دفتر موجود ہیں۔ اچھوتیوں کی خانقاہیں اب خانقاہیں نہیں رہی تھیں، بلکہ حرامکاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے، حرام کاری و شہوت پرستی کے جوش میں محرمات و غیر محرمات کی تمیز اُٹھ گئی تھی، چنانچہ بار بار اس طرح کے قوانین کی نفاذ کی ضرورت پیش آتی رہی کہ پادری اپنی ماؤں اور بہنوں سے الگ رہیں۔ اغلام اور شاہد بازی کی گو مسیحیت نے بیخ کنی کی، لیکن خانقاہوں کی چار دیواری کے اندر اس کی سرپرستی قایم رہی۔ خود ناصحین کی یہ حالت تھی کہ وہی سب سے زیادہ آلودہ معاصی رہتے تھے بارہویں صدی میں پاپا صاحب کے ایک سفیر انگلستان میں وعظ کے لئے تشریف لائے۔ کلیسا کے اخلاقی انحطاط پر اُنھوں نے شدّومد سے وعظ کہا لیکن ابھی اس کو چند گھنٹہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ لوگوں نے دیکھا وہ اپنے خلوتکدہ میں ایک طوایف کے ساتھ لطف ہم آغوشی حاصل کر رہے ہیں! یہ سب کیا تھا؟ وہی ازدواج کو ممنوع قرار دینے کا وبال۔ ساری خرابیوں کی جڑ یہی تھی، کہ شادی و نکاح کے پاک و فطری طریقہ کے انسداد کی کوشش کی جاتی تھی۔ پانی کے بہاؤ کے قدرتی راستہ کو روکئے گا تو وہ حوض کے اندر لامحالہ گندگی و تعفن پیدا کردے گا۔

اساطین دین کی یہ بداخلاقی لازمی طور پر متعدی ثابت ہوئی۔ اب یہ بداخلاقی گویا ساری فضا میں سرایت کر گئی اور عوام و خواص سب اسی رنگ میں رنگ گئے۔ پروٹسٹنٹ ممالک میں جہاں ازدواج کا عام دستور ہے، اس رسم سے نہایت مفید اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ عادات و اطوار کی نفاست و نزاکت بچوں کی تعلیم و تربیت، مریضوں کی تیمارداری، صفائی و پاکبازی، حلم و آشتی، رفق و مروت شفقت و ہمدردی یہ تمام چیزیں پر مسرت خانگی زندگی کے جلو میں آتی ہیں، مصایب زندگی میں بجائے تلخی کے خوش مزگی پیدا کردیتی ہیں اور علمی، اخلاقی، مذہبی، معاشی

غرض ہر شعبۂ حیات میں ایک نسبت و ملاطفت کی آمیزش کردیتی ہیں۔ بہ خلاف اس کے کیتھولک اصول پر تجرد کی زندگی بسر کرنے سے انسانی دماغ ایک بالکل ہی مختلف سانچے میں ڈھل جاتا ہے اس سے عزم راسخ کو موت سے بے خوفی، دنیا سے بے تعلقی، ثبات و استقلال اور ایثار و مردانگی کو قوت پہنچ جاتی ہے، تاہم دوسری طرف مزاج میں خاص طرح کی سختی و خشکی، خشونت و آشفتگی بھی آجاتی ہے اور تعصب، تنگ نظری و عدم رواداری بھی لازمی طور پر شامل ہوجاتی ہے جس سے اُن میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذرا بھی اہلیت نہیں باقی رہ جاتی، حالانکہ انہیں اسی کا بڑا دعوی ہے۔

چنانچہ عملاً بھی اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہوا کہ گو قرون وسطی میں بہت سے زاہدان مرتاض و عابدان تارک الدنیا پیدا ہوتے رہے، تاہم اکابر کلیسا کی بداخلاقیاں ساری دنیائے مسیحیت میں سرایت کرگئیں اور مسیحیت کی اصلاحی قوت کو کیتھولک ازم نے مدتوں معطل رکھا۔ رہبانیت کی شدت کا ردعمل یوں ظاہر ہوا کہ لوگ اخلاق شکنی پر ٹوٹ پڑے اور ازدواج کا سا پاک معصوم و پر محبت رشتہ، معصیت سمجھا جانے لگا۔ پروٹسٹنٹ ازم کا درحقیقت یہ بہت بڑا احسان دنیا پر ہے کہ اُس نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرکے مسیحیت کی اصلاحی قوت کو ازسرنو قایم کیا۔

ایک اور مضر اثر جو زیادہ تر رہبانیت کا معلول تھا، یہ پیدا ہوا کہ عورت کی سیرت و مرتبہ کی انتہائی پستی کا تخیل قایم ہوگیا۔ یہ تخیل بالکل نیا نہ تھا کیونکہ اس کے ابتدائی آثار کتب یہود میں موجود تھے۔ دُلہن کے باپ کو قیمت دینے کا دستور اور تعدد ازدواج کی رسم علی العموم جاری تھی۔ عورت تمام قبایح کی مبدء سمجھی جاتی تھی۔ وضع حمل کے بعد ایک خاص زمانہ تک وہ ناپاک خیال کی جاتی تھی جو لڑکی پیدا ہونے کی حالت میں یہ مدت بہ مقابلہ لڑکے ہونے کے دُگنی ہوتی تھی۔ اگلی یہودی تاریخ میں فضیلت نسوانی کی جسقدر نظیریں ملتی ہیں وہ سب بہت کم درجہ کی ہیں اور رومہ و یونان کے مقابلہ میں تو یقیناً نہایت پست ہیں۔ بلکہ خود توریت میں جس عورت کی

سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہے وہ وہ ہے جس کے پاس ایک شخص آکر پناہ لیتا ہے اور وہ اُسے بہ کمال مکاری قتل کر ڈالتی ہے۔ غرض یہودیوں کے ہاں یہ مواد تو موجود ہی تھا اس پر مسیحی رہبانیت نے اور جلا کر دی۔ اس وقت کے پادریوں کی تصانیف کی ورق گردانی سے عورت کے باب میں عجیب عجیب تعلیمات آشکار ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ عورت کا وجود جہنم کا دروازہ اور تمام قبایح انسانی کی جڑ ہے۔ عورت کو ہمیشہ ذلیل اور شرمندہ رکھنے کے لئے اس کا یہی خیال کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔ اس کا درجہ ایک دائمی محکومیت کا ہے اُسے اپنے لباس وحسن سے خصوصیت کے ساتھ محجوب رہنا چاہئے کیونکہ صید معاصی کے لئے حسن ہی اس کے پاس سب سے قوی حربہ ہے۔ حسن صورت اس زمانہ میں عام طور پر گرجا کے نزدیک مذموم سمجھا جانے لگا۔ بجز پادریوں کے حسن کے کہ اُس کا ذکر اُن کے مقبروں کے کتبہ پر فخر کے ساتھ ہوتا تھا۔

ان تعلیمات کا اثر قانون پر بھی پڑا۔ بت پرستوں نے اپنے آخر زمانہ میں قدیم مخالف نسواں قوانین کی بہت کچھ ترمیم کی تھی اور اصلاح کا یہ سلسلہ قسطنطین سے لے کر جسٹینین تک جاری رہا تھا، لیکن اس دَور کے قانون نے عورت کی قانونی ترقی کو پھر کئی صدیوں پیچھے ہٹا دیا۔ طلاق و دیگر حیثیات سے سختیوں کے علاوہ خود وراثت میں عورت طرح طرح کے مظالم کی ہدف رکھی گئی، چنانچہ اکثر حالتوں میں عورت اس پر مجبور ہو جاتی تھی کہ یا شادی کرے یا عمر بھر کے لئے نن بن جائے یہ قوانین اور ان بندشوں کا سلسلہ اٹھارہویں صدی تک قایم رہا، تا آنکہ اٹھارہویں صدی کے خاتمہ پر انقلابیین فرانس نے گو عورت کو سیاسی آزادی نہیں بخشی، تاہم اولاد ذکور و اُناث میں مساوات توریث قرار دیکر آیندہ کی بڑی بڑی اصلاحات کے لئے داغ بیل ڈال دی۔

مسیحیوں کو عصمت وعفت کا معیار بلند کرنے میں بہت بڑی مدد بربریوں کے حملوں اور فتوحات سے ملی۔ غلاموں و خانہ زادوں کی تعداد میں کمی، مناظر تفریح و ملاعب کا تعطل، اور ملک کا عام افلاس یہ سب چیزیں اس باب میں معین ہوئیں۔ اور بربری گو کتنے ہی جاہل و غیر متمدن ہوں، تاہم

اس خاص حیثیت سے ان کے اخلاق کی سطح بہت کافی بلند تھی۔ٹیکیٹس اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھتا ہے کہ زناکاری ان میں الشاذ کالمعدوم کی مصداق تھی، زانیہ کا سر مونڈ کر اسے مارتے ہوئے گاؤں بھر میں پھرایا جاتا تھا اور پھر اس کے ساتھ مدت العمر کوئی شخص شادی نہیں کرسکتا تھا خواہ وہ کتنی ہی نوعمر حسین و صاحب ثروت ہو۔ تعداد ازدواج صرف سلاطین کے لئے مخصوص تھا اور اُن کا بھی اس سے مدعا شہوت رانی نہیں بلکہ اظہار نام و نمود ہوتا تھا۔ مائیں خود اپنے بچوں کی رضاعت کرتی تھیں۔طفل کشی ممنوع تھی۔عقد بیوگان ناجائز تھا۔مرد عورت کا ادب و احترام کرتے تھے اور اسیری کے وقت خود اپنی ذات سے زیادہ اپنی بیویوں کے گرفتار ہو جانے کو ڈرتے تھے۔

ٹیکیٹس کی غرض چونکہ اپنے ہموطنوں کو اس مثال سے وعظ و تلقین کرنی تھی۔اس لئے غالباً ان بیانات میں کچھ مبالغہ ہو۔تاہم ان کی اصلیت سے ہرگز انکار نہیں ہوسکتا۔سیلویس نے تین صدیوں بعد لکھا ہے اور وہ بھی اسی طرح بربریوں کے مناقب عصمت و عفت کی مدح میں رطب اللساں ہے۔اسکینڈینیویا کے اساطیر میں متعدد حوالے اس قسم کے پائے جاتے ہیں کہ عورت کو راہ ہدایت سے ہٹانے والوں کو آخرت میں سخت سے سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔بربریوں کے ہاں عورتیں تعبیر خواب کا کام انجام دیتی تھیں، دوا علاج کرتی تھیں خود جنگ میں شریک ہوتی تھیں اور اثنا ر شکست کے وقت سپاہیوں کو از سر نو ہمت و جوش دلاتی تھیں۔بربریوں کی شدت وفا شعاری کو دیکھکر آگسٹس نے یہ اصول بنالیا تھا کہ وہ ضمانت کے وقت بربری سرداران قبائل کے بجائے اُن کی بیویوں کو حراست میں لیتا تھا کیونکہ اُنکے لئے اُن سے دست برداری کسی حالت میں ممکن نہ تھی۔ماریس نے جب ایک بار ان پر فتح پائی تو اُن کی بیویوں نے محض حفظ ناموس کے خیال سے یہ استدعا کی کہ انہیں "مذہبی اچھوتیوں" میں شامل ہونے کی اجازت دیدی جاوے اور جب یہ التجا نامنظور ہوئی تو سب نے اکبارگی خودکشی کرلی۔ازدواجی وفاپرستی کے دو اور قصے ہم یہاں مختصراً درج کرتے ہیں۔جن

سے عام حالت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ ایک نامی گرامی امیر نے ایک بار ایک شادی شدہ بربری عورت کا ماسے اظہار عشق کیا اور جب دیکھا کہ وہ اور کسی طرح رام نہیں ہوتی تو اس کے شوہر کو قتل کر ڈالا۔ بیوہ نے ڈیانا کے مندر میں جاکر پناہ لی۔ لیکن یہاں بھی امیر کے فرستادوں نے پیچھا نہ چھوڑا یہاں تک کہ ایک روز امیر موصوف بہ نفس نفیس تشریف لے آئے۔ اب بیوہ نے بھی اظہار رضامندی کیا، خود پجارنی کا لباس پہن کر دیبی کی مورت کے سامنے آئی۔ ہاتھ میں جام شراب تھا۔ نصف خود پی لیا، اور نصف عاشق صاحب کو پلا دیا، اور جب وہ بھی ختم کر چکا تو جوش مسرت سے چلا کر کہا کہ "شکر ہے اپنے شوہر کے قاتل سے میں نے انتقام لے لیا، شراب میں زہر ہلاہل ملا تھا!" دوسرا واقعہ ایک اور بربری ایپونیا کا ہے۔ اس کے شوہر نے شہنشاہ وسپیسین کے خلاف بغاوت کی، مگر شکست کھائی۔ مفرور ہو کر جان بچانا بالکل ممکن تھا، لیکن پیاری بیوی کو چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ خود ایک گاؤں میں جاکر تہ خانہ کے اندر روپوش ہو گیا، اپنی موت کی خبر مشتہر کرادی اور اپنی لاش کی معدومیت کے سوال کو یوں حل کیا کہ اس گھر میں آگ لگا دی، تاکہ سب سمجھیں لاش بھی جل کر خاکستر ہو گئی۔ بیوی نے سنا تو تین روز تک بے آب ودانہ زمین پر پڑی رہی۔ مگر بالآخر معلوم ہوا کہ یہ غلط خبر قصداً مشہور کر دی گئی ہے۔ ظاہری سوگ اس نے اب بھی برقرار رکھا، لیکن شب کو جاکر شوہر سے چھپ کر مل آیا کرتی تھی۔ کچھ روز میں حاملہ ہوئی اور مدتوں حمل کو دوائوں سے چھپائے رکھا۔ بالآخر وضع حمل کا وقت آپہنچا۔ اور وہ تن تنہا جاکر تہ خانے کے اندر دو توام بچہ جن آئی۔ ایک دو روز نہیں پورے ۹ برس تک بچہ وہیں پلتے رہے تاآنکہ یہ راز طشت از بام ہو گیا، باغی پھر گرفتار ہو کر قتل ہوا اور ایپونیا کی یہ آخری التجا رد کر دی گئی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جان دے سکے۔

بربریت و رہبانیت کی پاکبازی کے درمیان ایک اصولی فرق تھا۔ رہبانیت تجرّد کے حق میں معین تھی، لیکن بربری پاکبازی کا رخ الفت و خلوص ازدواجی کی جانب تھا۔ اور

تعدد ازدواج کا دستور تو بربری سلاطین میں برابر جاری رہا۔ کیریبرٹ وکلفرک کے متعدد بیویاں تھیں کلوٹیر نے اپنی بیوی کی حیات میں اپنی سالی کو بھی عقد میں لے لیا۔ تھیوڈبرٹ بایں پاکبازی دو دو بیویاں رکھتا تھا۔ ڈاگوبرٹ کی تین بیویاں اور متعدد کنیزیں تھیں اور کنیزیں تو خود شارلمین کے پاس بھی بکثرت تھیں باوجود دو بیویوں کے پاپائے روم اور پادری اس وقت اخلاق خانگی کے محافظ و مصلح تھے اور سلاطین و امرا کی کثرت طلاق کی دیکھ بھال رکھا کرتے تھے۔

لیکن اس ایک بات کو چھوڑ کے عموماً بربریوں کی پاکبازی بالکل مسلّم وغیر مشتبہ ہے جیسا کہ خود اُن کے قوانین سے ظاہر ہوتا ہے۔ عورت کی عصمت کو متہم کرنے والے پر بہ نسبت مرد پر بزدلی کے اتہام لگانے والے کے پندرہ گنی رقم جرمانہ کی سزا ہوتی تھی۔ زنا و زنا بالجبر دونوں پر بہت سخت تعزیرات تھیں۔ پندرہ اشرفیوں کا جرمانہ اُس شخص پر ہوتا جو نامناسب طور پر کسی عورت کے ہاتھ کو چھو لیتا۔ اور جرّاحوں کو ممانعت تھی کہ بغیر شوہروں یا اور قریبی اعزہ کی موجودگی کے عورتوں کو فصد دے سکیں۔

مسیحیت کے اثر نے عصمت و پاکبازی کی ان تعلیمات کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ اب زناکاری کے واقعات شمار میں بھی کم ہو گئے اور جتنے کچھ ہوتے بھی تھے، بالاعلان نہیں ہوتے تھے۔ شرم و حجاب کا ایک جدید جذبہ پیدا ہو گیا، زبان و ادب میں فحش کا عنصر گھٹ گیا اور قانون ازدواج کی خلاف ورزیاں کیفیت و کمیت دونوں میں کم ہو گئیں۔ سینٹ گریگوری نے بعض فلاسفۂ متقدمین کی طرح اس کی تاکید کی کہ مائیں خود اپنے بچوں کی رضاعت کریں۔ لباس و وضع رفتار و گفتار ہر شے سے متعلق قوانین نافذ کر دیے گئے، یونان و ایشیائے کوچک کی لائی ہوئی شہوت پرستی کا سدباب ہو گیا، اور طوائفوں کا طبقہ ذلت و تحقیر کا مرادف قرار پا گیا۔ سب سے بڑی اصلاح اس سلسلہ میں یہ ہوئی کہ عورت و مرد دونوں اس حیثیت سے برابر درجہ کے مجرم قرار دیدیے گئے۔ دنیا کا ایک عام دستور یہ ہے کہ اس باب میں تقریباً سارا

الزام عورت پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اور مرد سے گویا مطلق باز پرس نہیں ہوتی۔ عورت کو ایک مرتبہ بھی کہیں لغزش ہو جائے تو پھر زندگی بھر کے لئے وہ داغی ہو گئی۔ لیکن مرد کھلے خزانہ عورتیں کرتا ہے اور پھر معصوم کا معصوم بنا رہتا ہے، حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ محرک و فاعل مرد ہوتا ہی عورت بیچاری تو صرف ایک حیثیت منفعلہ رکھتی ہے اور پھر ضعیف و کمزور جو ہوتی ہی سو الگ اس عدم مساوات کی توجیہ متعدد اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے مثلاً یہ کہ عورت کے خاطی ہونے کا ثبوت قطعیت سے مل سکتا ہے اور مرد کا نہیں، یا یہ کہ عورت کی ناجائز اولاد کی پرورش کا بار اگر بے قصور شوہر کے سر ڈال دیا جائے تو بڑی ناانصافی ہے، وغیرہ۔ بہرحال اسباب کچھ بھی ہوں۔ یہ عام خیال ہمیشہ سے رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔ سنیکا و پلوٹارک کے صفحات میں اس کے خلاف اشارات ملتے ہیں، لیکن مسیحی پادریوں نے اس تعلیم کو بہت زور و قوت کے ساتھ بیان کیا کہ زنا میں قصوروار اگر ہیں تو مرد و عورت دونوں اور برابر درجہ کے لیکن یہ تعلیم اس حیثیت سے عمل پر زیادہ موثر نہ ہو سکی۔ عمل پر موثر ہوئی ضرور، یعنی ناجائز تعلقات کی ذمہ داری پر مسیحیوں کے یہاں مرد و عورت دونوں یکساں طور پر عائد ہوتی ہے، تاہم اسکی بنا یہ نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ایک مرد و ایک عورت کا دائمی ازدواج ایک عمل تقدیس ہے جیسا کہ خود مسیح کا ازدواج کلیسا کے ساتھ ہوا اور جو شخص اس مقدس رشتہ میں کسی حیثیت سے بھی رخنہ اندازی کرنا چاہتا ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، مجرد ہو یا متاہل، وہ گناہ کبیرہ کا یکساں مرتکب ہوتا ہے۔

اسی مسئلہ کو مذہبی حیثیت سے قطع نظر کر کے اگر محض دنیوی اعتبار سے دیکھیں تو بھی اس کی تائید میں یہ دو اصول ملتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ فریقین و نیز جماعت کے لئے مفید کون سی صورت ازدواج ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ ہمارے حسن اخلاق کو بلند کرنے والی کیا شے ہے اور پست کرنیوالی کون؟

ان ہر دو اصول کے معیار پر نظر کرنے سے اسی کی تائید نکلتی ہے کہ تعلقات جنسی کی

بہترین صورت یہی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت دائمی معاہدہ کرکے ایک دوسرے کے پابند رہیں۔ لیکن اگرچہ یہ صورت عقلاً بہترین ثابت ہوتی ہے تاہم اس کا یہ نتیجہ تو کسی طرح نہیں نکلتا کہ صرف یہی ایک صورت قابل عمل ہے اور باقی تمام صورتیں مردود ہیں۔ بلکہ برعکس اس کے تجربہ بتاتا ہے کہ دوسری صورتیں بھی مخصوص حالات کے درمیان مناسب بلکہ ضروری ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جن جماعات میں، یا جس زمانہ میں موقت تعلق زناشوئی یا متعہ معیوب نہیں خیال کیا جاتا اور جبکہ اس رسم پر عمل کرنے والوں میں اس سے احساس معصیت یا اور کوئی اخلاق شکن اثر نہیں پیدا ہوتا۔ یا پھر ایسی صورت میں کہ مرد اپنے جوش شباب میں اگر اپنے ہمسروں میں ازدواج کرتا ہے تو اپنے درجہ کی مالی حالت کو نہیں سنبھال سکتا، اس لئے لامحالہ اُسے اپنے سے کم درجہ عورت کے ساتھ موقت تعلق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ تو ایسی صورتوں میں یہ موقت تعلقات سوسائٹی کے لئے مضر ہونا کیسا اور مفید ہوتے ہیں۔

بت پرست مقننین ان استثنائی صورتوں کے وجود اور اُن کی اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے، چنانچہ اپنے قوانین میں اُنہوں نے ہر جگہ ان کا لحاظ رکھا ہے اور موقت تعلقات کو اونہوں نے صاف طور سے جائز قرار دے کے اُن کی ایک منضبط و باقاعدہ شکل بنادی اور طلاق کی آزادیوں نے بہت سی ناجائز صورتوں کو جواز کا جامہ پہنا دیا۔ کنیزوں کے رکھنے کا دستور بدچلنی کی زیادہ واضح و صریح صورتوں کو روکنے کے لئے جاری ہوا، اور رفتہ رفتہ عام ہو گیا۔ یہ قانوناً بالکل جائز تھا اور نکاح کے حکم میں داخل تھا۔ جو شخص ایک کنیز کے ہوتے ہوئے دوسری کنیز رکھ لیتا تھا، یا کسی سے نکاح کر لیتا تھا، وہ قانون کی نظروں میں زناکاری کا مرتکب ہوتا تھا۔ نکاح کی طرح اس کے لئے بھی کسی خاص رسم کی ضرورت تھی اور نکاح کی طرح اس میں بھی افتراق ہر وقت ممکن تھا۔ البتہ اس کے ممیزات یہ تھے کہ کنیز اپنے ساتھ جہیز نہیں لاتی تھی۔ خود ادنیٰ درجہ کی ہو کر اعلیٰ طبقہ کے شخص کو شوہر بنا سکتی تھی (درآں حالیکہ نکاح کی صورت میں میاں بیوی کو مساوی طبقہ کا ہونا چاہیئے تھا) مگر اس کی اولاد

ہمیشہ ماں ہی کے طبقہ میں رہتی تھی، باپ کی جائداد ونسب سے اُسے کوئی بہرہ نہ تھا۔

اس تخیل کے خلاف مسیحیت نے پوری قوت سے علَم جہاد بلند کیا جس کی صدائے بازگشت گو قانون کے پردوں سے عرصہ تک بہت دھیمی آیا کی، تاہم مذہبی وکلیسائی تحریروں میں ان کی گونج ہمیشہ بڑی زور کی سنائی دیتی رہی ہے۔ مسیحیت نے آکر یہ تعلیم دی کہ تمام دنیوی اغراض ومنافع اور مادی نتائج ومصالح سے بالکل قطع نظر کرکے خود ارشاد ربّانی کے بموجب مرد وعورت میں مباشرت کا جائز طریقہ' وحید صرف ناقابل انفصال عقد مناکحت ہی اور اس کے سوا ہمبستری کی ہر صورت حرام ہے۔ مسیحیت کے اس قطعی ومدّعیانہ تلقین کا اثر ہر شعبۂ حیات پر پڑا جسکے شواہد آج بھی ہر طرف نظر آرہے ہیں۔

اسی تحریک کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ رفتہ رفتہ عقد نکاح ایک مذہبی رسم قرار پاگیا۔ یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہے کہ زناشوئی کے اہم ودائمی معاہدہ کو مذہبی استناد کی مُہر سے بیحد تقوت پہنچ سکتی تھی۔ لیکن سب سے پہلے جس نے اس اثر سے کام لیا وہ مسیحیت تھی۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس دستور نے بہت ہی تدریجًا رواج پایا، چنانچہ جیسا میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں۔ غلاموں کے عقد میں مدت تک اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی اور آزادوں کے عقد میں بھی اس کا لزوم دسویں صدی سے پیشتر طے نہ پاسکا۔ تبریک وتقدیس سے قطع نظر کرکے کلیسا کو ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا زبردست آلہ آگیا جس سے اساطین کلیسا ہر موقع پر فائدہ اوٹھاکر مسیحی گلّہ کی خانگی زندگی کو اپنے قابو میں لا سکتے تھے، اور اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ حال میں "قانونی شادیوں" یعنی بلا پادریوں کے توسط کے مناکحت کا جو جواز ہو گیا ہے اس سے کلیسا کے اقتدار کو ایک بہت ہی گہرا دھکّا لگا ہے۔

اسی کے ساتھ طلاق کو بھی کلیسا نے مطلقًا ناجائز قرار دینا شروع کردیا۔ ابتداءً قانون اس کی مخالفت کرتا رہا، چنانچہ قسطنطین نے شوہر کے تین گناہوں اور بیوی کے تین گناہوں پر طلاق کی اجازت دے رکھی تھی۔ بلکہ لوگوں کے عام رجحان کو دیکھکر جسٹنین کے زمانہ میں

یہ قیدیں بھی اُٹھ گئی تھیں اور اب قانون نے طلاق کے بارہ میں پوری آزادی دے رکھی تھی لیکن دوسری طرف آبائے کلیسا اس کی پوری مخالفت کرتے رہے اور عورت سے زناکاری کا جرم سرزد ہونے کی مشتبہ الجواز صورت کو چھوڑ کر باقی ہر حالت میں طلاق کو قطعاً ناجائز قرار دیتے رہے۔ قانون و شریعت کی یہ کشمکش صدیوں تک قایم رہی۔ تا آنکہ قانون کو دبنا پڑا۔ پہلے شارلمین نے گو وہ اس رسم پر خود عامل تھا اور اسے قابل تعزیر نہ قرار دے سکا، تاہم طلاق کو ایک جرم قرار دے دیا۔ لیکن کلیسا کے جوش و خروش کی اس سے تشفی نہ ہوئی اور بالآخر بارہویں صدی میں قانون نے شریعت کے مقابلہ میں اپنی شکست کامل مان کر خود بھی طلاق کے ممنوع ہونے کا اعلان کر دیا۔

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ اس ممانعت سے دنیا کے اخلاق پر کہاں تک مفید یا مضر اثر پڑا ہے اس موقع پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ گو اس ممانعت کی تائید میں آج مادّی منافع و دلائل سے بھی کام لیا جاتا ہے تاہم ابتداءً اس کی بنا ان چیزوں پر نہیں، بلکہ ازدواج کی تقدیس پر تھی یعنی اس عقیدہ پر کہ ازدواج یادگار ہے خود مسیح اور کلیسا کے درمیان اتحاد و مواصلت کی۔ اور اس بنا پر زناکاری۔ خطائے اخلاقی سے زیادہ معصیت مذہبی تھی۔ جمہوریت کے دور آخر میں رومیوں کا خیال تھا کہ ازدواج ایک ملکی و وطنی فرض ہے کہ اس سے حکومت کو فوج کے لئے افراد بہم پہنچتے ہیں، چنانچہ آگسٹس کے قوانین میں مجرد رہنے والوں کے لئے سزائیں بھی مقرر تھیں۔ لیکن اب مسیحیت کے اثر سے یہ محرک بالکل فنا ہو گیا تھا۔ اب نہ لوگوں میں محافظت وطن کا کوئی جوش رہا تھا اور نہ ازدواج کوئی فرض سمجھا جا سکتا تھا، بلکہ اب تو رہبانیت کے اثر سے تجرد زیادہ مقدس و محترم سمجھا جانے لگا تھا۔

ازدواج کے سلسلہ میں ایک شے اور تھی، جس کا حصول بھی آبائے کلیسا اپنے مقاصد کے لئے ضروری خیال کرتے تھے اور وہ یہ تھی کہ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان رشتۂ ازدواج نہ قایم ہو سکے۔ چنانچہ اس قانون کو بھی اب انھوں نے سختی سے نافذ کر دیا۔ یہ بے شبہ صحیح ہے

کہ مختلف العقائد اشخاص کے درمیان شادیاں فریقین کے غلو و تعصب کو ہلکا کر دیتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ رفق و ملاطفت سے پیش آنے کا سامان بہم کر دیتی ہیں لیکن یہ ایسی صورت میں ممکن ہے جب فریقین ایک خاص حد تک روشن خیالی و رواداری کا درجہ حاصل کر چکے ہوں تاریک خیالی و تعصب کی انتہائی پستی میں جبکہ ہر فریق دل سے یہ پختہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کا شریک زندگی نیز اس کے مذہب پر جتنی اولاد ہوگی وہ سب قطعاً ضلالت و گمراہی میں مبتلا، نجات سے محروم اور ایک عذاب الیم و عقوبت دایمی کی مستحق ہی موانست و ملاطفت کا کہاں گزر ہو سکتا ہے؟ ایسی حالت میں تو میاں بیوی دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور خانگی زندگی ہر وقت رنجشوں اور کدورتوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔

خانگی زندگی کی بے لطفیاں و رنجشیں تمام تر مسیحیت کی پیداوار ہیں۔ اس سے قبل دنیا کے لئے یہ نامعلوم تھیں۔ کیونکہ گو زوج و زوجہ میں اختلاف عقاید پہلے بھی ہوتا تھا تاہم بیشتر ان پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا اور اُن کی اتنی اہمیت نہیں خیال کی جاتی تھی۔ روم کے قبول مسیحیت کے وقت جو کچھ حالت ہوگی اُس کا نمونہ ہمیں موجودہ زمانہ میں بھی اپنے گرد و پیش نظر آتا ہے۔ ایک بڑا غضب یہ ہے کہ اور کسی معاملہ میں اگر دو شخصوں میں اختلاف عقاید ہو تو ناتعلیم یافتہ شخص اپنے سے عالم تر شخص کی پیروی کرنے لگے گا یا کم از کم اس کی رائے کو وقعت و احترام کی نظر سے تو ضرور دیکھے گا۔ لیکن خاص مذہبی معاملات کے اختلاف کے وقت اس کے بالکل برعکس صورت حال ہوتی ہے۔ یہاں اپنی رائے کو قطعاً صادق سمجھنا اور دوسرے کے عقیدہ کو گمراہ اور حصول نجات سے محروم کرنے والا اور منجانب شیطان سمجھنا ارکان ایمان میں سے ہے۔ اور چونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر و زوجہ یا باپ اور بیٹے کی علمی سطح برابر نہیں ہوتی۔ اس لئے اختلاف عقائد کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اور پھر اس سے رنجشوں اور بے لطفیوں کا جو سلسلہ پیدا ہوتا ہے اُنہوں نے خانگی زندگی کو تمام تر تلخیوں سے لبریز کر دیا ہے تعصب غلو۔ حق پوشی۔ تاریک خیالی، ضد۔ عدم رواداری۔ ان چیزوں کو پرجوش

علماے دین۔ جزو مذہب بنا دینا اپنا فرض خیال کیا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ اختلاف عقائد کے باوجود حیات خانگی ایک لحظہ کے لئے بھی پر لطف رہ سکے؟

ان خرابیوں کو پیش نظر رکھہ کر پادریوں نے امن و لطف کی زندگی کی بقا کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان مناکحت کا سرے سے سدّباب کر دیں۔ ایک یہ خیال تھا۔ دوسرے میرے نزدیک اس خیال کو اس عقیدہ سے اور اعانت حاصل ہو گئی کہ رسم نکاح مسیح اور کلیسا کے اتحاد و مواصلت کی یادگار ہے۔ اُس وقت کے حاملین مذہب اس عقیدہ کے استعارۃً نہیں بلکہ اُس کے لفظی معنی میں قایل تھے کہ اُن کے نزدیک یہ ایک سِر تھا اسرار ربّانی میں سے اور تمام مسیحی اعضا و جوارح تھے مسیح کے، جن کے لئے کسی غیر مذہب والے کے ساتھہ ازدواج کرنا ایک مذہبی معصیت تھی، جیسا کہ سینٹ سایپرین و ٹرٹولین وغیرہ ائمہ کلیسا نے یہ تصریح کہا ہے۔

مرد و عورت کے باہمی تعلقات کے باب میں مسیحیت نے جو نتایج پیدا ہوئے اُن کے خلاصہ کو ہم دفعات ذیل کی صورت میں رکھہ سکتے ہیں۔

(۱) دوشیزگی و تجرد کی انتہائی تقدیس۔

(۲) نکاح کے سوا مرد و عورت کی ہمبستری کی اور تمام صورتوں کا عدم جواز۔

(۳) مسیحیوں کے لئے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھہ ازدواج کی قید۔

(۴) طلاق و افتراق کا عدم جواز۔

(۵) اور نکاح کی مذہبی حیثیت۔

ان سب کے علاوہ ایک خاص اثر مسیحیت کا یہ بھی ہوا کہ عورت جن خصوصیات میں مرد پر فضیلت رکھتی ہے۔ اُن کے لحاظ سے اُس نے اُن کے درجہ کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ اِس کی تفصیل کے لئے آیندہ فصل ملاحظہ ہو۔

فصل (۴)

فضایل نسوانی

مرد و عورت کے درمیان کیا باہمی تناسب ہے؟ اس سوال کا ہر قوم، ہر مذہب، ہر ملک اور ہر زمانہ نے ایک نیا جواب دیا ہے اور اس جواب کا اخلاق کے عملی پہلو پر ہمیشہ گہرا اثر رہا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل تین مختلف شعبوں پر تقسیم ہے جسمانی حیثیت سے دیکھیے تو اس کا فیصلہ بالکل بدیہی ہے۔ یعنی مرد قوت و طاقت میں ممتاز ہے اور عورت حسن و نزاکت میں عقلی و دماغی حیثیت سے دیکھیے تو بھی علی العموم مرد ہی کی افضلیت نکلے گی۔ علم و فن، فلسفہ و حکمت، زبان و ادب، غرض کسی شعبہ میں نظر کیجیے۔ مردوں ہی نام نظر آئیں گے اور خواتین کی جماعت میں کسی شیکسپیر، کسی نیوٹن، کسی ریفایل اور کسی ہنڈل کا نام نہ ملے گا۔ دقت پسندی، وسعت نظر۔ قوت تحقیق و تنقید ان سب چیزوں میں مرد کی فضیلت مسلم ہے۔ البتہ نازک خیالی و لطیف الاحساسی میں عورت کا نمبر بڑھا ہی ہوا ہے۔ اسی لئے ناول نویسی۔ ایکٹری و لطیف مکالمت و مراسلت میں عورت کا مرتبہ فی الجملہ پست نہیں۔

لیکن اب اگر اخلاقی نقطۂ خیال سے غور کیجیے تو بہ حیثیت مجموعی عورت ہی کا امتیاز تفوق ثابت ہوگا۔ سب سے پہلے ہم پولس کے فراہم کردہ اعداد کو لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہ لحاظ جرایم مرد و عورت میں درمیان پانچ اور ایک کے نسبت ہے! اس کی تاویل میں اگر یہ کہئے کہ مرد پر کنبہ کی پرورش کا بار ہوتا ہے اور اس کے سامنے قانون شکنی کی زیادہ ترغیبات موجود رہتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ افلاس و ناداری جو جرایم کی سب سے بڑی محرک ہے اس کا شکار عموماً عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ لیکن خیر: پولیس کے اعداد سے قطع نظر کرکے بجائے خود غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایثار میں عورت کا نمبر مرد سے قطعی بڑھا ہوا ہے

فضیلت اخلاق کے سرچشمہ دو ہیں، ایک اضطراری، یعنی بلا قصد طبعاً اختیار خیر و ترک شر، دوسرے ارادی، یعنی شاہراہ فرض پر فرض سمجھکر چلنا ہے، سو میرے نزدیک یہ صورتیں عورتوں ہی پر زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ مرد کی بہ نسبت یہ اپنے خیال و عمل دونوں میں زیادہ عفیف ہوتی ہیں۔ ان میں گو حسد، رشک، کینہ و حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، تاہم ہمدردی، غمگساری، صبر و شکر، رضا و تسلیم، قناعت و نفس کشی میں اُن کی داد نہ دینا بھی ظلم ہے اور گو مرد میں عزم و بلند نظری، ثبات و استقلال، جواں مردی و خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے، تاہم انکسار و تواضع، خلق و تپاک، شرم و حجاب کی حصہ دار یہی ہوتی ہیں۔ مرد کا طبعی رجحان عدل و انصاف کی جانب ہوتا ہے اور اُن کا رحم و خدا ترسی کی جانب۔ ان کی نظریں گو محدود ہوتی ہیں۔ تاہم تخیل بہت قوی ہوتی ہے۔ اور درد و مصیبت کے وقت دوسرے کے کام آنے میں یہ مردوں سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں ان کا ذہن کلیات و تعمیات سے نہیں بلکہ جزئیات و تشخصات سے متاثر ہوتا ہے اور غمگساری و ہمدردی کے مواقع پر مرد ان کا بالکل مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مسیحیت کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اخلاقی تخیل میں تبدیلی پیدا کر کے فضائل نسوانی کو ایک خاص شرف و امتیاز عطا کر دیا۔ یونانیوں کا تخیل جس طرح فنون لطیفہ میں مردانہ تھا اُسی طرح اخلاق میں بھی مردانہ تھا اس معنی میں کہ وہ لوگ جن چیزوں کو اُمّ الفضائل کے درجہ پر رکھتے تھے وہ تمامتر مردانہ خصوصیات تھے، مثلاً جرأت و ہمّت، اعتماد نفس، و حب وطن اور ان کے مقابلہ میں جو فضائل، خصائص نسوانی میں سے ہیں اُن کی جانب کوئی خاص اعتنا نہ تھا مثلاً عصمت و عفت، شرم و حیا، ہمدردی و فیاضی۔ چنانچہ اُن کے یہاں جو مشاہیر خواتین ہوئی ہیں اُن کے کارنامہ بھی تمامتر وہی ہوتے تھے، جو ایک مرد کے لئے طغرائے امتیاز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک ماں کے سامنے اُس کی اولاد نے وطن کی خاطر جان دیدی اور اس کے آنسو تک نہ نکلے۔ وقس علی ہذا۔ لیکن جو جذبات لطیف صنف نازک کے لئے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں اُن کی طرف سے وہ لوگ غافل سے تھے۔ رومی تمدن و اخلاق پر سب سے زیادہ اثر

رواقیت کا بڑا تھا اور رواقیت کے سب سے زیادہ سربرآوردہ رُکن کا خود یہ اعتراف تھا کہ ہمارا تخیل بالکل مردانہ ہے۔ اور تو اور ایک اسی بات کو دیکھنا چاہیئے، کہ سنگ تراشی میں بت پرستوں کو خاص کمال حاصل ہوا اور نقاشی میں مسیحیوں کو۔ یہ آخر کیوں ہوا؟ اس بنا پر کہ سنگ تراشی مردانہ حسن، یعنی قوت و طاقت کی مظہر تھی، اور نقاشی زنانہ حسن یعنی لطافت و نزاکت کی ترجمان ہوئی ہے۔ چنانچہ خود مسیحی مصوروں و نقاشوں کے بہتر سے بہتر افراد جو عظمت و قوت کی نقاشی کے عادی تھے مسیحی تخیل کی صحیح تصویر کھینچنے میں ناکام رہے یہ انقلاب حالت تمام تر مسیحیت کا نتیجہ تھا جس نے قدیم یونانی تخیل کو فنا کر کے اس کی جگہ حلم و انکسار، خلق و تپاک سینت و مدارات، رفق و ملاطفت، تسلیم و رضا، اُلفت و محبت کے جذبات مخصوص بہ نسواں کو رفعت بخشی۔

عورتوں میں ایک تو یوں ہی جذبہ مذہبیت بہ مقابلہ مردوں کے قوی ہوتا ہے اور دوسرے مسیحیت نے جو اپنے بانی کے ساتھ عشق و شیفتگی کو بنیاد دین قرار دی اور جس کی بنا پر عورتوں کو اپنے مخصوص فضائل کے اظہار کا غیر متوقع موقعہ مل گیا اس سے مسیحیت کی تبلیغ میں عورتوں کو غیر معمولی حصہ و اقتدار حاصل ہو گیا۔ ایسا کہ کسی اور اہم ذہنی تحریک میں اتنا حصہ عورتوں کا نہیں رہا ہی۔ تعدیوں کے زمانہ میں شہیدان راہِ حق کی صفِ اوّل میں اکثر ممتاز ترین اسماء خواتین ہی کے نظر آتے ہیں اور مسیحی و مشرک مصنفین متفق اللفظ ہیں کہ خواتین غیر معمولی مستعدی کے ساتھ کلیسا میں داخل ہوتی تھیں اور مردوں کو اس میں داخل کرانے میں خاص حصہ رکھتی تھیں سینٹ آگسٹائن سینٹ کریزوسٹم، سینٹ بیسل، سینٹ گری گوری، وتھیوڈورٹ، ان سب کی ماؤں کو ان کے مسیحی بنانے میں کافی دخل تھا۔ سینٹ ہیلینا یعنی والدۂ قسطنطین، فلیسلا یعنی ملکۂ تھیوڈوسیس اعظم، سنت پلچیریا، یعنی ہمشیرۂ تھیوڈوسیس خرد، اور پلیسیڈیا، یعنی والدۂ ولنٹینین سوم ان سب کا شمار خاص حامیان دین میں ہے۔ ان کے علاوہ جو فرقہ اہل اعتزال کے تھے ان میں بھی مستورات کا خاص زور رہا چنانچہ آرئیس، پریسلین، اور مونٹینس کے گرد صنفِ نسواں

کے ایک لشکر کا ہجوم رہتا تھا۔ تحریک رہبانیت میں بھی عورتیں مردوں کے دوش بدوش تھیں
اور خیراتی کاموں کے نظم و نسق میں تو ان کا نمایاں حصہ تھا۔ درحقیقت اس سے زیادہ وہ
کسی اور کام کے لیے خلقتاً موزوں ہی نہیں ہوئی تھیں اور گو ہر ملت اور ہر زمانہ میں ان کی
انفرادی مثالیں اس قسم کے کام کی ملتی ہیں، لیکن ان کی اس سرشت و جبلت سے پورا فائدہ
مسیحیت سے پہلے کسی نے نہیں اُٹھایا۔ فیبولا، پالا، میلینیا وغیرہ بہ کثرت خواتین ایسی تھیں،
جنھوں نے اپنی زندگی رفاہ عام کے کاموں کے لیے وقف کردی اور وہ کام بھی اس
نوعیت کے کہ پہلے کبھی کسی کے خیال میں نہیں آئے تھے۔ ملکہ فلیسلا اپنے ہاتھوں سے
شفا خانوں میں بیماروں کی تیمارداری کرتی تھی، اور یہ خدمت تو ہر مسیحی بیوی کے گویا فرائض
میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نظیر سے ہر زمانہ میں فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اور مسیحیت و کلیسا کی
تاریخ میں گو اس پر دیگر حیثیات سے تاریک سے تاریک دَور گزرے ہیں، لیکن ایسا کوئی
زمانہ نہیں آیا جو ایسی مسیحی خواتین کی تعداد کثیر سے خالی ہو۔ جنھوں نے اپنی زندگی نوع
انسان کی رفع تکالیف کے لیے وقف کردی ہو اور یہ خدمت خلق کی خصلت جس قدر دنیا
کو نفع و راحت پہنچانے میں معین ہوئی ہے اُسی قدر ان ہستیوں کی سطح اخلاق بلند کرنے میں بھی
ہوئی ہے جو اس پر عامل رہی ہیں۔

بعض معتزلی فرقوں میں عورتوں کے سپرد اعلیٰ مذہبی مناصب بھی ہوتے تھے، عام
راسخ العقیدہ گروہوں میں گو یہ شے جائز نہ تھی، تاہم بعض ادنیٰ مذہبی مراسم کے ادا کرنے
کی عورتوں کو ان کے ہاں بھی اجازت تھی اس سلسلہ کی ابتدا خود حواریوں کے زمانہ سے قائم
ہو گئی تھی۔ سن رسیدہ کنواریوں کا ایک خاص حلقہ قائم کر دیا گیا تھا جن کے ایک خاص حلف
اُٹھانے کے بعد یہ فرائض قرار پاجاتے تھے کہ عورتوں کو بپتسمہ لینے میں مدد دیں، بیماروں
کی تیمارداری کریں، نظر بندوں اور قیدیوں کی خدمت کریں، مذہبی مجالس میں انتظام و اہتمام
کریں اور جو عورت پادری صاحب کا شرف زیارت حاصل کرنا چاہے اس کی رہبری کریں

تاریخی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس حلقہ میں بھی ابتری پھیلتی گئی تا آنکہ بالآخر یہ مخصوص کنواریاں محض عام کنواریوں (نن) کے درجہ پر رہ گئیں۔ تاہم اس حلقہ کا وجود مشرق میں بارھویں صدی تک رہا۔ اس کے علاوہ پہلی مرتبہ کی بیواؤں کی خاص عزت ہوتی تھی اور وہ کلیسیا کی فیاضیوں کی خاص حقدار سمجھی جاتی تھیں علیٰ ہذا اُن سن رسیدہ مستورات کے ساتھ جن کا کوئی مرد والی و وارث نہ ہوتا (عام اس سے کہ انھوں نے کبھی شادی نہ کی ہو یا یہ کہ ان کے مرد اعزہ کی وفات ہوگئی ہو) غیر معمولی مراعات ملحوظ رکھے جاتے۔ مرد کا سن جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے، اسی نسبت سے وہ زیادہ تجربہ کار وجہاں دیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے "بڑھیا عورت" ہر جگہ عموماً ایک مضحکہ خیز ہستی سمجھی جاتی ہے اس سے تمسخر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ حسن وجمال جو شباب میں اس کا قوی ترین حربہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس وقت اُس کا بالکل ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور بہ مقابلہ ایک پیرزن کے ایک پیرمرد اس کا بھی زیادہ حصہ دار نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں کلیسیا کا یہ ایک خاص احسان ہے کہ اس نے مسن عورتوں کے گرد تقدس واحترام کا حلقہ کھینچ کے اُن کی قدرتی کمزوریوں کا ایک بڑی حد تک کفارہ کر دیا اور ایسے اسباب مہیا کر دیے کہ ان کی آخر عمر کی تلخیاں اور ناگواریاں کچھ تو کم ہو جائیں۔

کلیسیا کی ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ مسیحی واضعان قوانین نے بھی جائداد کے معاملہ میں عورت کے قانونی حقوق کو وسعت دینا شروع کیا اور جسٹینین نے مشرکوں کے اس اصول کو توڑ کر کہ سرپرستی و مربی گری کا حق مردوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ بیواؤں کو ان کی اولاد کا مربی و سرپرست بنا دیا۔ عورتوں نے جس طرح اپنے تئیں خدمت کلیسیا کے لئے وقف کر دیا تھا نیز جس قدر امداد متمول بیوائیں کلیسیا کو دیتی تھیں، بے شبہ ان چیزوں نے ایک حد تک کلیسیا کو بھی ان کا ہمدرد بنا دیا تھا، لیکن ان خواتین وتعلیمات سے اہم نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عورتوں کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے باب میں غیر معمولی حصہ حاصل ہو گیا اگرچہ لازمی طور پر ہر موقع

پر مفید ہی نہیں ثابت ہوا۔

لیکن قانونی حقوق سے قطع نظر کرکے محض وہ اخلاقی تخیل جو عورت کے متعلق اب قایم ہوا تھا اس کے عظمت و شرافت میں اضافہ کردینے کے لئے کافی تھا۔ پیر مقدس کنواری کا جو تقدس دلوں میں تھا صنف نسواں میں کثرت سے پیر و ولی پیدا ہوئے تھے۔ یہ چیزیں بھی اس اثر کے گہرا کرنے میں مُعین ہوئیں۔ اسی سلسلہ میں یہ ایک عجیب بات ہی کہ قوم یہود جس نے قدیم اقوام ثلثہ میں تاریخ و شاعری کے عالم میں سب سے قلیل تعداد جنس نسواں میں سے پیدا کی، اُسی نے دنیا کے سامنے عورت کے مرتبہ کے متعلق اتنا بلند تخیل پیش کیا، اور اس حقیقت سے عورت کی دلکش ترین و محبوب ترین خصوصیات کا راز بھی کھل جاتا ہی کہ ایک ایسی خاتون جس کی متعلق ہم بجز اُس کی نیکی اور اس کی مغمومیت کے اور مطلق کچھ نہیں جانتے۔ بایں ہمہ دنیا کو اس کی جانب جو کشش و گرویدگی ہے اُس کا مقابلہ مشرکوں کے ہاں کی بہتر سے بہتر وطن پرست خواتین نہیں کرسکتیں۔ مقدس کنواری کے پرستش کے مذہبی حصہ کے جواز و عدم جواز، استحسان و عدم استحسان سے ہمیں بحث نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ عورت کا مرتبہ بلند کرنے اور مردوں کے اطوار و اعمال میں گداز و لطافت پیدا کرنے میں جس حد تک یہ تخیل معین ہوا اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی مشرکوں کی دیویوں کی پرستش سے یہ بات حاصل ہونا ممکن ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ ہستیاں حُسن اخلاق، اور خصوصاً زنانہ حسن اخلاق کے جوہر سے مُعرّیٰ تھیں۔ اس تخیل نے درحقیقت مذہب عیش پرستی اور عسکریت کے اُن تمام مختلف عناصر کو یکجا کردیا جن کے اثر میں صدہا ہزارہا سال گذر جانے کے بعد اب تک بھی کوئی کمی نہیں پیدا ہوسکی۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہی کہ سولھویں صدی میں جو مذہبی انقلابات ہوئے ان میں کیتھولک ازم کا ساتھ زنانہ اخلاق نے دیا اور پرٹسٹنٹ ازم کا ساتھ مردانہ اخلاق نے جس کی وجہ یہی ہے کہ اوّل الذکر نے مقدس کنواری کی پرستش کو قایم رکھا اور اس کے متعلقات کو برابر ترقی دی جذبات کو موسیقی، نقاشی، نقش و نگار کی آرستگی سے برانگیختہ کرنا عقل کے بجائے اپنا مخاطب

تخیل کو بنانا، بجائے قوائے مُدرکہ کے قوائے حسّاسہ کو تحریک دینا، معتقدات کے باب میں تحکم سے کام لینا اور سب سے بڑھ کر اپنے متعین کو ہمیشہ تقلید کی تعلیم دینا۔ یہ تمام چیزیں اس کی موئیدات ثابت ہوئیں۔ مرد کی سرشت میں اپنے پیروں آپ کھڑا ہونا، اور عورت کی سرشت میں دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنا ہے۔ اس بنا پر جو مذہب دلوں میں دوسروں کا آسرا، اور دوسروں کے دامن میں پناہ لینے پر نجات کا اذعان بٹھا دیتا ہے وہ عورت کی طبیعت پر خاص طور سے موثر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو مذہب شخصی ذمہ داری پر زور دیتا ہے اور مذہب کو جذبات کے زیور سے مُعرّیٰ کر دیتا ہے، وہ مردوں ہی کا مذہب ہوسکتا ہے۔ پیورٹن ازم (تو ہّب اسیحیت کی سب سے زیادہ مردانہ شکل ہے اس کے مشاہیر ارکان کیتھولک ازم کے مشاہیر ارکان سے نہ صرف اپنی تعلیمات کے لحاظ سے بلکہ اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے بھی ہمیشہ مختلف رہے ہیں۔ کیتھولک ازم طبیعت میں نرمی پیدا کرتی ہے اور پروٹسٹنٹ ازم مضبوطی گو اکثر نرمی کے ڈانڈے کمزوری و بزدلی سے اور مضبوطی کے ڈانڈے سختی و تشدد سے مل جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو قومیں دل سے کیتھولک ہیں اُن میں تقدس واحترام، خوش مزاجی، خلق و مُروّت، آداب تہذیب، وملنساری کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو قومیں دل سے پروٹسٹنٹ ہیں، ان میں راست بازی، فرض شناسی اور بلند سیرتی کے اوصاف ممتاز ہوتے ہیں۔ اطاعت وانکسار، اوّل الذکر قوموں کے اور حریت وخودداری آخر الذکر قوموں کے اوصاف خصوصی ہیں۔ اوّل الذکر ضعیف الاعتقاد و وہم پرست ہوتی ہیں، اور آخر الذکر متعصب و غالی۔ اس میں شبہ نہیں کہ پروٹسٹنٹ ازم نے ازدواج کا احترام قایم کرکے صنف نسواں پر ایک بڑا احسان کیا۔ لیکن یہ مسلک اپنے تعلیمات واعمال کے لئے ہرگز اس صنف کے لئے اُتنا موزوں نہیں، جتنا اس کا حریف

ان مسائل میں پڑ کر میں تاریخ کے حدود سے تجاوز کر گیا۔ لیکن اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد کائنات اخلاقی کے محض واقعات وحوادث کو قلمبند کرنا نہ تھا، بلکہ یہی دکھانا

کہ ہئیت اجتماعیہ کے ہر تغیر پر اُن کا کیا اثر رہا ہے۔ اب میں اس کتاب اور اس باب کے خاتمہ پر اس
حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اخلاق کے تمام شعبوں میں آیندہ ہر دو اصناف کے باہمی تعلقات
اور عورت کے مرتبہ کا مسئلہ سب سے زیادہ دشوار و نازک ہے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ تمدن کی وسعت
کے ساتھ ساتھ لوگوں میں فیاضی، راست بازی، دیانت داری، واعتدال و پاکبازی کے جوہر
ترقی کرتے جاتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف خاص روشن خیالی اور معاشری
نفاستوں کے عروج کے زمانہ میں مرد وعورت کے باہمی تعلقات، قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں
موجودہ زمانہ میں ان تعلقات کی نوعیت بہت کچھ مذہبی طرز تعلیم کی معلول ہے۔ لیکن اس کا
اثر روز بروز ملکی معاشرت پر ہلکا پڑتا جاتا ہے۔ ہر حال میں بعض اقتصادی وصنعتی حقایق کے
انکشاف نے بھی اس حیثیت سے رفتار زمانہ کا رُخ پھیر دیا ہے۔ یہ پُرانا کلیہ کہ کثرت آبادی ہمیشہ
مفید ہوتی ہے۔ جو واضعین قوانین وعلما اخلاق دونوں کے نزدیک مسلم تھا اور جس پر قانون
واخلاق دونوں کے ایک بہت بڑے حصّہ کی بنیاد تھی اب باطل ثابت ہو گیا ہے اور اب
اس کی جگہ اس کے قضیہ برعکس نے لے لی ہے کہ آبادی کا محدود رہنا ملک کے حق میں مفید ہے
اور ازدواج کو ایک حد معیّن سے آگے نہ بڑھنا چاہیئے۔ کچھ تو اس کلیہ کے اثر سے اور
کچھ تمدن زائیدہ عیش پرستیوں کی بنا پر، صنف نسواں کی ایک بڑی اور روز افزوں تعداد
بغیر کسی مرد کی ولایت کے خود ہی کشمکش حیات میں پڑتی ہے۔ لیکن قوانین وآئین حکومت
نیز معاشری رسم ورواج جواب تک اُسی قدیم بنا پر قایم ہیں کہ ہر بالغ عورت کو بیوی
ہونا چاہیئے۔ بجائے اس کے کہ عورت کی راہ میں سہولت پیدا کریں اسے مردوں کے مساوی
تعلیمی ومالی حقوق سے محروم رکھکر اس کے لئے اور زیادہ دشواریاں پیدا کر رہے ہیں اور بیبیوں
جائز ذرایع آمدنی ومشاغل اس پر بند کر کے، اُسے بدچلنی یا انتہائی افلاس اختیار کرنے پر
مجبور کر رہے ہیں۔ لیکن باہنہم عورت کی خانگی زندگی میں بھی ایک انقلاب شروع ہو گیا ہے
جس کے اثرات اس وقت واضح طور پر کسی کی نظر میں بھی نہیں۔ جو مشاغل اس کے لوازم زندگی

سمجھے جاتے ہیں وہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر اب بڑے بڑے کارخانوں میں پہنچ گئے کپڑے سینا، چرخہ کاتنا۔ اس سارے زنانہ کاروبار کو اب بجائے عورت کی انگلیوں کے مشینوں اور کلوں کے پُرزہ انجام دے رہے ہیں۔

اس صورت حال کے نتائج پر غور کرنا ایک حکیم اخلاق کے لئے دلچسپ ہوگا۔ لیکن مؤرخ کے دائرۂ عمل سے یہ باہر ہے۔ پیشین گوئی صرف اس حد تک کی جا سکتی ہے کہ عورت کے آیندہ مشاغل و طریقۂ تعلیم موجودہ حالت سے بالکل بدلے ہوئے ہوں گے۔ ان تغیرات کا لازمی اثر سیرت و طبیعت پر پڑے گا۔ اور عورت و مرد کا موجودہ طرز تعلق بیسیوں حیثیات سے قابل ترمیم سمجھا جائے گا۔ متعدد انوکھے نظریات بھی پیش ہوں گے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان تمام اصلاحات و تغیرات اخلاقی کی بھی ایک خاص حد ہو گی جس سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوگا جو لوگ نیکی و بدی کی تفریق ملحوظ رکھتے ہیں۔ قوانین اعمال بشری کو سمجھتے ہیں اور اپنی اولاد کے نفع نقصان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ حقیقت اچھی طرح ہے کہ دوسرے شعبوں کی طرح اس باب میں بھی فطرت کی طرف سے اخلاقی امتیازات قایم ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔

بابِ ختم شد

فلسفۂ اجتماع (تالیف مولوی عبدالماجد صاحب بی اے) یہ کتاب بھی فلسفۂ جذبات کے قابل مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی ہے۔ اور نفسیات کے ایک عجیب مسئلہ سے بحث کرتی ہے۔ اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنی جماعت کے اعمال و قوائے دماغی کی تحلیل و تشریح ہے۔ یہ کتاب فلسفۂ جذبات سے بھی زیادہ دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ آج کل جبکہ ملک میں ہر طرف سے قومی زندگی میں انقلاب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر مفید و سبق آموز ہے۔ اس پر ہندوستان و انگلستان کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ قیمت (عہ) مجلد (عہر) (صفحات ۲۲۶)

مشاہیر یونان و رومہ (جلد اول) مترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب انجمن نے ترجمے کے لیے جن کتابوں کو منتخب کیا ہے یہ کتاب ان میں سب سے ضخیم اور بلند پایہ ہے۔ اگرچہ کتاب پہلی صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے لیکن دنیا میں آج تک کوئی کتاب اس رتبہ کی نہیں لکھی گئی ہے اور تمام عالم کے انشا پردازوں اور عالموں نے اس کے سامنے سر جھکایا ہے۔ کتاب کا موضوع قدیم رومی و یونانی مشاہیر کے حالاتِ زندگی ہے۔ لیکن ان کے لکھنے میں مصنف نے سیرت نگاری کا وہ کمال دکھایا ہے جس کی نظیر دنیا کے علم ادب میں نہیں ملتی۔ اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس میں ایثار، حُبِّ وطن، جوانمردی اور اُولوالعزمی کے ایسے کارنامے نظر آئیں گے جو دلوں کو ہلا دیں گے۔ ہماری قوم کے نوجوانوں کے مطالعہ کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہو سکتی اور اسکا مطالعہ خاص کر اس زمانہ میں ان کے لیے لازم ہے۔ اس کا ترجمہ مولوی ہاشمی صاحب نے بڑی محنت اور خوبی سے کیا ہے۔ کتاب مع مقدمۂ مترجم ۰۰ ۵ صفحات پر ہے۔ قیمت (عہر) مجلد (سے)

مشاہیر یونان و رومہ (جلد دوم) یہ اُسی مشہور آفاق اور بے نظیر کتاب کی دوسری جلد ہے جس کا ترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب نے نہایت قابلیت سے کیا ہی۔ حجم ۴۰۲ صفحہ قیمت (عہ) مجلد (عـ)

علم المعیشت (مؤلفہ مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم اے) اس علم (پولیٹکل اکانمی) پر اُردو زبان میں یہ نہایت مستند اور جامع کتاب ہی۔ مصنف نے مشکل سے مشکل مسائل کو بڑی سلاست اور خوبی سے بیان کیا ہی۔ یہ علم دنیا میں روز بروز ترقی کر رہا ہی اور حقیقت یہ ہی کہ انسانی تمدن کا اصل راز ان اصول کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمدن و ترقی کے پیچیدہ حالات و اسباب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک اس علم کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے اُردو میں یہ کتاب لکھ کر ملک پر بڑا احسان کیا ہی۔ یہ کتاب ۸۲۵ صفحات پر تمام ہوئی ہی اور بہت اچھی چھپی ہی۔ قیمت صرف (للعہ) اور مجلد للہ)

البیرونی (مؤلفہ مولوی سید حسن صاحب بی اے) ابوریحان بیرونی اُن بلند پایہ عالی مرتبہ حکما میں سے گذرا ہی جن پر ایک دنیا کو ناز ہی۔ اس فاضل روزگار نے مختلف مباحث و علوم پر سو سے اوپر کتابیں لکھی ہیں۔ اور اکثر سائنس و ریاضیات کے نہایت دقیق اور اعلیٰ مسائل پر۔ ہندوستان میں آکر اس نے سنسکرت میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی۔ اور ہندوستان کے فلسفہ و تاریخ و مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی جو اب تک وقعت و عزت کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ غرض یہ کتاب اس فاضل متبحر کے حالات اور اُس کی نادر و نایاب تصانیف اور کمالات پر ہی۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت فی جلد (۸ر)

ملنے کا پتہ: صدر دفتر انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)